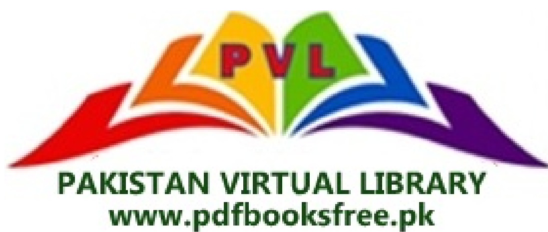
راستے محبت کے

شگفتہ بھٹی



پیش لفظ

1987ء کا سال شگفتہ بھٹی اور میرے لیے اس لحاظ سے مماثلت رکھتا ہے کہ اس برس انھوں نے اپنی ادبی اور میں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ہم لوگ سیڑھی کی طرح وہیں محدود ہو گئے۔ جب کہ شگفتہ بھٹی افسانہ نگارہ سے ملک کی معروف ناول نگارہ بن چکی ہیں۔ ان کے افسانے ہوں یا ناول وہ ایک لکھاری سے زیادہ مسیحا کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ ان کا مقصد تحریر ''معاشرتی بیماریوں'' کو اجاگر اور اس کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں معاشرے کی نبض اور دوسرے میں قلم ہوتا ہے نبض کی رفتار کے ساتھ ان کا قلم بھی رواں دواں رہتا ہے۔ یوں احساسات و خیالات لفظوں کی لڑیوں میں پرونے لگتے ہیں اور ایک نیا ناول منظرِ عام پر آ جاتا ہے۔

زیرِ نظر ناول ''راستے محبت کے'' جیلانی ولاز کی کہانی پر مبنی ہے جس میں کردار متحرک نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر کردار کے ساتھ ایک کہانی یا واقعہ وابستہ ہے۔ اندازِ بیاں ایسا مؤثر اور دلچسپ ہے کہ قاری انہیں پڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ ناول کا ہر ورق ایک تصویر کی طرح نظر آتا ہے۔ ہر لفظ کے پیچھے ایک عکس چھپا ہوتا ہے جو پڑھنے والے میں تجسس پیدا کرتا ہے۔ اگر شگفتہ بھٹی ناول کی کہانی موضوع اور کردار کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہیں تو قاری بھی ان کی گہرائی اور گیرائی میں ڈوب کر وہ مقصد حاصل کر لیتا ہے جس کے لیے ناول نگارہ کومل انداز اپناتے ہوئے موضوع کو کشادہ کرتی چلی جاتی ہیں۔

عمومی طور پر بعض ناقدین ادب ڈائجسٹوں میں چھپنے والے افسانوں اور قسط وار ناولوں کو ادب کا حصہ قرار نہیں دیتے۔ یہاں ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب کا مسئلہ بھی درپیش ہونے لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کو زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو کہانیوں کی صورت میں سامنے لاتا ہے تو ان میں ہمیں جیتی جاگتی زندگی کے بھاگتے دوڑتے

کردار نظر آتے ہیں۔ شگفتہ بھٹی بھی ان کرداروں کے حصار میں رہ کر گھر کے اندر کی کہانیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

''راستے محبت کے'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کہانی کے تمام واقعات شگفتہ بھٹی کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ کے دوران سارے واقعات ایک فلم کی طرح قاری کے سامنے رہنے لگتے ہیں اور قاری ان واقعات کی وسعتوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک جگہ لکھتی ہیں۔

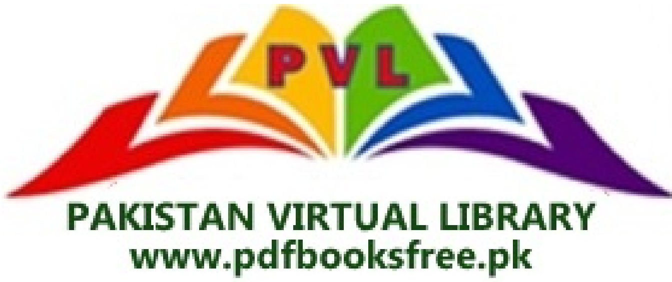
''بھائی پلیز وہ ہماری اپنی ہے اور یہ ہمارے گھر، ہمارے خاندان کا معاملہ ہے اسے ہم نے سلجھانا ہے آپ دل بڑا کریں اور پھر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بڑا کرم کیا اور ہماری عزت اور ناموس محفوظ ہے۔''

ان جملوں سے شگفتہ ایسا ماحول کشید کرتی ہیں کہ کرداروں کے ساتھ قاری خود بھی مسائل کی گتھیاں سلجھانے لگتا ہے۔

آخر میں وہ عورت کی عظمت، عزت، تکریم کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ ''عورت بیوی کے روپ میں...... اس کے نزدیک اس کی رحمت تھی۔ اس کا بھیجا ہوا خوبصورت تحفہ تھی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور معاف کر کے دل سے لگا لینے کے درجے پر تھی۔''

شگفتہ بھٹی کی تحریر میں انفرادیت اور خوبصورتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سادہ اور کم جملوں میں بڑی بات کر جاتی ہیں۔ توقع ہے کہ پہلے کی طرح ان کا یہ ناول ''راستے محبت کے'' بھی قارئین کے دلوں میں محبتوں کے راستے بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

سلیم ناز
میگزین ایڈیٹر: نوائے وقت، ملتان
بیورو چیف: فیملی میگزین، لاہور



''جیلانی ولاز'' میں آج بہت رونق تھی۔ ہر ایک مصروف تھا۔ مسرور تھا اور خوشی میں اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ جیلانی ولاز کے سب نئے پرانے ملازمین بھی خوش تھے۔ بے حد خوش۔ نور محمد جیلانی جو اس گھر کے سربراہ تھے سب سے زیادہ خوش وہ تھے۔ طاہرہ جیلانی بھی ان کی خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ وہ تو بار بار اپنی دراز میں سے زیور کا وہ بڑا سا ڈبہ نکالتیں اور ایک ایک چیز کو نئے سرے سے ایک نئی خوشی کے ساتھ دیکھتیں اور کہتیں۔ ''جیلانی صاحب! ہماری ستارہ کے نصیب کتنے اچھے ہیں۔ وہ کہیں اور نہیں جا رہی بلکہ یہیں ہمارے پاس ہی رہے گی۔''

''اچھا کیا احمد نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ واپس آسٹریلیا نہیں جائے گا؟''

جیلانی صاحب اپنی ایک بار کی اور تسلی کے لیے کہتے۔ ورنہ یہ بات تو انہیں بھی احمد بارہا کہہ چکا تھا کہ ''دادا جان! اب میں اپنا سب کاروبار سمیٹ کر آ رہا ہوں۔'' وہ انہیں فون پر سو سو طرح سے تسلیاں دے چکا تھا۔

''اللہ نے چاہا تو ہماری ستارہ کی ساری محرومیاں دور ہو جائیں گی۔'' طاہرہ جیلانی دل کی گہرائیوں سے اپنی نواسی کے لیے دعائیں کرتیں۔

''بی بی جان! بی بی جان!'' ان کا بیٹا شمیس آوازیں دیتا آ رہا تھا۔ ''او بی بی جان آپ یہاں بیٹھی ہیں۔'' وہ ان کے کمرے میں جھانکا تو انہیں وہاں دیکھ کر اندر آ گیا۔

''خیر تو ہے۔ تم کیوں یوں منہ لٹکائے پھر رہے ہو۔'' بی بی جان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ آئیں ذرا باہر......'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑا۔

''کہاں...... کیا ہوا؟'' وہ پاؤں میں چپل اٹکاتیں حیران سی ساتھ چل پڑیں۔

"آئیں اور خود دیکھیں۔" وہ انہیں ہاتھ پکڑے باہر لان میں لے آیا جہاں اسیس جیلانی پہلے سے موجود تھے اور ٹینٹ والوں پر گرم ہو رہے تھے۔

"آئیں بی بی......" اسیس احترام سے آگے بڑھے اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں آگے لے آئے۔

"یہ کس نے کہا تھا۔" وہ بھی قدرے خفگی سے بولیں۔

"یہ آپ کے لاڈلے کے کام ہیں۔" اسیس میاں نے بتایا۔

"زید نے......؟" وہ ہولے سے بڑبڑائیں۔

"جی ہاں زید محمد نے کہا تھا کہ ٹینٹ ایسے ہوں۔" عمیس جیلانی بھی غصے سے بولے۔

"یہ...... یہ کوئی رنگ ہے۔ نیلا پیلا اور گلابی اور یہ...... یہ کنوپیاں پتہ بھی ہے خرچہ کتنا ہوگا۔ ان پر......" اسیس میاں سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور سامنے دھرے سامان کو گھورنے لگے۔

"میں پوچھتی ہوں زید سے...... بلاؤ ذرا اسے......" بی بی جان نے حکم دیا۔

"وہ رہا چھت پر...... لائٹس لگوا رہا ہے۔" عمیس میاں نے انگلی کا اشارہ سامنے والی چھت پر کر کے انہیں ادھر متوجہ کیا جہاں زید صاحب کبھی نیچے جھک کر اور کبھی بندر کی طرح اوپر دیوار پر چڑھ کر آرائشی لائٹوں کی الجھی ہوئی تاروں کو سلجھا رہا تھا۔

"اسے آواز تو دینا ذرا۔" بی بی جان نے اپنے ساتھ کھڑے عمیس میاں سے کہا جس پر فوراً ہی وہ اسے پکارنے لگے۔

"زید......! زید!" آواز سن کر وہ ادھر دیکھتا ہوا مسکرایا۔

"جی بابا جان......!" وہ وہیں سے چلایا۔

"نیچے آؤ فوراً۔ بی بی جان بلا رہی ہیں۔" انہوں نے ذرا سختی سے کہا۔

"بی بی جان! ابھی آیا...... ایک منٹ میں......" وہ وہیں سے لٹک گیا۔

"میرے اللہ!" بی بی جان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ "دھیان سے...... یہ...... یہ...... کیا طریقہ ہے۔ ادھر سیڑھیوں سے آؤ۔" وہ زید سے بولیں۔ اتنے میں اس نے چھت سے شیڈ پر اور شیڈ سے لٹک کر نیچے لان میں چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔

"جی بی بی جان......" وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کو سنبھالتا ہوا بولا۔

"پہلے تو بتاؤ یہ کیا حرکت تھی؟" وہ اصل بات بھول کر اس کے کان کھینچنے لگیں۔

"بی بی جان! حرکت میں ہی برکت ہوتی ہے۔" وہ اپنا کان سہلاتا حاضر جوابی سے

بولا۔

"بدتمیز...... بدلحاظ...... بڑوں سے بولنے کی تمیز نہیں ہے۔" اسیس جیلانی اسے غصے سے ڈانٹنے لگے۔

"سوری بابا۔" وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔ طاہرہ بیگم نے اس کے کان چھوڑے اور نرم پڑتی بولیں۔

"زید! یہ سب کیا ہے؟" ان کا اشارہ سامنے پڑے سامان کی طرف تھا۔

"یہ...... بی بی......!" وہ اگلے ہی پل پھر نارمل تھا۔

"یہ سب مہمانوں کے لیے ہے۔ کنوپیاں، کرسیاں، میزیں اور وہ کیٹرنگ کا سامان......" اس نے ایک ایک چیز کی وضاحت کر دی۔

"یہ سب مجھے بھی پتہ ہے لیکن تم نے یہ سب کس کے کہنے پر منگوایا؟" وہ اس کے انداز پر اپنی مسکراہٹ کو دباتیں اپنے اوپر سنجیدگی اور ناراضی کو طاری کرتی ہوئی بولیں۔

"بی بی جان...... یہ سب تو آنا ہی تھا۔ رات پروگرام نہیں بنا تھا کہ یہیں درمیان والے لان میں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوگا؟" وہ الٹا ان سے پوچھنے لگا۔

"ہاں یہ بات طے ہو گئی تھی کہ یہیں پر سب انتظام ہوگا مگر......" بی بی جان کی بات ابھی آدھی منہ میں ہی تھی جب عمیس میاں بولے۔

"مگر صاحبزادے! تم کو کس نے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ تم یہ سب کرو گے۔ وہ بھی اتنی جلدی۔"

"مجھے...... مجھے تو کسی نے نہیں کہا مگر میں نے سوچا کہ آخر کو مجھے بھی تو کچھ کام کرنے ہوں گے۔ ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ اس لیے میں نے......"

وہ اپنی وکالت خود کرتا ہوا اعتماد سے کندھے اچکا رہا تھا۔ "تم بدتمیز ہی نہیں خودسر بھی ہو......" عمیس میاں نے غصے کے ساتھ منہ دوسری جانب کر لیا۔

"کیا ہوا بھئی......؟ کس بات پر یہ سب ماں بیٹے جمع ہیں؟" نور محمد وہاں آ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"اوہ...... دادا جان آ گئے۔" وہ لپک کر اپنے دادا کے کندھے سے چپک گیا اور اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا بولتا وہ اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا۔

"دادا جان! آپ کہہ رہے تھے ناں کہ ٹینٹ والوں کو کہنا ہے اور کیٹرنگ والوں سے بھی بات کرنی ہے۔ میں نے بات بھی کر لی اور سامان بھی منگوالیا۔ یہ دیکھیں۔" وہ مسکراتا ہوا

انہیں سامنے پڑے سامان کی طرف لے گیا۔

"اچھا تو یہ سب تم نے کیا ہے...... واہ...... اتنی جلدی...... کمال کر دیا تم نے......" جیلانی صاحب نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پھر شیر ہو گیا۔

"اور...... اور میں نے آج کے فیشن کے مطابق ساری چیزیں منگوائی ہیں اور مزے کی بات ہے کہ بڑے سستے میں معاملات طے کیے ہیں۔"

"وہ بڑے سستے" کو ہولے سے ان کے کان میں یوں کہہ رہا تھا جیسے راز کی بات ہو۔

"اچھا...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" جیلانی صاحب اس کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"دیکھا...... دیکھا میں نے کیا کہا تھا بھائی جان!" عمیس میاں نے اپنے بڑے بھائی اسیس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھا ناں اس نے پھر سے ابا جان کو پھسلا لیا۔ اب سب کا غصہ بیکار ہے...... ابا جان کسی کی بھی بات نہیں سنیں گے۔"

وہ ناگواری سے زید کو گھور رہے تھے۔ "یار! یہ لڑکا خدا جانے ابا جان پر کیا جادو کرتا ہے۔" اسیس میاں کا غصہ بھی بے بسی میں بدل چکا تھا۔

"بی بی جان! سچ کہتا ہوں۔ یہ سب فضولیات ہیں۔ واہیات چیزیں ہیں جو یہ اٹھا لایا ہے۔ دیکھنا کتنا خرچہ ہو جائے گا خواہ مخواہ میں۔" عمیس میاں اپنی ماں کے کانوں میں بڑبڑانے لگے۔

"ہاں یہ تو ہے۔ اس قدر فضول خرچی کی بھلا کیا ضرورت تھی۔" بی بی جان کو بھی اندازہ تو تھا کہ یہ سب بیکار کی باتیں ہیں اور یہ آج کل کے رنگین ٹینٹ جو فیشن ایبل کنوپیوں میں بدل گئے ہیں ان کا خرچہ اچھا بھلا ہوتا ہے اور بیکار ہوتا ہے۔ نہ کریں تب بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔

"اور کیا بی بی جان یہی پیسہ ستارہ کی کسی اور ضرورت کو پورا کر دیتا۔ میرا مطلب ہے اس کے لیے ہم ایک آدھ اور چیز خرید لیتے۔" لوہا گرم دیکھ کر عمیس میاں نے ماں کے باقاعدہ کان بھرنے شروع کر دیے۔

"آپ ابا جان کو سمجھائیں اور واپس اٹھوائیں یہ سب...... ہم خود منگوا لیں گے جو ضرورت ہو گی۔ یہ کل کا لڑکا ذمہ داریاں سنبھالے گا ہونہہ......" انہوں نے زید کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ جانے کیوں عمیس میاں چچا ہونے کے باوجود زید محمد سے اتنی خار کھاتے تھے اور اسے برملا برا بھلا کہتے رہتے تھے۔

بی بی جان نے مسکرا کر اپنے بیٹے کو دیکھا جو غصے سے نتھنے پھلا رہا تھا۔

"اتنا غصہ نہ کیا کرو عمیس! غصہ انسان کی صحت اور اس کی عقل کو یوں کھا جاتا ہے جیسے سوکھی لکڑی کو آگ......" انہوں نے پیار سے اپنے بیٹے کے سر پر چپت لگائی اور "اچھا میں جیلانی صاحب سے بات کرتی ہوں۔" کہہ کر ان کی طرف چل دیں جو اپنے پوتے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے میں مصروف تھے اور وہ انہیں کیٹرنگ کے سامان کی ایک ایک چیز بڑے شوق سے دکھا رہا تھا۔ پھر اگلے چند لمحوں میں بیگم جیلانی بھی اپنے شوہر ہی کی طرح سے زید محمد کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں جس پر اسیس میاں ہی نہیں عمیس میاں بھی غصے سے پاؤں پٹختے واپس چلے گئے۔



جیلانی صاحب ایک کاروباری ذہن کے انسان ہونے کے باوجود بہت دریا دل اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اپنی ایک عزت دار ساکھ نہ صرف کاروباری حلقے میں بنائی تھی بلکہ سماجی بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے ان کا ایک سوشل حلقہ بھی تھا جو اچھا خاصا وسیع تھا مگر وہ یہ سب نیکی کے کام دنیا دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ اپنی آخرت سنوارنے کے لیے کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں پہلے اسیس جیلانی تھے پھر عمیس جیلانی۔ دونوں بھائی اپنے والد کے ساتھ ہی منسلک تھے۔ بیٹیوں میں شاہانہ، دردانہ اور شبانہ تھیں۔ دردانہ جیلانی تو پہلی بچی کی پیدائش پر ہی اللہ تعالیٰ سے جا ملی تھی۔ اس کے شوہر شاہد زیادہ عرصہ بیوی کے ہجر میں رو کر گزارنے کی بجائے چند ماہ بعد ہی دوسری شادی کر کے واپس شارجہ چلے گئے تھے۔ ننھی سی ستارہ کو وہ جاتے جاتے یہ کہہ کر اپنی ساس کو دے گئے تھے کہ "بی بی جان! آپ تو جانتی ہیں اماں اب بیمار رہتی ہیں، رضیہ اپنے گھر کی ہے۔ اسے کون سنبھالے گا اور پھر نانی سے بہتر پرورش اور محبت بھلا اسے کہاں سے ملے گی؟" طاہرہ بیگم نے جب ستارہ کے پھول سے وجود کو اپنے سینے سے لگایا تو انہیں وہ اپنی دردانہ ہی لگی۔

"شاہد میاں! بہانے اور تاویلیں تراشنے کی ضرورت نہیں آپ جائیے اور بے فکر ہو کر جائیے ہم اس کا خیال اپنی جان سے بڑھ کر رکھیں گے۔"

"جی شکریہ......" وہ پھیکے سے منہ سے بولے اور پھر جاتے جاتے مڑے اور کہنے لگے۔

"وہ اس کے نان نفقے کی فکر نہ کیجیے گا وہ میں برابر بھیجتا رہوں گا۔"

"شاہد میاں...... بہتر ہوگا اب آپ مزید کوئی بات نہ کریں۔ اس کے نانا اور ماموں اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ آپ کے بھیجے چند روپوں کے منتظر رہیں گے جائیے خدا حافظ۔"

نور محمد جیلانی جو صبر کیے بیٹھے اِن کی گفتگو سن رہے تھے۔ آخر کار سختی سے بول ہی پڑے۔ جس پر شاہد میاں ایسے کچے ہو کر وہاں سے بھاگے کہ پھر برسوں وہ اس گھر کا رستہ ہی بھول گئے۔ شاہانہ اور شبانہ نے بڑے خلوص دل سے ستارہ کو پالنے پوسنے کی پیشکش کی۔ اسے لینے کو تو تکلم اور ترنم بھی بڑی محبت سے آگے بڑھی تھیں مگر طاہرہ بیگم نے یہ کہہ کر سب کا شکریہ ادا کر دیا کہ ''یہ آج سے میری بیٹی ہی ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں ہی اسے سنبھالوں گی۔'' یوں بھی دردانہ نے اپنے آخری وقت میں اپنی ماں کا ہی ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''بی بی! اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میری اولاد کو کسی اور کی گود میں نہ دینا خود اپنا لینا دردانہ سمجھ کے۔'' تب طاہرہ بیگم نے تڑپ کر اپنی بیٹی کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''اللہ میری بچی کی خیر کرے۔ خود اپنی اولاد کو گودوں کھلانا۔ اس کے سب ارمان اٹھانا۔'' مگر دردانہ کے جی کو تو جیسے خبر ہو چکی تھی کہ اب اسے یہاں سے رخصت ہونا ہی ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر جاتے جاتے بھی التجائیہ نظروں سے اپنی ماں کو ہی دیکھتی گئی تھی اور پھر سچ مچ وہ پلٹ کر نہ آئی تھی مگر اس کی التجائیہ نظریں لوٹ آئی تھیں۔ نرس نے جب ننھی منی سی ایک بے حد صحت مند اور پیاری سی بچی لا کر طاہرہ بیگم کی گود میں دی تو وہ گوشت کا لوتھڑا انہی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ تب سے طاہرہ بیگم اور نور محمد کو خوشی سے جینے کا ایک اور خوبصورت سا جواز مل گیا تھا۔ وہ اس کی یوں پرورش کرنے لگے تھے جیسے وہ اس کے نانا نانی نہیں بلکہ ماں باپ ہوں۔

نور محمد جیلانی پہلے صرف صابن اور سرف کی دو فیکٹریوں کے مالک تھے ستارہ کے ملنے پر انہوں نے ایک گھی اینڈ آئل مل کا افتتاح کیا۔ جس کا نام بھی انہوں نے ''ستارہ گھی اینڈ آئل مل'' ہی رکھا۔ جلد ہی اس کاروبار میں بھی انہیں خوب ترقی ملی۔ یوں ستارہ کو سب خوش بخت سمجھنے لگے اور وہ سب کی آنکھوں کا تارہ بن گئی۔

نور محمد جیلانی صاحب نے بیٹیاں بھی اپنے قریبی رشتہ داروں میں بیاہی ہوئی تھیں اور دونوں بہوئیں بھی رشتہ داروں سے ہی لائے تھے بلکہ تکلم اور ترنم دونوں سگی بہنیں تھیں نور صاحب کے چچا زاد بھائی کی بیٹیاں تھیں۔ تکلم ایس جیلانی کی دلہن بن کر آئیں تو تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق اور گھرداری کے سلیقے سے سب کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

انہی کے اوصاف سے متاثر ہو کر طاہرہ بیگم نے سوچا کہ کیوں نہ وہ دوسری بہن کا رشتہ بھی اپنے دوسرے بیٹے کے لیے مانگ لیں۔ دونوں بہنیں ہوں گی تو اتفاق محبت سے رہیں

گی دونوں بھائیوں کو بھی جوڑ کر رکھیں گی یوں جیلانی ولاز میں دونوں بھائی اور ان کی اولادیں آپس میں مل جل کر ہی رہیں گی۔

طاہرہ بیگم کا اندازہ کچھ حد تک درست ہی نکلا۔ اگرچہ تکلم اور ترنم میں بھی اکثر اختلافات ہو جاتے تھے دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتیں مگر جلد ہی بغیر کسی تیسرے کی مداخلت کے صلح بھی ہو جاتی۔ جس پر اکثر طاہرہ بیگم مسکرا کر کہتیں۔

''اختلاف رائے تو ہر انسان کا بنیادی حق ہے، ہونا چاہیے مگر اسے جھگڑا اور دلوں میں رنجش نہیں بننا چاہیے اور پھر جہاں دو برتن ہوں آپس میں بجتے ہی ہیں۔'' وہ خود ایک انتہائی سلجھی ہوئی طبیعت کی بُردبار قسم کی خاتون تھیں دونوں بہوؤں کے اندرونی معاملات میں ہرگز دخل نہ دیتیں۔ کام کاج کے جھگڑے یا بٹوارے یوں بھی نہ تھے۔ جیلانی صاحب نے ایک درمیانی عمر کے بے اولاد جوڑے کو اپنے گھر میں ایک مشکل وقت میں پناہ دی تھی تب سے یہ دونوں یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ رحمت اور اس کی بیوی بخشو نے باورچی خانہ اتنی ذمہ داری سے سنبھالا ہوا تھا کہ کسی کو کبھی کوئی شکایت ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ اس کے گھر کے بچوں کو ہی اپنے بچے سمجھتے تھے۔

جیلانی ولاز دو کنال اراضی پر مشتمل ایک پُر آسائش بنگلہ ہی نہیں بلکہ ایک پُرسکون گھر بھی تھا۔ اس گھر میں ایک وسیع اور سرسبز لان تھا اور آمنے سامنے بنے دو مکمل پورشن تھے۔ بالکل ایک سے۔ ایک جیسی آرائش اور ضروریات وسہولیات سے مزین۔ مگر ڈرائنگ اور ڈائننگ دونوں حصوں کا مشترکہ تھا ایک چھوٹی سی انیکسی مہمانوں کے لیے اور ملازمین کے لیے اسی دو کنال کے بنگلے سے ملحق ایک دس مرلے کے پلاٹ پر بنے ہوئے صاف ستھرے سرونٹ کوارٹرز...... غرض جیلانی صاحب کو جتنا دل کھول کر اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اسی استطاعت سے انہوں نے اپنے گھر والوں، عزیز رشتہ داروں اور ملازمین کو بھی دینے کی کوشش کی تھی۔

گھر کے ملازمین کے علاوہ اپنے فیکٹری اور مل ورکرز کے ساتھ بھی وہ اتنے ہی مہربان تھے۔ دردانہ تو اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور اللہ کی رضا کے آگے کس کی مجال کہ وہ پَر بھی مار سکے۔ شاہانہ اور شبانہ دونوں اپنے گھروں میں نہ صرف خوشحال بلکہ خوش آباد بھی تھیں شاہانہ کے دو بچے ایک بیٹی عیون اور ایک بیٹا معید تھے۔ دردانہ اپنی ایک نشانی ستارہ کی شکل میں چھوڑ گئی تھی۔ شبانہ کے تین بچے ہدیٰ، عادل اور سالار تھے۔ اسی طرح سے ایس جیلانی کے تین بیٹے احمد حسن، جواد اور زید تھے جبکہ عمیس جیلانی کی دو بیٹیاں زائرہ، ردا اور ایک بیٹا رمیض تھا۔ نور

محمد صاحب اللہ تعالیٰ کے بے حد شکر گزار تھے جس نے انہیں اولاد جیسی نعمت سے خوب نوازا تھا اور اس ذاتِ باری تعالیٰ کا احسان یہ بھی تھا کہ ان کی اپنی اولاد بھی ان کی فرمانبردار تھی اور آگے سے پوتے اور نواسے نواسیاں بھی نیک سیرت تھے۔ اولاد میں اصل سے چونکہ سود پیارا ہوتا ہے اس لیے انہیں اپنی اگلی نئی نسل سے بے حد محبت تھی۔

یوں تو سارے بچے ہی ان کے لاڈلے تھے مگر جانے کیوں نواسیوں میں ستارہ اور پوتوں میں زید محمد میں ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ یہ دونوں ہی اپنی عادات میں یکتا تھے۔ سب کا خیال رکھنے والے اور سب سے بے لوث محبت کرنے والے تھے۔ زید کی عادت میں محبت اور خلوص کے ساتھ شوخی اور شرارت بھی تھی وہ ہر وقت چٹکلے سناتا۔ اِدھر سے اُدھر بھاگتا سب کو ہنساتا رہتا۔ اس سے بڑے دونوں بھائی پڑھائی میں خاصے تیز تھے۔ احمد حسن تو ایم۔ بی۔ اے کرنے آسٹریلیا گیا پھر اُدھر سے ہی اٹلی جا نکلا تھا جہاں وہ کوئی کاروبار کر رہا تھا۔ جواد نے کیمیکل انجینئرنگ میں ٹیکسلا یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہوا تھا اور زید محمد چونکہ کھلنڈرا سا تھا پڑھائی میں نالائق تو نہیں تھا مگر کچھ جت کر پڑھنے والا نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ بی کام میں تھا اور بس ٹھیک ہی تھا۔ انیس جیلانی اس کی شرارتوں سے زیادہ اس بات پر خائف رہتے تھے کہ وہ سنجیدگی سے پڑھتا کیوں نہیں۔ انیس جیلانی چونکہ بہت ہی زیادہ کاروباری ذہن کے تھے اور ان کا اپنا ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی ابھی میٹرک میں ہی تھا اس لیے انہیں یہ فکر بہت ستاتی تھی کہ ان کے کاروبار کو کم سہارا ملے گا۔

احمد حسن کے ساتھ ستارہ کی نسبت ویسے تو بچپن میں ہی ٹھہرا دی گئی تھی لیکن اس کا باقاعدہ اعلان احمد کے آسٹریلیا جانے کے وقت کیا گیا تھا تاکہ احمد میاں وہاں جا کر اپنے پیچھے دیکھتے رہیں کہ ان کے پیچھے کوئی ان کا رستہ تک رہا ہے۔ جواد کے لیے جیلانی صاحب کا خیال تھا کہ زائرہ ٹھیک رہیں گی۔ ردا کو وہ شاہانہ کے معید سے منسوب کرنے کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو مستقبل میں ایک دوسرے سے جوڑنا چاہتے تھے اور بقول ان کے آپس کی شادیاں رشتوں کو مضبوط کرنے کا بہترین ذریعہ ہوتی ہیں یوں بھی اپنوں پر پہلے اپنوں کا ہی حق ہوتا ہے۔ زید کے لیے انہیں عیون بھی بہت پسند تھی اور شبانہ کی ہدیٰ بھی...... اس کا فیصلہ انہوں نے فائنل نہیں کیا تھا۔

احمد حسن کو انہوں نے فون کر کر کے واپس بلا ہی لیا تھا وہ جب بھی اسے فون کرتے کہتے۔ ''یار! اب بس کر پردیس کاٹنا...... واپس آ جا۔''

وہ مسکرا کر کہتا۔ ''دادا جان! واپس تو میں نے آنا ہی ہے بس ذرا کچھ کاروباری تجربے

حاصل کر رہا ہوں۔''

وہ اس کی ایک نہ مانتے اور اپنی ضد پر قائم رہتے۔ ''وہاں کیا ان گوری چمڑی والوں سے سیکھو گے۔ یہاں آؤ اور آ کر اپنا کاروبار سنبھالو سارے تجربے خود بخود ہو جائیں گے۔''

''میرے پیارے دادا جی...... بس کچھ دیر اور...... پھر آ ہی جاؤں گا۔'' وہ اور مہلت مانگتا۔ جس پر وہ کچھ وہمی ہو جاتے۔

''میاں خیر تو ہے کہیں پاؤں میں کوئی بیڑی تو نہیں ڈال لی جو واپس قدم اٹھانے نہ دیتی ہو۔'' وہ اپنے دادا کی فکرمندی پر محظوظ ہوتا۔

''سچ کہوں دادا جی!''

''ہاں ہاں سچ ہی کہنا اور قسم ہے تمہیں سچ کے سوا کچھ مت کہنا...... ورنہ...... ورنہ۔'' وہ پریشان ہونے لگتے۔

''میرے پاؤں میں تو بیڑیاں ہیں۔'' وہ آدھی بات کر کے چپ ہو جاتا۔

''کیا کہا...... کیا...... میں تو پہلے ہی کہتا کہ یہ باہر جانے والے۔'' وہ اپنا دل پکڑ کے کہتے۔

''واہ دادا جی خود ہی بیڑیاں ڈال کے یہاں بھیجا اب خود ہی شک کرتے ہو۔''

وہ بے تکلفی میں یاری دوستی پر اتر آتا۔

جیلانی صاحب سکھ کا سانس لیتے اور مسکراتے۔ ''بہت خراب ہو تم۔''

''جیسا بھی ہوں نور محمد جیلانی کا پوتا ہوں۔'' وہ لاڈ سے کہتا۔ یوں اس نے کھینچ تان کے ایک آدھ سال اور نکال لیا تھا مگر اب تو جیلانی صاحب سے زیادہ طاہرہ بیگم نے شور مچا دیا ان کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور اسے وہاں سے اپنا بوریا بستر باندھنا پڑا۔ جب اس نے اپنے آنے کی خبر پورے اعتماد سے دے دی تو ساتھ ہی گھر میں اس کی شادی کا شور مچ گیا۔

بڑے سر جوڑ کر بیٹھے۔ چھوٹوں نے خوب ہنگامہ کیا شاہانہ اور شبانہ بھی اپنے شوہروں اور بچوں سمیت آ گئیں۔ سارے کزنز مل گئے اور لگا کہ شادی کے فنکشن شروع ہی ہو گئے ہوں۔

جیلانی صاحب جب بھی کوئی کام کرتے یا خاندانی فیصلہ تو اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں اور دامادوں معاذ اور یوسف کو بھی برابر مشورے میں شریک رکھتے۔ اب بھی سب کے مشورے سے یہی طے پایا تھا کہ احمد حسن کی فلائیٹ جس روز ہو اسی شام دعائے خیر کی جائے۔ اگلے روز نکاح اور پھر دعوت ولیمہ ہو جائے۔ ابٹن اور مہندی کی رسموں کے جیلانی صاحب سخت خلاف تھے اس لیے سختی سے ایسی خرافات پر پابندی تھی۔

دعائے خیر کے روز بھی جیلانی ولاز میں ایک پُر تکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔ نکاح کا کھانا بھی اسی نوعیت کا تھا جبکہ دعوت ولیمہ کے دو فنکشن تھے ایک خالص رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے جو اسی درمیانی لان میں ہونا تھا جبکہ دوسری دعوت کا انتظام شہر کے بہترین ہوٹل میں تھا جس میں جیلانی سوپ فیکٹریز اور ستارہ آئل ملز کے حساب سے کاروباری حلقوں اور شہر کے سماجی حلقوں کی دعوت تھی۔ احمد حسن کی آمد پرسوں تھی اور زید محمد نے مہمانوں کے لیے بٹھانے اور کھلانے کا انتظام آج ہی کر لیا تھا جس پر ابھی ابھی اسیس اور عمیس اچھی خاصی بحث کر کے گئے تھے اور زید محمد تسلی سے اپنے دادا اور بی بی جان کو کھانے کا مینو بتا رہا تھا۔



ستارہ نے اپنی آنکھیں اس دنیا میں کھولیں تو وہ اپنی نانی کی گود میں تھی جب اس نے ہوش سنبھالی اور لوگوں کو رشتوں کو پہچاننا شروع کیا تب بھی وہ اسی شفیق ہستی کے پہلو میں سوتی تھی۔ طاہرہ بیگم ایک پل کے لیے بھی اسے خود سے جدا نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے اس کی تربیت بہت ہی محنت سے کی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بے حد مشابہہ تھی۔ ویسی ہی سیاہ کالی آنکھیں اور چھوٹا سا دہانہ، بھرے بھرے لب اور چھوٹی سی ناک، دردانہ کی ناک بھی بہت ستواں نہ تھی لیکن چپٹی اور موٹی بھی نہ تھی اسی طرح سے ستارہ کی ناک بھی چھوٹی سی تھی جو اس کے چہرے پر بڑی بھلی دکھائی دیتی تھی۔ بڑی سیاہ آنکھوں پر خمدار پلکیں اور گلابی گداز لب اتنے نمایاں تھے کہ وہ دیکھنے والے کی توجہ اپنے سوا کسی اور چیز پر ٹھہرنے ہی نہیں دیتے تھے۔ اس کے بال بھی اپنی ماں جیسے گھنگھریالے تھے۔

تکلم اسے بہت پیار کرتی تھی۔ اس کے لیے پیارے پیارے فراک سیتی اور میچنگ ربن باندھ کر اس کی دو چوٹیاں باندھ دیتی پھر اسے غور سے تکتی اور پیار سے ماتھا چوم لیتی۔ بی بی جان نے اس کا نام ستارہ رکھا تو بالکل ٹھیک ہی رکھا۔

”یہ تو وہ ستارہ ہے جو چاند کے پاس ہوتا ہے روشن اور چمکیلا ستارہ۔“ تب اسیس جیلانی اپنی بھانجی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے اور کہتے۔ ”تکلم! یہ وہی ستارہ ہے اور پتہ ہے اس کا چاند کون ہے؟“ وہ اپنی بیوی سے مسکرا کر پوچھتے۔

”جی جانتی ہوں...... وہ چاند میرے گھر میں ہی ہے۔“ وہ ان کی بات کی گہرائی جان کر پیار سے جواب دیتیں۔ اسیس اور تکلم دونوں کو ہی اس بات پر ہرگز اعتراض نہ تھا کہ ستارہ احمد حسن کی دلہن بنے بلکہ وہ دونوں تو دل سے یہی چاہتے تھے۔

بچپن سے ہی ستارہ اور احمد حسن کی بہت دوستی تھی۔ جو عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک

بڑے ہی خوبصورت احساس میں بدل گئی۔ ایسے احساس میں جس کا نام محبت تھا مگر ان دونوں کے بیچ جو محبت تھی وہ کسی بھی قسم کے اظہار اور عہد و پیماں سے مبرا تھی۔ دونوں کے دل ہی نہیں روحیں ایک دوجے سے جڑی ہوئی تھیں۔ تہذیب اور شرافت، شرم اور حیاء کی ایک بھی دیوار ان دونوں کے بیچ کبھی نہ ٹوٹی تھی۔

احمد حسن جب آسٹریلیا جا رہا تھا تو ستارہ چھپ چھپ کر رونے اور ہجر کی لمبی سیاہ راتوں سے خوفزدہ ہونے کی بجائے نمازوں اور نوافل میں لمبی لمبی دعاؤں کا سہارا لینے لگی تھی۔ احمد حسن کے خیر سے وہاں جانے...... خیریت سے رہنے اور بہترین کامیابیوں کی دعائیں۔ زید جو اکثر ستارہ کو چھیڑتا رہتا تھا۔ اسے یوں مطمئن دیکھ کر پوچھتا۔

”ستارہ آپی! آپ کو ڈر نہیں لگتا؟“

”ڈر......؟“ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھول کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی۔

”ہاں ڈر...... یعنی یہ سوچ کر کہ احمد بھائی دور دیس رہتے ہیں۔ اس دیس جو پریوں کا دیس ہے۔ ایک جادونگری ہے۔ اگر وہ کسی کے سحر میں گرفتار ہو گئے تو......؟“

تب وہ دھیما سا مسکراتی اور کہتی۔ ”جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں وہ جادوٹونوں سے نہیں گھبراتے۔“

”ایمان......“ وہ ذرا سا اٹکتا۔ پھر فٹ سے کہتا۔

”وہ تو آپ کا مضبوط ہے۔ احمد بھائی کی آپ کو کیا خبر۔“

”کیوں...... کیوں...... مجھے کیوں خبر نہیں۔“ وہ ہولے سے جرح کرتی۔

”مرد حضرات کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ ان کے ثابت قدم رہنے کی گارنٹی نہیں ہو سکتی۔“ وہ اسے ڈگمگانے کی راہ جان بوجھ کر دکھاتا مگر وہ اسی اعتماد سے کہتی۔

”احمد! ان مردوں میں سے نہیں ہیں۔“

”یعنی ان کی گارنٹی ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا۔

”لائف ٹائم......“ وہ ذرا سی گردن اکڑا کر کہتی۔

”کیا انہوں نے کوئی پیمان کر رکھا ہے جو آپ ہم سے چھپاتی ہیں؟“ وہ اس کے اعتماد کی وجہ سے کریدنے کی کوشش کرتا۔

”جنہیں ایک دوجے پر بھروسہ ہو وہ وعدے نہیں کرتے۔“ وہ اسی اعتماد سے جواب دیتی تو وہ چڑ جاتا۔

"تارہ آپی! آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی اور کہتی۔

"ابھی تمہاری عمر بھی نہیں ہے۔ بچے ہو۔"

"جی نہیں اب میں جوان ہوگیا ہوں بلکہ کڑیل جوان یہ دیکھیں۔" وہ اپنا چوڑا سینہ اور پھیلاتے ہوئے کہتا۔ جس پر وہ ہولے سے ہنس دیتی اور کہتی۔

"اللہ نظرِ بد سے بچائے۔" وہ سب کے ساتھ اسی طرح سے محبت کرتی تھی۔ گھر میں مختلف مزاج کے لوگ تھے اور یہ سارے بچے جو ذرا ذرا کی چھوٹائی بڑائی کے ساتھ بڑے ہوئے تھے۔ ان میں بھی عادتوں کا زمین آسمان جیسا فرق تھا۔ احمد حسن فطرتاً سنجیدہ تھا۔ جواد ذرا نک چڑھا تھا اور خود پسند بھی لیکن دوسروں کے لیے بے ضرر اور اپنی پڑھائی سے جڑا رہنے والا۔ زید میاں گھر بھر میں سب سے زیادہ شوخ اور شراتی۔

عمیس جیلانی کی اولاد میں زائرہ جیلانی بے حد مغرور اور نخرے والی تھی اللہ نے اسے حسین بنایا تھا جس پر وہ رب کی شکر گزار نہیں بلکہ خود پر نازاں تھی۔ وہ کم کم ہی کسی سے گھلتی ملتی تھی اس کا بس اپنا ایک خاص حلقہ یاراں تھا جس میں وہ خوش رہتی باقی کوئی اس کی ناک تلے نہ آتا تھا۔ ردا بہت بھولی اور بے وقوف سی تھی جس پر زید نے اس کا نام ہی ردابی بی رکھ دیا تھا اور رمیض جو دونوں گھروں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ اکیڈمیوں میں پڑھ پڑھ کر ہی باؤلا ہوا رہتا تھا اس کے بابا نے اسے، وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر ایف، ایس، سی میں اس نے میڈیکل کے میرٹ مارکس نہ لیے تو وہ اسے کالج سے اٹھا کر اپنے ساتھ فیکٹری لے جانا شروع کر دیں گے اس لیے وہ بیچارا تو اس میں مگن رہتا تھا۔ فارغ ہوتا تو سپورٹس چینل پر کرکٹ میچ دیکھ دیکھ کر خوش رہتا۔ شاہانہ اور شبانہ کے بچے گرمیوں کی چھٹیوں میں یا پھر عید بقر عید پر ہی آتے تھے وہ سب بھی ایسے ہی تھے کوئی نرم اور کوئی گرم مزاج...... لیکن ان ساروں کی جس ایک کے ساتھ ہمیشہ بنتی۔ وہ ستارہ تھی جسے ہر ایک اپنے راز بھی بتا دیتا اور اس سے مشورے بھی لے لیتا۔



احمد حسن کو لینے ایئرپورٹ پر سارا خاندان ہی پہنچا ہوا تھا۔ سوائے ستارہ کے...... اسے زید جاتے جاتے بھی چھیڑ کر گیا تھا۔ "اگلی بار سارا گھر نہیں جائے گا بس آپ ہی جائیں گی انہیں لینے۔"

جس پر وہ بھی شرارت سے جواباً بولی تھی۔ "میں تو خود ان کے ساتھ ہوں گی۔ لینے تو تم

ہی آؤ گے سارے گھر کے ساتھ۔"

جس پر وہ ہنستا ہوا "اچھا تو یہ ارادے ہیں؟" کہہ کر باہر نکل گیا تھا کہ اسے دیر ہو رہی تھی۔ احمد حسن پہلے سے بھی زیادہ اچھا ہوگیا تھا کچھ صحت مند ہو کر اور کچھ باہر کی آب و ہوا کا اثر تھا۔ سب کے منہ سے اسے دیکھتے ہی "ماشاءاللہ" نکلا تھا وہ سب سے پہلے بی بی جان سے ملا جو اپنی باہیں پھیلائے اس کی منتظر کھڑی تھیں۔

"جیتے رہو۔" انہوں نے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے پیار سے کہا اور پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

"آداب! دادا جان......" ان کے بعد وہ اپنے دادا جان کے سامنے سر جھکائے مؤدب کھڑا تھا۔

"شاد رہو۔" انہوں نے دعا دیتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا اور نظر بھر کے دیکھا۔ پیار بھری نظر...... پھر اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ وہ اپنے پوتوں نواسوں کو دیکھ کر خوشی سے جوان ہو جایا کرتے تھے۔ پھر وہ باری باری سب سے ملا۔ سب سے آخر میں وہ باچھیں کھلائے کھڑا تھا۔

"آیئے بھائی جان...... آپ نے بہت راہ دکھائی۔" وہ بازو پھیلائے بے تابی سے بولا۔

"یار! تم تو بہت بڑے ہوگئے ہو۔" احمد اسے مل کر سر سے پاؤں تک دیکھتا ہوا بولا۔

"صرف بڑا، جوان نہیں۔" اس نے سینہ پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی جوان بلکہ بھرپور جوان۔" وہ اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"اوہ تمہاری تو پوری پلٹون آئی ہے۔" وہ اپنی ڈھیر ساری کزنز کو دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"جی آپ کو بحفاظت اور سخت نگرانی میں واپس گھر لے جانے کے لیے ایک پلٹون کی ہی ضرورت تھی۔"

عمیس چچا کی منجھلی ردا نے حاضر جوابی سے کہا۔ "اور نہیں تو کیا...... ورنہ آپ کی کیا خبر ایئرپورٹ سے ہی پھر بھاگ جاتے۔"

چھوٹی پھپھو شبانہ کی ہدیٰ نے بھی بے ساختہ کہا جس پر سب ہنس پڑے۔ "اب یہ واپس نہیں جا سکتا۔"

بی بی جان نے محبت میں اعتماد بھرتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتا ہوا دوبارہ سے ان کے کندھے سے لگ گیا۔ ''جی بی بی جان!'' یوں ایئرپورٹ سے گھر واپسی تک راستہ ہنسی مذاق میں کٹا۔ آگے پیچھے کئی کاریں اور ان میں سے جھانکتے خوش چہرے اور کھنکتے قہقہوں سے لگ رہا تھا جیسے کوئی بارات جا رہی ہو۔



سب لوگ بے حد خوش تھے۔ آج کا سارا دن ہی اسی طرح پُر رونق گزرا تھا اب بھی رات کے کھانے کے بعد سب لوگ بڑے کمرے میں جمع تھے یہ کمرہ جیلانی صاحب نے اپنے خاندان سے اکٹھا ہو کر بیٹھنے کے لیے ہی بنوایا تھا اس میں کہیں کوئی فرنیچر نہ تھا ساری ہی فلور سٹنگ تھی چھوٹے بڑے بے شمار فلور کشن یہاں رکھے ہوئے تھے۔ جب بھی یہ سارے بہن بھائی اکٹھے ہوتے تو یہیں پر بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے اور یہیں پر خاندان کے بیشتر معاملات طے ہوتے تھے۔ آج سبز چائے کے ساتھ ساتھ سب معاذ پھوپھا کے لطیفوں سے بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ معاذ جیلانی فطرتاً بڑی خوش مزاج طبیعت کے مالک تھے ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ انہیں ہر موقع کی مناسبت سے لاتعداد لطائف یاد تھے اور ہر بار وہ نیا اور اچھوتا لطیفہ سنا کر محفل لوٹا کرتے تھے۔ خصوصاً سرداروں کے لطیفے تو انہیں بے حد پسند تھے۔

اس وقت بھی وہ ایک سردار جی کے خیالات پر روشنی ڈال رہے تھے۔ جس پر سب جی کھول کر ہنس رہے تھے۔ جب زید کو محسوس ہوا کہ احمد حسن اس کے گھٹنے کو اشارۃً دبا رہا ہو۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ جواباً وہ اسے باہر جانے کو کہہ رہا تھا۔ زید کو سمجھ تو آ گئی کہ احمد بھائی کس بات پر اسے یہاں سے باہر جانے کو کہہ رہے ہیں...... مگر یوں ایک دم سے مجلس میں سے اٹھ کر جانا بھی مناسب نہ تھا۔ اس نے ہولے سے کہا۔ ''بھائی جان! خیریت تو ہے؟''

''بس تم چلو باہر۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ پھر پہلے احمد حسن اور کچھ دیر بعد زید وہاں سے باہر چلا گیا۔

''کیا بات ہے بھائی جان؟'' زید نے اسے ٹیرس پر بے قراری سے چکر لگاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''وہ...... وہ میں جب سے آیا ہوں میں نے اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔'' وہ اسی بے قراری سے بولا۔

''کس کی ایک جھلک؟'' زید اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''ستارہ کی اور کس کی؟'' وہ بلا جھجک بولا۔

''ویسے جی...... یہ کوئی بات ہے۔ آئیں میں آپ کو دکھاؤں۔'' وہ اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔

''تھینک یو یار...... تھینک یو...... تم تو بہت اچھے ہو۔'' احمد حسن کی باچھیں کھل گئیں۔

''جی...... جی ذرہ نوازی ہے آپ کی۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔ وہ اسے اپنے ساتھ باہر چھت کے صحن میں لے آیا تھا۔

''وہ دیکھیں احمد بھائی۔'' زید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا؟'' احمد حسن سے اس کی انگلی کی طرف سے آنکھیں آسمان پر لگا دیں۔

''وہ دیکھیں ناں...... چاند کے ساتھ؟'' زید نے اصرار کرتے ہوئے اس کی توجہ چاند پر مرکوز کرا دی۔

''کیا ہے وہاں؟'' وہ جلد ہی زچ ہو گیا۔

''کمال ہے اتنا روشن ستارہ ہے۔ چاند کے پہلو میں اور آپ کو دکھائی نہیں دے رہا'' وہ بے حد معصومیت سے بولا۔

''مطلب؟'' احمد حسن کو اس کی شرارت کچھ کچھ سمجھ میں آ گئی۔

''مطلب آپ نے ستارہ دیکھنے کی ضد کی تھی۔ میں نے دکھا دیا۔'' وہ اسی معصومیت سے بولا۔

''زید کے بچے تم بہت بُرے ہو اور بدتمیز بھی......'' وہ بے بسی سے پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔

''ارے...... رے...... سنیں تو...... سنیں تو احمد بھائی......'' وہ اس کے پیچھے لپکا کہ مبادا وہ سچ مچ ہی ناراض نہ ہو جائے۔

''کیا ہے؟'' وہ خفگی سے منہ پھلائے کھڑا تھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں ویسے وہ مانیں گی نہیں۔'' زید سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''صرف ایک بار...... بس دو منٹ...... بھلے بات نہ کرے...... ایک نظر دیکھ لوں۔''

اس کے انداز میں بڑی تڑپ اور تشنگی تھی۔ اس کی آنکھیں دل بنی ہوئی تھیں جس میں اس کے

جذبوں کے بڑے شفاف عکس دکھائی رہے تھے۔

''احمد بھائی! میں کوشش کرتا ہوں۔ وعدہ نہیں کرتا۔ تارہ آپی جو کام کرنا نہ چاہیں وہ کوئی ان سے کروا نہیں سکتا۔'' وہ بے چاری سی شکل بنا کر ستارہ کے کمرے کی طرف چل تو دیا مگر اسے یہ پہلے سے معلوم ہی تھا کہ وہ اس بات کو فوراً رد کر دے گی یہ کہہ کر ''زید! تم مجھے جانتے نہیں ہو کیا؟'' اور پھر یہ کس قدر غلط خواہش ہے۔ ''نہیں...... ہرگز نہیں۔''

وہ جو کچھ سوچتا آ رہا تھا ستارہ کا ردعمل اس کے عین مطابق ہی تھا پہلے تو وہ اس کی بات سن کر خاموش ہی ہو گئی اور منہ دوسری طرف پھیر کے کھڑی ہو گئی۔ زید کے آنے سے پہلے وہ اپنی الماری کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ بنا کچھ جواب دیئے۔

''تارہ آپی پلیز...... بس دو منٹ۔'' وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

''کیوں...... کس لیے؟'' وہ تنبیہی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تارہ آپی! وہ احمد بھائی آپ کے دولہا ہیں غیر تو نہیں؟'' اس نے اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات اسے یاد کرانا چاہی۔

''ڈفر! وہ میرے دولہا ابھی پورے تین روز کے بعد بنیں گے۔ ابھی وہ میرے لیے غیر ہی ہیں۔''

اس نے زید کی بھولی اور بے وقوف سی شکل دیکھ کر دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''غیر...... غیر تو پھر بھی نہیں ہیں آپ کے ماموں کے بیٹے ہیں آخر۔'' وہ بدستور اسی بھولپن سے بولا۔

''میرے ماموں کے دوسرے بیٹے صاحب! یہ باتیں آپ کی اس ننھی سی عقل سے بالاتر ہیں۔ پلیز جایئے اور انہیں میرا اسلام کہہ دیجیے گا۔'' وہ اسے مزید سمجھانے سے گریز کر گئی جانتی تھی کہ وہ اپنا نظریہ محبت اس پر واضح نہیں کر پائے گی۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ منہ لٹکا کر جانے کو پلٹا۔

''اور سنو...... یہ انہیں دے دینا۔'' اس نے اپنے کمرے میں رکھے بڑے سے پھول دان میں سے ایک سرخ گلاب اور اپنے تکیے کے پاس دھرے تازہ موتیے کے پھولوں میں سے چند پھول اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''یہ کس لیے...... یہ بھی نہ دیں رہنے دیں۔'' وہ کچھ خفا سا بولا۔

''یہ اس لیے کہ ان کا غصے سے بوجھل دماغ ہلکا اور معطر ہو جائے اور میرا جواب انہیں با

آسانی سمجھ آ جائے۔''

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ کندھے اچکاتا ہوا مسکرا کر چلا گیا۔



ہدیٰ، عیون اور ردا تینوں نے بی بی جان کو نئے زمانے کے نئے تقاضوں پر مثالیں دے دے کر آخر اس بات پر راضی کر ہی لیا تھا کہ نہ صرف وہ لوگ ستارہ کو بیوٹی پارلر سے تیار کروائیں گی بلکہ خود بھی اپنے فیشلز وغیرہ کروائیں گی۔ پہلے تو وہ اس بات کو سننے پر ہی تیار نہ تھیں مگر ہدیٰ نے اپنی نانو کو لاڈ کر کر کے منا ہی لیا تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ دادا جان سے اس کی اجازت کیسے لی جائے اور کون لے؟

''کون...... کون...... کون کر سکتا ہے دادا جان کو اس بات پر قائل؟'' وہ تینوں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

''زید...... ہاں زید یہ کام کر سکتا ہے۔ بلکہ صرف زید ہی یہ کام کر سکتا ہے۔'' ہدیٰ نے تکرار کے ساتھ یقین دہانی کرائی۔

''میں زید کو بلا کر لاتی ہوں۔''

عیون جلدی سے زید کو بلانے کے لیے لپکی۔ ''سالار بھی تو جا سکتا ہے یا پھر جواد اور عادل میں سے کوئی؟'' زائرہ نے بری سی شکل بناتے ہوئے کہا۔ اسے جانے کیوں زید سے چڑ تھی۔ وہ اسے ذرہ برابر نہ بھاتا تھا۔ اس کی خاندان بھر میں مقبولیت اسے کھلتی تھی۔ وہ اس کی معصومیت بے ساختگی اور بے لوث محبت کو اداکاری کہا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی۔

''بڑا تیز ہے یہ لڑکا...... پوز کرتا ہے ہر وقت اور اپنی اسی ڈرامے بازی سے اس نے دادا جان کو اپنے ہاتھ میں کر رکھا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے زید کے ساتھ عادل کو بھی لے جاؤ۔'' بی بی جان نے اس لیے کہہ دیا کہ لڑکیاں اکیلی جا رہی ہیں بڑی کوئی عورت تو جا نہیں رہی۔ دو بھائی ساتھ ہوں گے تو بہتر رہے گا۔

''عادل بھائی!'' ہدیٰ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی سخت طبیعت کی وجہ سے خوفزدہ ہو گئی۔ عادل لڑکیوں کو بازار وغیرہ لے کر جاتا ہی نہیں تھا اور اگر مجبوری میں لے بھی جاتا تو ''جلدی کرو جلدی کرو۔'' کی رٹ لگائے رکھتا اوپر سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور گھور کر الگ جان سلگاتا رہتا۔

"کیا بات ہے بچو...... کیا ہنگامہ ہے؟" اتنے میں زید کمرے میں داخل ہوا اور ان سب کو جمع دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں پوچھنے لگا عیون اسے بلا کر لے آئی تھی کہ مبادا کہیں پروگرام بدل ہی نہ جائے اسے بیوٹی پارلر جانے کا بے حد شوق ہو رہا تھا وہ پہلی بار کسی بیوٹی پارلر پر جا رہی تھی ورنہ تو ٹی وی یا میگزین میں ہی بیوٹی پارلر کو دیکھتی یا اس کے بارے میں پڑھتی رہتی تھی۔

"بی بی جان! زید آ گیا ہے۔" ہدیٰ نے بھی آگے بڑھ کر نانی کے گلے میں بانہیں حائل کرتے ہوئے انہیں یاد کرایا کہ زید کو کس لیے بلایا گیا ہے۔

"زید میاں! ذرا ستارہ کو بیوٹی پارلر تک لے جاؤ۔" طاہرہ بیگم نے بادل نخواستہ کہا۔ کیونکہ دل سے تو وہ بھی انہیں بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔

"بی بی جان! ستارہ آپی کے ساتھ ہم سب نے جانا ہے۔" عیون نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کا ننھا سا دل صرف ستارہ کے جانے کا سن کر لرزنے لگا تھا اور اس کے بے پایاں شوق پر پانی پڑنے لگا تھا۔

"ہاں...... ہاں ان سب کو بھی لے جاؤ۔" طاہرہ بیگم نے اوپری دل سے کہا۔

"بی بی جان! بیوٹی پارلر۔" زید نے اپنا منہ حیرت کے ساتھ کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں میاں بیوٹی پارلر...... یہ نیا زمانہ اور اس کی ضرورتیں...... ہم تو عمر بھر ایسی خرافات سے دور ہی رہے۔ پر پھر بھی اللہ کا شکر ہے ہمارے رنگ روپ پر آنچ نہ آئی۔ نہ وقت بیتنے کی لکیریں گہری ہوئیں اور نہ ہی موسموں کے اثرات سے رنگ کا دودھیا پن ماند پڑا۔" وہ اپنے حُسن پر ناز کرتی ہوئی بولیں۔

"واقعی بی بی جان آپ کے حُسن کا کیا مقابلہ قسم سے ان ساری بچیوں میں سے کوئی ایک بھی آپ پر نہیں گئی۔ سوائے تارہ آپی کے۔" زید بھی شرارت سے بولا۔

"بس تمہیں تو موقع چاہیے بک بک کرنے کا چلتے ہو یا نہیں۔" زائرہ نے بڑی بدتمیزی سے اسے ڈانٹ دیا۔

"سوری...... سوری...... میرا تو کوئی معاملہ نہیں ہے میں تو بی بی جان کی تعریف کر رہا تھا اور بالکل سچی تعریف کر رہا تھا۔ کہہ دے اگر کسی کو انکار ہے کہ بی بی جان تم سب سے زیادہ حسین ہیں اور آج بھی اتنی فریش ہیں کہ ان کی چمکتی جلد سے روشنی پھوٹتی ہے۔ کیوں بی بی جان؟"

وہ بڑی محبت سے اپنی دادی کے زانو پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گیا۔

"جیتا رہ میری جان۔" طاہرہ بیگم نے ہنستے ہوئے اس کے گال پر چٹکی لے لی۔

"شروع ہو گئی ڈرامے بازی...... لسوڑا کہیں کا...... ہر کسی کو چپکتا ہی رہتا ہے۔" زائرہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"بی بی جان! دیر ہو رہی ہے۔ جانے دیں ناں پلیز......" عیون نے پیار سے منت کی۔

"زید تم اور سالار ان لڑکیوں کو لے جاؤ اور سنو وہیں پر رہنا اور انہیں جلدی واپس لے کر آنا۔ جیلانی صاحب کو پتہ چل گیا تو خفا ہوں گے۔" بی بی جان نے آخر سنجیدگی سے اپنی ہدایات کر ہی دیں۔

"بی بی جان! میں اور سالار وہیں رہیں۔ یعنی ہم بھی بیوٹی پارلر چلے جائیں بلکہ میں تو کہتا ہوں لگتے ہاتھ ہم بھی اپنے فیشل کروالیں گے۔"

وہ پھر شرارت سے بولا اور مزید زائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "آخر کو ہمیں بھی تو حق ہے کہ ہم بھی اپنی کیئر کریں۔ آخر کو ہم بھی تو سمارٹ ہیں۔"

"ہونہہ...... شکل دیکھی ہے۔ لنگور ہو پورے......" وہ پھر بڑبڑائی۔

"چلو اب تم دونوں اپنی چونچیں لڑانی بند کرو۔ پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔" ہدیٰ نے زائرہ کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ جاتے جاتے وہ زید کو پیار سے اشارہ کر رہی تھی کہ وہ اس کی باتوں کا بُرا نہ منائے۔ جس پر وہ نرمی سے مسکرا دیا۔

بی بی جان نے ہدیٰ کو روپے دیتے ہوئے بھی بہت سی نصیحتیں کیں اور وہ "بے فکر رہیں۔ بی بی جان! ہم جلدی آ جائیں گی۔" کہتی ہوئی تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔

ستارہ کو منانے کے لیے ردا کو بہت دیر پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ وہ بھی بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد ستارہ کو راضی کر کے لے آئی تھی ورنہ تو بیوٹی پارلر کا نام سن کر ہی وہ بدک گئی۔ وہ بھی نئے زمانے پرانی روح والی لڑکی تھی۔ ذرا بھی آج کل کی لڑکیوں جیسی نہ تھی نہ شوخ چنچل نہ فضول خرچ نہ گھومنے کا شوق یا شاپنگ سے لگاؤ وہ ساری کزنز میں علیحدہ ہی تھی۔ اس کی شخصیت کی اس انفرادیت نے جہاں خاندان بھر کو اپنا گرویدہ کر رکھا تھا وہیں زائرہ اس سے بھی خائف رہتی تھی۔ زائرہ دراصل خود بڑی عجیب اور متنازعہ سی شخصیت کی مالکہ تھی اور اب تو کچھ مہینوں سے اور بھی الگ تھلگ رہنے لگی تھی۔ ہر لمحہ اپنے موبائل یا پھر کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہتی۔ زید نے سب سے زیادہ اس بات کو نوٹ کیا تھا وہ کئی بار اسے چھپ

چھپ کر کسی سے باتیں کرتا دیکھ چکا تھا۔ اس نے قریب جا کر سننے کی کوشش اس لیے نہ کی کہ وہ اخلاقی طور پر ایسی حرکت کو ایک جرم تصور کرتا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

وہ بیوٹی پارلر پہنچے تو تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہی زائرہ پارلر سے باہر آ گئی۔ ''ارے تم اتنی جلدی فارغ ہو گئیں۔'' سالار نے خوشی سے پوچھا وہ سمجھا کہ بس اسی طرح جلدی جلدی ساری لڑکیاں فارغ ہو کر آ جائیں گی اور اسے انتظار کی اس کوفت کو بہت زیادہ نہیں اٹھانا پڑے گا۔

''نہیں...... وہ...... وہ مجھے کچھ کام تھا۔'' وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

''کام ہے...... کس سے؟'' سالار کے ساتھ ساتھ اب زید بھی حیران ہو گیا۔

''مجھے ذرا پرنس سٹور تک جانا ہے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پر جلد ہی قابو پا لیا اور اپنا اعتماد بحال کرتی ہوئی بولی۔

''پرنس سٹور تک...... مگر کیوں؟'' اب سالار کا موڈ آف ہو گیا۔

''مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ سب کے لیے۔'' وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی اور زید کی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''چلو......'' وہ ایک تحکم سے بولی۔

''یس میڈم۔'' اس نے مزید کچھ بحث کیے بغیر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہر وقت اداکار نہ بنے رہا کرو۔ چلو۔'' وہ اس کے مسکرا کر ''میڈم'' کہنے پر جل کر بولی۔

''تو ٹھیک ہے آپ اداکار کی بجائے سالار کے ساتھ چلی جائیں۔'' وہ بھی بھلا کب زیادہ دیر تک سہنے والا تھا گاڑی کا انجن جو ابھی اس نے سٹارٹ ہی کیا تھا بند کرتے ہوئے بولا اور مزے سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے میں رکشہ سے چلی جاؤں گی۔'' وہ اس تیور کے ساتھ گاڑی سے اترنے لگی۔

''اچھا ہے...... میں بی بی جان کو خبر کر دیتا ہوں۔'' اس نے اس کا ہاتھ گاڑی کا دروازہ کھولنے کی طرف بڑھتا دیکھ کر بی بی جان کا کہہ کر موبائل پر نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

''بلیک میلر...... ایڈیٹ......'' وہ دوبارہ وہیں پر بیٹھ گئی مگر غصے سے تلملاتی رہی۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی ورنہ بندہ کس قابل ہے۔'' اس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے

کورنش بجانے کے انداز میں کہا اور گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

پرنس سپر سٹور پر پہنچ کر وہ تیزی سے گاڑی سے نکلی اور یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔ ''تم یہاں رکو...... میں چند چیزیں خرید کر ابھی آتی ہوں۔'' زید نے اس کے پیچھے اندر جانا یوں مناسب نہ سمجھا کہ ہو سکتا ہے اس نے کچھ ایسی چیزیں خریدنی ہوں جو اس کے سامنے نہ خرید سکتی ہو اور پھر اسے جاسوسیاں کرنے کی عادت بھی نہ تھی۔ وہ گاڑی سے باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ایک پٹھان کو مکئی بھونتے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔

''خان بھائی...... ایک گرما گرم چھلی تو دینا ذرا۔'' وہ بھنی ہوئی چھلیاں دیکھ کر مطمئن نہ ہوا تو اپنی پسند کی ایک چھلی اٹھا کر اسے دی۔ ''اسے ذرا جلدی سے بھون دو۔'' پھر وہ سٹور کے مین دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ کہیں اگر وہ پہلے باہر آ گئی تو اسے نہ پا کر پھر بگڑ جائے گی مگر وہ تو اگلے کئی منٹ تک باہر نہ آئی جبکہ وہ اپنی پسند کی چھلی لے کر دوبارہ گاڑی کے پاس آ چکا تھا اور مزے لے لے کر اسے کھا رہا تھا۔ چھلی ختم ہو گئی تو اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور سٹور کی طرف چل دیا۔ اب تو اسے اندر گئے ہوئے پورا آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور اب فکر مندی سے اس کا حق بنتا تھا کہ وہ اسے جا کر چیک کرے کہ آخر وہ اتنی دیر سے اندر کیا کر رہی ہے۔

وہ سٹور کے اندر آیا تو وہ سامنے ہی کاؤنٹر پر موجود سیلز گرل کو پے منٹ کر رہی تھی پھر ایک بڑا سا شاپر اٹھا کر وہ پلٹی تو اسے سامنے پا کر بوکھلا گئی۔ گھبرا گئی اور اسی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

''لاؤ یہ مجھے دے دو۔'' زید نے شاپر اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

''میں اٹھا لوں گی تم چلو۔'' وہ تیز تیز قدموں سے اس کے آگے چلنے لگی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بھی اسی طرح واپس چل دیا۔ راستے میں نہ اس نے زائرہ سے کچھ کہا اور نہ وہ کچھ بولی۔ البتہ ایک سیاہ کرولا کو وہ نوٹ کر رہا تھا جو پرنس سپر سٹور سے لے کر اب تک ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس میں دو منچلے تیز آواز میں میوزک لگائے شور کرتے ہوئے کبھی ان سے آگے نکل جاتے اور کبھی برابر آ جاتے۔ جنہیں زید بڑے تحمل سے اس لیے نظر انداز کر رہا تھا کہ اس وقت زائرہ اس کے ساتھ تھی اور وہ خواہ مخواہ کا تماشہ لب سڑک کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ ان بدتہذیبوں کو سبق سکھانا اس وقت مشکل بھی نہ تھا۔

❖......O......❖

ستارہ کے بیڈ روم کا فرنیچر ابھی آنا تھا اور اسے کمرے میں سیٹ کرانے کے لیے بھی عمیس جیلانی نے عادل سے کہا تھا مگر عادل کو نور محمد صاحب نے کسی اور کام سے بازار تک بھیج دیا۔ وہ ابھی تک واپس نہ آیا تھا جس پر عمیس میاں کو بے حد غصہ آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتے جا رہے تھے اور عادل کے اوصافِ حمیدہ بیان کیے جا رہے تھے۔

"نابکار، نالائق، لاپروا بالکل ہی غیر ذمہ دار ہے شبانہ کا یہ بیٹا تو...... مجال ہے کبھی کوئی کام وقت پر کر دے اگر میرا رمیض ایسا ہوتو میں...... میں تو اسے سیدھا کر دوں ایک ہی روز میں...... مگر شبانہ اس نے تو اپنے بچوں کو سر پر چڑھا کے رکھا ہے۔" ان کا اس لمحے غصے سے یہ حال تھا کہ اگر عادل ان کے سامنے آ جاتا تو اس وقت لازمی وہ اس کے دو چار ہاتھ تو لگا ہی دیتے۔

"آئے ذرا آج یہ...... میں اس کی خبر لیتا ہوں اچھی طرح۔" وہ پھر سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔

"صاحب جی! بتائیں ناں کیا کرنا ہے؟" بخشو دوسری مرتبہ پوچھنے آیا تھا۔ وہ کیٹرنگ والے کا پیغام لے کر آیا تھا جسے عمیس میاں ابھی ابھی ڈانٹ کر آئے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ پوریاں اور سیخ کباب وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔ فضول خرچی ہے یہ سب آرام سے بریانی اور قورمہ بنایا جائے اور بس۔

"لے جائیں گے...... لے جائیں گے دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔"

وہاں خاندان بھر کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی ہی دھما چوکڑی مچائے ہوئے تھے باقی سب تالیاں پیٹ رہے تھے جبکہ زید ڈفلی بجا بجا کر لڑکیوں کو سنا رہا تھا۔

"لے جائیں گے لے جائیں گے......" اس نے تمام تر قوت سے لے کھینچی۔ اتنے میں تالیاں ایک دم رک گئیں اور سب لڑکے لڑکیوں کے نہ صرف ہاتھ ایک دوسرے پر جڑ گئے بلکہ ان کے چہرے بھی فق ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ زید پھر سے اپنے گلے کا جادو جگاتا۔ شاہانہ پھپھو آگے بڑھیں۔

"آئیں آئیں عمیس بھائی......" انہوں نے ذرا بلند آواز سے کہا تا کہ زید بھی سن لے۔

"عمیس چچا......" وہ ڈفلی بجاتا اور سپرنگ کی طرح اچھلتا اچھلتا یک دم ساکت ہو گیا

"جب دیکھو تمہاری ہلڑ بازی جاری رہتی ہے۔ کبھی سکون سے بھی بیٹھتے ہو۔" آتے ہی انہوں نے زید پر چڑھائی شروع کر دی۔

"جی...... جی...... چچا جان! وہ میں تو...... میں تو۔" زید بے چارا کھسیانا ہو کر اپنی پھپھو کے پیچھے ہو گیا۔

"دیکھو ذرا اپنے کام دیکھو! اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بگاڑنے کا عزم کر رکھا ہے تم نے......" وہ بدستور اسے ہی فوکس کیے ہوئے تھے۔

"عمیس بھائی! جانے بھی دیں بچے ذرا شغل لگا رہے تھے۔" اتنے میں شبانہ بچوں کے بچاؤ کے لیے آگے بڑھیں مگر وہ تو اور پھنس گئیں۔

"ہاں...... ہاں تم تو حمایت کرو گی ہی کیونکہ تمہارے تو اپنے بیٹے اس کے نقشِ قدم پر ہیں...... کہاں ہے وہ عادل؟" وہ جس کام سے آئے تھے اسے یاد آتے ہی عادل کے گن گانے لگے۔

"ایسا لاپروا ہے کہ مت پوچھو اور نافرمان بھی۔ کب سے میں کھڑا اس کا رستہ تک رہا ہوں اور وہ ہے کہ......"

وہ شبانہ کو سخت برہمی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"بھائی جان! وہ...... وہ اسے تو ابا جان نے سنار کی طرف بھیجا ہے وہ اسے لینے گیا ہے۔"

وہ کچھ کچی سی ہو گئیں۔ دھیرے سے بولیں۔

"تو مجھے بتا کر تو جاتا...... میں خواہ مخواہ اس کی آس پر بے وقوف بنا کھڑا ہوں۔" وہ جانے کو پلٹے تو تکلم بڑی ہی محبت سے آگے بڑھیں۔

"بھیا جی! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں یہ زید اور جواد کھڑے ہیں۔" ساتھ ہی انہوں نے اپنے بچوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

"جی چچا جان ہمیں بتائیں کیا کام ہے؟" جواد اور زید آگے بڑھے۔

"عمیس میاں فرنیچر کا ٹرک آ گیا ہے۔" رحمت چاچا نے آ کر اطلاع دی۔

"آؤ ذرا میرے ساتھ......" وہ زید کو نظر انداز کرتے ہوئے جواد کی طرف منہ کر کے بولے مگر جواد سے پہلے زید آگے بڑھ کر ان کا ہم قدم ہو گیا اور پھر عمیس جیلانی لاکھ اسے نظر انداز کرتے رہے اور جواد کو مخاطب کر کر کے اس پر طنز کرتے رہے لیکن وہ بھی اسی طرح اور زیادہ محبت اور یگانگت سے پیش آتا رہا۔ اس نے آگے بڑھ کر سارا فرنیچر نہ صرف بڑی احتیاط سے اتروایا بلکہ بڑے ہی سلیقے کے ساتھ کمرے میں سیٹ بھی کروایا۔

❖......○......❖

نور محمد جیلانی نے ستارہ کے معاملے میں اپنے دونوں بیٹوں اسیس اور عمیس کو شروع دن سے ہی یہ بات باور کرا دی تھی کہ وہ ان دونوں کے لیے بالکل اسی طرح سے ذمہ داری ہے جس طرح ان کی اپنی اولادیں۔ اسی لیے ستارہ کی شادی کے معاملات اور اخراجات میں انہوں نے اپنے بچوں کو مشورے ضرور دیئے مگر کس نے کیا کرنا ہے یہ انہوں نے کسی کو تاکید نہ کی۔ لہٰذا یہ سب کچھ اب اسیس اور عمیس نے کیا تھا۔ اسیس جیلانی تو اس بات پر بضد تھے کہ وہ ستارہ کی مرضی اور پسند سے اس کی ہر چیز خود ہی بنائیں گے مگر عمیس نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا۔

"بھائی جان! اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ اپنی بیٹی کو عزت سے رخصت نہ کر سکوں۔" وہ ستارہ سے واقعی بے حد محبت کرتے تھے۔ پھر بھی اسیس اور تکلم نے اسے زیور اور کپڑا بنانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

"بھیا جی! میں نے اسے اپنی بہو نہیں بنانا وہ میری بیٹی ہی رہے گی۔ میں نے زیور کپڑا بنانا ہی ہے بری اور جہیز کے نام دینے کی کیا ضرورت ہے۔" یوں عمیس جیلانی نے مہندی اور رخصتی کا کھانا اور ستارہ کے لیے بیڈ روم کا فرنیچر اپنے ذمے لے لیا تھا۔ طاہرہ اور نور محمد ان دونوں کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھ کر بے حد مطمئن اور خوش تھے۔



آج طاہرہ بیگم اپنے بچوں میں یہ اتحاد اور اتفاق دیکھ کر بہت خوش اور رب تعالیٰ کی شکرگزار تھیں۔

"جیلانی صاحب! خیر سے کل ہم ستارہ کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے۔" وہ رات کو عشاء کی نماز سے فارغ ہوئیں تو نور محمد جیلانی سے باتیں کرنے لگیں۔

"الحمدللہ! اس رحمت والے نے ہمیں خوشیوں کا دن دیکھنا نصیب کیا۔" وہ بے حد خوش تھیں۔

"ہاں! کل ہی کی تو بات لگتی ہے۔ جب ہم یہی باتیں دردانہ کے لیے کر رہے تھے۔" طاہرہ بیگم اپنی نم آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولیں۔ انہیں اپنی بیٹی یاد آ گئی تھی۔

"ہاں...... طاہرہ...... بیتا ہوا کل...... جو اتنا ہی مطمئن اور خوش تھا مگر اس کی شام بہت جلد ہو گئی۔ ایسی شام...... جس کا ملگجا اندھیرا ہمارے دلوں پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ جس نے ہمارے اندر اک گہرے درد کی طرح بسیرا کر لیا ہے۔" جیلانی صاحب بیٹی کی جواں مرگی کا صدمہ کہنے کو تو بڑے صبر سے برداشت کر چکے تھے مگر اک خلا سا تھا اک تشنگی تھی۔ جو انہیں ہر

سانس کے ساتھ دردانہ کی یاد دلاتے رہتے تھے۔

"میری بچی......" طاہرہ بیگم اپنے لبوں پر آنے والی سسکیوں کو روک نہ سکیں۔

"طاہرہ! وہ اللہ کا حکم تھا۔ مرضی تھی اس کی۔"

جیلانی صاحب فوراً بیوی کے پاس آ بیٹھے اور بڑی محبت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کی دلجوئی کرنے لگے۔

"بُری بات...... خوشی کے لمحوں میں غمگین ہو کر کفرانِ نعمت نہیں کرتے۔" وہ طاہرہ بیگم کے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

"اللہ جانتا ہے میاں! میں کفرانِ نعمت نہیں کر رہی۔ بہت خوش ہوں۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ تو میں جانتا ہوں۔" وہ بھی مسکرا دیئے۔

"اللہ میری ستارہ کی عمر دراز کرے اور اس کا دامن خوشیوں سے بھرے رکھے۔" طاہرہ بیگم نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے دل سے دعا دی۔

"آمین......" جیلانی صاحب نے بھی صدق دل سے کہا۔

"ویسے ستارہ اور احمد کی جوڑی خوب بنائی ہے میرے رب نے۔"

طاہرہ بیگم نے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی ستارہ کی تصویر کو اٹھا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بنانے والا...... بھلا کبھی کچھ غلط یا بُرا بنا سکتا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں پر اپنی اپنی مرضی کے عدسے لگا رکھے ہیں اور کسی کو بھی خوب صورت یا بدصورت کہہ دیتے ہیں۔ اچھا یا بُرا بنا دیتے ہیں اللہ نظرِ بد سے بچائے اور میرے بچوں کو سدا خوش رکھے۔"

انہوں نے طاہرہ بیگم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے ہی جذبے کے عالم میں کہا کیونکہ ان کی آنکھوں میں جو تھا وہی طاہرہ بیگم کی آنکھوں میں تھا۔ ستارہ اور احمد کے لیے بے پناہ پیار اور دعائیں۔

"اللہ کا کتنا بڑا شکر اور احسان ہے کہ ہمارے بچوں میں اتفاق اور محبت ہے۔" پھر وہ دونوں اپنے بچوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

"ہاں...... اور ستارہ کے معاملے میں میرے سارے بچے ہی قابلِ تعریف ہیں سب نے ہی ستارہ کو اپنے بچوں سے بڑھ کر اہمیت دی ہے۔"

"ہاں...... اور وہ تمہارے عمیس نے بھی۔" نور محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" طاہرہ بیگم نے مصنوعی ناراضگی سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے وہ جو اپنے بچوں پر بھی حساب کتاب سے خرچ کرتا ہے اور ہر لمحہ ان سے خائف رہتا ہے۔ اسے بھی ستارہ سے بے حد محبت ہے۔" انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"ہاں دیکھا نہیں آپ نے کس طرح سے کھلے ہاتھ کے ساتھ اس نے ستارہ کی شادی پر خرچ کیا ہے۔" طاہرہ بیگم نے اپنے بیٹے کی تعریف کی۔

"خیر...... بیگم اب کھلے ہاتھ والی بات اتنی بھی سچ نہیں آپ کی۔" وہ بیگم کو مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیوں...... کیوں غلط کیا ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے اسے کتنا اعلیٰ فرنیچر دیا ہے اس نے؟" وہ اپنے میاں صاحب کو یاد دلانے والے انداز میں بولیں۔

"اور وہ کھانے کے معاملات میں...... سیخ کبابوں اور پوریوں پر پابندی کس نے لگائی ہے۔" وہ بھی ان کی یادداشت کو متوجہ کرتے ہوئے بتانے لگے۔

"تو ٹھیک ہے ناں...... فضول خرچیوں کی کیا ضرورت ہے؟" وہ پھر بھی بیٹے کی حمایت میں ہی رہیں۔

"بھلے ان حلوائیوں کے سامنے ہماری ناک ہی کٹ جائے جو گھر میں آئے بیٹھے ہیں۔" اب نور محمد ذرا خفا سے تھے۔

"ایک تو آپ کی "ناک" بات بات میں آڑے آتی رہتی ہے۔ آپ خود سے کر لیں اگر یہ سب اتنا ہی ضروری ہے تو......" وہ پاندان کو کھول کر بیٹھ گئیں اور اس میں سے پان نکال کر بناتے ہوئے بولیں۔

"بیگم! آپ کیا سمجھتی ہیں کہ یہ سب جو عمیس کر رہا ہے یا اسیس...... ہمارے لیے اس کا کچھ بوجھ تھا؟"

وہ بیگم کے قریب ہو کر ذرا سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "ہم ان دونوں سے کہیں بڑھ کر یہ سب کر لیتے...... مگر کیا اس لیے نہیں...... کہ انہیں احساس رہے کہ ستارہ ان کی ذمہ داری ہے۔"

وہ بولتے بولتے ذرا رکے بیگم کے ہاتھ سے تیار پان لیا۔ منہ میں رکھا اور پھر گویا ہوئے۔

"دیکھو بیگم! ہم دونوں میں ایک جانے کب آنکھیں بند کر لے۔"

"اے میاں! اللہ سے خیر مانگئے۔ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔" جھٹ انہوں نے اپنے شوہر کو ٹوکا۔

"خیر ہی ہے طاہرہ بیگم......" وہ ذرا مسکرائے۔

"مگر یہ بھی تو اٹل حقیقت ہے کہ ہونی کب ہو جائے کسے خبر......"

انہوں نے طاہرہ بیگم کے ہاتھ تھام لیے اور ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگے۔ "اس وقت یہ دونوں ہی ستارہ کا سائبان ہوں۔ بس اسی کی تیاری کر رہا ہوں میں...... بس اس وقت کے لیے ان دونوں کے کندھوں پر میں نے ستارہ کا بوجھ رکھ دیا ہے۔ اس کے باپ کو جو کام کرنا چاہیے تھا۔ وہ ان دونوں میں تقسیم کر دیا ہے میں نے......"

وہ ستارہ کے باپ کا ذکر کرتے ہوئے بے حد دکھی ہو گئے۔

"دفع کریں اس منحوس کا ذکر۔ مٹی ڈالیں اس کی یاد پر...... میری ستارہ کو رب تعالیٰ نے اس سے بہتر نعم البدل دے رکھا ہے۔ اللہ اس کے دونوں ماموؤں کو اور آپ کو سلامت رکھے۔ ہمیں اس کی کچھ ضرورت ہے بھی نہیں۔"

نور صاحب کو دکھی ہوتا دیکھ کر انہوں نے شاہد کے ذکر کو نظر انداز کرنا چاہا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن پھر بھی وہ باپ ہے ستارہ کا۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے۔ وہ واقعی اداس اور پریشان تھے۔

"میں نے اسے کئی بار فون کیا۔ بتایا کہ ستارہ کی شادی ہو رہی ہے۔ سمجھایا کہ اس کا آنا بے حد ضروری ہے۔ رسماً ہی سہی مگر وہ آ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ تو رکھ دے۔ اسے رخصت کر دے۔ بھلے کھڑا کھڑا ہی آ جائے۔" وہ بے چینی سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"چھوڑیں بھی نور صاحب! اسے خدا نے توفیق ہی نہیں دی۔ یہ اس کی بدبختی ہی تو ہے ورنہ بیٹیوں کی محبت تو کٹھور سے کٹھور باپ کو بھی ایسے وقت میں پگھلائے دیتی ہے۔"

وہ خود بھی اٹھ کر ان کے ساتھ آ کھڑی ہوئیں۔

"مجھے اس کی ذات سے کچھ غرض نہیں وہ تو ازلی خودغرض اور بدعہد انسان تھا۔ اس نے جس طرح سے میری بچی کے ساتھ کیا...... میں......؟" فرطِ غم سے ان کی آواز رندھ گئی۔

طاہرہ بیگم نے انہیں قریب پڑی کرسی پر بٹھایا اور ان کے شانوں پر محبت سے اپنے ہاتھ رکھ دیئے وہ ان کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔

"طاہرہ! میری دردانہ...... یہاں...... یہاں پڑے ہیں اس کے وہ آنسو جو اس کم

ظرف نے اس کی آنکھوں کو دیئے تو ضرور مگر جنہیں صاف کرنے کا یارا اسے کبھی نہ ہوا۔" نور محمد نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"وہ آنسو رات کو سمندر بن جاتے ہیں جن میں میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ مجھے دردانہ کی وہ بھیگی ہوئی آنکھیں کچھ بھی بھولنے نہیں دیتیں۔" وہ بے اختیار رو پڑے۔

"نور صاحب! بس...... بس...... حوصلہ کریں۔ چھوڑیں بھی...... دفع کریں اس مردود کے ذکر کو۔ اپنے کیے کا صلہ وہ ضرور پائے گا۔ اس جہان میں میری دردانہ کے آنسوؤں کا حساب ضرور لیا جائے گا۔" انہیں حوصلہ دیتے ہوئے وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ اگلے چند لمحوں میں وہ دونوں سسکتے رہے اور خاموشی دعا بن بن کر آسمان کو چھوتی رہی، دردانہ کے اگلے جہان میں سکھ کی دعا اور ستارہ کے نئے سفر میں خوشیوں اور خوشبوؤں کے بچھ جانے کی دعا۔

"اچھا اب بس کریں۔ لیں یہ پی لیں۔"

کچھ دیر کے بعد طاہرہ بیگم اٹھیں اور انہوں نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... میں کیا کفرانِ نعمت کرنے بیٹھ گیا۔ تمہیں سمجھاتے سمجھاتے خود......" وہ پانی ان کے ہاتھ سے لے کر پیتے ہوئے بولے۔

"یہی ہمارے دکھ سکھ کی سانجھ ہے۔ مل کر خوش ہوتے ہیں تو پھر رو کیسے تنہا سکتے ہیں۔"

انہوں نے اپنی نم آنکھیں صاف کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بھی مسکرا دیئے۔

"دادا جان...... دادا جان......"

اتنے میں انہیں زید کی آواز باہر ہی سے سنائی دی اور ساتھ ہی وہ کمرے میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دے دیا۔

"دادا جان ڈیئر! باہر چلیں ذرا وہ کیٹرنگ والے بلا رہے ہیں۔" اس نے اپنے دادا جان کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میاں پوتے...... میں انہی کے بلاوے کا منتظر تھا چلو۔"

وہ طاہرہ بیگم کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے چل دیئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

"دیکھا بیگم آپ کے لاڈلے عمیس میاں کے کھلے ہاتھ کے خرچے؟ کہ بے چارے کیٹرنگ والے بھی زچ ہو چکے ہیں۔"

"واقعی...... یہ عمیس بھی ناں؟ خدا جانے اتنا کنجوس کیوں ہے؟" وہ بھی یہ سوچتی ہوئی

باہر آ گئیں۔



عمیس جیلانی کی پھر ایک نہ چلی۔ نور صاحب نے کیٹرنگ والوں کو وہی کچھ بنانے کا کہا جس کی تیاری کر کے وہ آئے تھے جس کا آرڈر نہیں دیا گیا۔ لہٰذا تھوڑی ہی دیر کے بعد جیلانی ولاز کے بڑے لان میں باربی کیو کی خوشبو نے سب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد جیلانی صاحب کا سارا خانوادہ لان میں بچھی کرسیوں پر براجمان تھا۔ جنہیں گرما گرم سیخ کباب پیش کیے جا رہے تھے۔ پوریاں اور آلو چنے کی بھاجی۔ سیخوں کی ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آوازیں۔ برتنوں کی آوازیں۔ باتوں اور ہنسی کی آوازیں غرض مختلف آوازوں نے مل کر اک سماں باندھ دیا تھا۔ خوشی کا سماں مل بیٹھ کر ہنس بولنے کا سماں...... سبھی خوش تھے...... بے حد خوش تھے۔

جیلانی صاحب اور بیگم جیلانی اپنے بچوں اور ان کے بچوں کو ہنستا بولتا دیکھ کر خوش تھے۔ خوش تو عمیس میاں بھی تھے مگر وہ اپنی اس عادت کا کیا کرتے جس میں بنئے کا عکس شامل تھا۔ وہ بظاہر سب کے ساتھ ہنس بول تو رہے تھے مگر جی ہی جی میں حساب کتاب بھی کر رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے کہ کتنے کباب اور تکے بن رہے ہیں۔ کتنی پوریاں تلی جا رہی ہیں اور کون ان پر کتنا ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ انہیں اب بھی قورمے اور بریانی کے نہ بننے کا قلق تھا جس کا ذمہ دار وہ سراسر زید کو ہی گردان رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زید ہی نے جیلانی صاحب کو بلا کر پھر سے ان کے مینو کی جگہ اپنی پسند کا مینو رکھ دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر دانت کچکچا رہے تھے۔ اس کا ہنسنا بولنا انہیں اس وقت ذرا نہ بھا رہا تھا۔

"زید بیٹے ذرا اِدھر آؤ۔" ترنم نے اسے قریب سے گزرتے دیکھ کر آہستہ سے بلایا۔

"جی چچی جان......" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"یہ زائرہ دکھائی نہیں دے رہی کہیں؟" وہ نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتیں پوچھ رہی تھیں۔

"جی! آپ صحیح کہہ رہی ہیں مجھے بھی کہیں نظر نہیں آ رہی۔" وہ ان کی تائید میں پورے لان پر نظریں دوڑاتا ہوا بولا۔

"یہ لڑکی بھی ناں...... خدا جانے کن کاموں میں الجھی رہتی ہے سارا گھر جمع ہے۔ کھانا کھا رہا ہے اور یہ غائب ہے۔ حالانکہ آج اسے میزبانی کرنی چاہیے تھی مگر مجال ہے یہ کسی ذمہ داری کو محسوس کرے۔" وہ اپنی بیٹی کی عادات پر کڑھتی ہوئی بولیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سب کو پوچھ بھی رہی تھیں۔

"سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

"کچھ چاہیے تو نہیں؟"

"شبانہ تم نے بہت کم لیا ہے اور لے لو ناں۔"

"بی بی جان لائیں میں آپ کے لیے گرم گرم پوریاں اور لے کر آؤں۔" وہ ان کے قریب سے گزرتی ہوئیں ادب سے جھک کر بولیں۔

"جیتی رہو میری جان! میں نے بس کھالیا۔ اللہ تمہارے رزق میں فراخی دے۔ بہت مزے کا کھانا تھا۔" بی بی جان نے فوراً دعا دی، اور وہ "آمین" کہہ کر آگے چل دیں۔

"چچی جان! میرا خیال ہے وہ تارہ آپی کے کمرے میں ان کے پاس ہوگی۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔" زید کو اچانک خیال آیا۔

"لو بھلا...... مجھے خیال تو آیا ہی نہیں وہ واقعی وہیں ہوگی۔" ترنم نے کچھ یاد آنے پر اپنے سر پر ہلکے سے اپنا ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

"رکو......" انہوں نے زید کو جاتے دیکھ کر دوبارہ آواز دی۔

"جی چچی جان......" وہ پھر پلٹ آیا۔

"تم ستارہ کے لیے کھانا لے جاؤ اور ہاں بیٹھ کر اسے اپنے سامنے کھلا دینا ورنہ وہ کھائے گی نہیں اور زائرہ کو یہاں بھیج دو۔" انہوں نے ایک ٹرے میں ساری چیزیں سجا کر زید کو دیں۔

وہ کھانا لے کر ستارہ کے کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ زائرہ وہاں بھی نہیں تھی۔ ستارہ نماز پڑھ رہی تھی اور اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پہلے سے ہی کھانے کے برتن پڑے تھے جس کا مطلب تھا ستارہ کو کسی نے پہلے سے ہی کھانا کھلا دیا تھا۔

"کس نے؟"

"اور اگر زائرہ نے اس کے ساتھ کھانا کھایا تھا تو وہ اب کہاں تھی؟" اک سوال تجسس بن کر اس کے دماغ میں گڑھ گیا۔ وہ تیزی سے واپس مڑا۔ لان میں آیا۔ اِدھر اُدھر اسے دیکھا۔ مگر وہ کہیں نہ تھی۔ جس پر اسے زیادہ پریشانی ہوگئی پھر وہ اس کے کمرے کی طرف چل دیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوگی تو اسے بلا لائے گا کہ چچی جان بلا رہی ہیں وہ ابھی برآمدے میں ہی تھا جب اس نے دیکھا وہ کھڑکی میں کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ بلا ارادہ ہی پچھلی طرف سے جا کر کھڑکی کے قریب جا کر چھپ گیا۔

"نومی! تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو۔" وہ فون پر کسی کے ساتھ بحث کر رہی تھی۔

"کل میری کزن کی شادی ہے اور میں کسی بھی صورت گھر سے نہیں نکل سکتی۔"

"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔"

"میں...... میں نہیں آسکتی۔"

"تم میرے دادا جان کو نہیں جانتے اور میرے ابو...... اگر انہیں خبر ہوگئی تو۔"

"بیکار کی باتیں مت کرو نومی! میں نے کہا ناں کل نہیں۔" وہ کسی سے الجھ رہی تھی۔

"ہوٹل میں...... تمہارا دماغ خراب ہے ہرگز بھی نہیں۔ میں کبھی بھی تمہاری یہ بات نہیں مان سکتی۔"

"اوکے...... تمہاری مرضی...... ہو جاؤ خفا۔" پھر شاید اس نے غصے میں آ کر فون بند کر دیا تھا کچھ لمحے تو اس کا سایہ زید کو کھڑکی کے پاس نظر آیا پھر وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ مگر زید اپنے سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ وہیں پر جم کر رہ گیا تھا۔ اس کا دھک دھک کرتا دل برف ہو کر اس کے سینے میں ساکت تھا اور اپنے ٹھنڈے ہاتھ پیروں کے ساتھ کھڑا وہ بس خود کو جھٹلا رہا تھا۔

"نہیں...... یہ سب جو میں نے سنا ہے وہ غلط ہے۔ زائرہ جتنی بھی نک چڑھی اور بد مزاج ہو۔ مغرور اور آدم بے زار ہو مگر ایسی نہیں ہو سکتی۔ جیلانی خاندان کی بیٹی اور...... نہیں نہیں۔ میں نے جو سنا وہ نہیں سنا۔" وہ خود اپنے حواسوں کو جھٹلاتا رہا اور زمین آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتے رہے۔



وہ ستارہ کو تیار کروانے کے لیے "بیوٹی پارلر" لے کر آیا ہوا تھا آج سالار اس کے ساتھ نہیں تھا نہ ہی ہدیٰ اور عیون تھیں۔ ردا اور زائرہ ستارہ کے ساتھ تھیں آج وہ راستے بھر میں زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ وہ کیا بلکہ یہ تینوں لڑکیاں بھی خاموش تھیں۔ ردا تو طبعاً ذرا کم گو ہی تھی اور زائرہ کی ویسے ہی اس کے ساتھ بنتی نہ تھی۔ ستارہ! ستارہ تو پچھلے دو تین روز سے بے حد اداس اور خاموش تھی۔ ان دنوں میں لڑکیاں قدرتی طور پر ایسی ہی ہو جاتی ہیں بے حد چپ اور اداس۔ بابل کا گھر چھوڑنا واقعی کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان دنوں میں بات بے بات وہ چھپ چھپ کر اور کبھی اعلانیہ آنسو بہایا کرتی ہیں اور ان کی آنکھیں متورم اور گلابی ہی رہتی ہیں۔ ستارہ بھی رات بھر روتی رہی تھی۔ اگرچہ وہ کسی کے سامنے نہیں روئی تھی مگر اس کی آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ رات بھر نہ نیند اسے آئی ہے نہ چین...... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ابو کو یاد کر کے روتی رہی تھی۔ حالانکہ اسے اپنے ابو سے کوئی خاص محبت نہ تھی!

اس نے تو اسے دیکھا بھی بچپن میں ہی کبھی کبھار تھا مگر اب وہ اسے یاد آ رہا ہے اور دل اس کی محبت سے یک دم ہی لبالب بھر گیا تھا اتنا کہ چھلک چھلک کے آنکھوں کے کناروں سے بہے جا رہا تھا...... اور اس کے لبوں سے دبی دبی سسکیوں کے ساتھ ابو...... ابو نکل رہا تھا۔ رات بڑی شدت سے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش صبح اس کے ابو جان آ جائیں اور اسے رخصت کریں۔

انیس ماموں اور عمیس ماموں کی بے پایاں محبتوں کے باوجود رات سے اسے بڑی تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک خالی پن کا احساس اس کے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ اک خلا سا بن گیا تھا روح کے بیچوں بیچ جس کی طلب صرف اور صرف اس کے ابو کا پیار تھا۔ بھلے وہ آ کر کچھ اظہارِ محبت نہ کرتے۔ منہ سے کچھ نہ بولتے لیکن ایک بار۔ ایک بار وہ ان کے گلے سے لگ جاتی اور ایک بار۔ فقط ایک ہی بار وہ اس کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھ دیتے تو اس کی بیتی ہوئی تمام عمر کی محرومیاں دور ہو جاتیں۔ پتہ نہیں کیوں اس کا جی مچلا جا رہا تھا اور نگاہیں لپک لپک کر گھر کی دہلیز کو چھوتی تھیں کہ وہ آ جائیں اور ایک جھلک وہ اپنے ابو کی دیکھ لے۔

"تارہ آپی! گنے کا رس پئیں گی۔" زید نے راستے میں ایک طرف کو گاڑی روکتے ہوئے کہا جہاں برگد کے ایک گھنے اور بوڑھے درخت تلے مختلف ریڑھیوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ جن میں چاول چھولے...... دہی بھلے، گول گپے، مکئی کے بھٹے اور مختلف مشروبات والوں کے ساتھ ہی گنے کے رس والے کی یہ ریڑھی بھی بڑی پرانی تھی جس کے زید جیسے بے شمار مستقل گاہک تھے۔

"نہیں زید آج میرا جی نہیں چاہ رہا۔" ستارہ جو ہمیشہ ہی زید کی بات مان کر یہاں سے گنے کا رس بڑے شوق سے پیا کرتی تھی جب بھی آتی تھی۔ آج اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا دل واقعی کسی چیز کی طرف مائل نہ تھا۔

"پی لیں...... پی لیں...... پھر میک اپ کے بعد تو آپ کے کھانے پینے پر پابندی لگ جائے گی۔" وہ شرارت سے بولا۔ اتنے میں ریڑھی والے کا "چھوٹا" لپک کر اس کی طرف آ چکا تھا۔

"سلام صاحب! کتنے گلاس لاؤں؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"وعلیکم السلام! یار چھوٹے کیسے ہو تم؟" وہ مسکرا کر اس کا حال چال دریافت کرنے لگا۔ "گلاس؟ گلاس؟" وہ ردا اور زائرہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ جس پر زائرہ نے تو حسبِ عادت "ہونہہ" کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا البتہ ردا نے ہلکی سی مسکراہٹ

کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

"تین گلاس لیموں نچوڑ کے فٹافٹ اور ٹھنڈا ٹھار۔" وہ چھوٹے کے ہی انداز میں جوش سے بولا تو چھوٹا ہنستا ہوا تیزی سے بھاگ گیا دور سے ہی چلاتا ہوا۔ "استاد تین گلاس فٹافٹ۔"



اسے بیوٹی پارلر کے باہر کھڑے چند ہی منٹ ہوئے تھے جب زائرہ واپس آئی اور اس کے پاس آ کر بولی۔

"تم جاؤ ابھی خاصی دیر لگے گی۔ جب ستارہ آپی تیار ہو جائیں گی تو میں موبائل پر تمہیں بتا دوں گی آ جانا۔" پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ تیزی سے واپس چلی بھی گئی اور وہ سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا کہے۔

"یار! یہ آج کل کی لڑکیوں کے بھی عجیب ہی فنڈے ہوتے ہیں "بیوٹی پارلر" شاپنگ سینٹر اور ہوٹلنگ۔ شوفر بنا کر رکھ دیتی ہیں اچھے بھلے مردوں کو۔" وہ خاصا جھنجھلا کر بڑبڑایا۔

"ہوٹلنگ سے ہوٹل۔" اس کا دماغ چونکا اور پھر زائرہ کا رات والا پورا جملہ اس کے کانوں میں گونجا۔

"ہوٹل" "نہیں ہوٹل نہیں آؤں گی میں۔ بھلا یہ کیا ضد ہوئی ہرگز نہیں۔" اور اس کے حواسوں میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"نہیں...... نہیں میں نہیں جاؤں گا واپس...... یہیں رہوں گا چاہے کتنی بھی دیر لگ جائے۔" وہ گاڑی کو سٹارٹ کرتے کرتے رک گیا اور کچھ سوچنے لگا پھر اس نے گاڑی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا پرے لگا دیا اور اپنی نظریں اس بیوٹی پارلر کے مین دروازے کی طرف لگا کر انتظار کرنے لگا۔ جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ باہر آئے گی۔ اس کی چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کے ہونے کا الارم بھی بجا دیا تھا۔

افسوس، پریشانی اور غیرت کے مارے اس کا بُرا حال تھا اس کے دل و دماغ غصے سے کھول رہے تھے۔ وہ سوچتا تو اس کے بدن کا سارا لہو آنکھوں میں اتر آتا۔

"یہ زائرہ اچھا نہیں کر رہی اگر آج میرا کوئی بھی خدشہ سچ ثابت ہوا تو میں...... میں اس کی جان لے لوں گا۔"

وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اپنے خاندان کا وقار یوں خاک میں نہیں ملا سکتی۔ ترنم چچی (جو اس کی خالہ بھی تھیں)

ان کی تربیت...... ان کا دودھ اتنا خراب تو نہیں ہو سکتا اور پھر جیلانیوں کا لہو...... شرم و حیاء اور غیرت جس کا امتیاز تھا۔ زائرہ اس پر اپنی بے شرم محبت کی سیاہی نہیں مل سکتی۔ وہ اپنے خیالات کی بار بار تردید کر رہا ہے اور خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زائرہ ایسی حرکت نہیں کرے گی۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر وہ باہر نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ہر منٹ کے بعد بیوٹی پارلر میں کوئی داخل ہو رہی تھی تو کوئی نکل رہی تھی۔

وہ تھکنے لگا تھا ایک ہی طرف گھور گھور کر اس نے سوچا کہ وہ ذرا گاڑی سے باہر نکل کر تازہ ہوا ہی لے لے۔ کچھ کھا پی ہی لے۔ ایک تو اسے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانے کی عادت تھی کوئی چپس...... نمکو...... کولڈ ڈرنک یا چائے کچھ بھی...... وہ گاڑی سے باہر آ کر سوچ ہی رہا تھا کہ کیا لے۔ جب اسی روز والی سیاہ ٹیوٹا عین بیوٹی پارلر کے سامنے رک گئی اور وہ بجلی کی سی تیزی سے پارلر سے نکل کر اس گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا یا سمجھتا گاڑی اک فراٹے سے آگے بڑھ گئی۔

''اوہ میرے اللہ...... یہ...... یہ میں نے کیا دیکھا۔ یہ اس بدتمیز لڑکی نے کیا کیا؟'' اس کے سر سے پاؤں تک میں اک سنسنی سی دوڑ گئی اور اسے زائرہ کے وجود سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ وہ بھی اتنی ہی تیزی سے گاڑی میں دوبارہ بیٹھ کر اس کار کے پیچھے گیا تھا مگر چند لمحوں میں صرف چند لمحوں میں وہ سیاہ کار اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایم ایم عالم روڈ کا چوراہا اور ٹریفک سگنل کا بند ہونا۔ چاروں جانب ٹریفک کا اژدھام تھا۔ جو یک دم رک گیا تھا ہارن کی آوازیں بھی اگرچہ لمحہ بھر کو آنا بند ہو گئی تھیں۔

مگر اس کے اندر کا شور اور اس کے حواس پر بجتے ہارن...... کہ چلو...... چلو رکو مت......
وہ سگنل بھی توڑ دیتا مگر کیا کرتا اس کے آگے پیچھے کاریں ہی کاریں تھیں اور بیچ میں اس کی بے بسی تھی جو اس کی جان پر عذاب بن گئی۔ اس نے بڑی ہی عاجزی اور بے چارگی سے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

''یا اللہ! ہماری عزت اور اس کی عصمت کی حفاظت کرنا۔'' ایک دعا اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی اور آنکھ میں پانی بن کر تیرنے لگی۔
سگنل کھلا اور اس نے اپنی گاڑی کے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی کار کو اپنی سوچ کے پروں پر اُڑا کر لے جاتا۔
''اللہ پاک...... وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ اسے میری نظروں کے سامنے لا دے۔''

''خدایا! میری مدد فرما۔'' اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کس سمت کو گاڑی موڑے۔ وہ کون سی سمت ہے جدھر وہ کالی کار مڑی ہے۔ ''میری راہنمائی فرما میرے راہ نما۔ میرے راہبر اللہ!'' اس کی آنکھوں میں تیرتا ہوا پانی اب اس کے گالوں پر بہہ رہا تھا اور وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''میں کیا کروں...... میں کیا کروں؟'' وہ بس بے اندازہ ہی آگے بڑھ رہا تھا پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ گھر اطلاع کر دے۔ گھر سے کسی کو بلا لے مگر کس کو؟ کس کو بتائے...... کس کو بلائے اور پھر کیا بتائے کہ...... اس کا دماغ اس ''کہ'' سے آگے سلگ گیا۔

''زائرہ......'' اس نے بے بسی سے اپنا مکہ اسٹیئرنگ پر دے مارا۔ ''تمہاری تو میں جان لے لوں گا۔ مجھے تم آج مل جاؤ بس۔''

وہ پاگلوں کی طرح گاڑی کو سڑکوں پر دوڑا رہا تھا۔ اسے پورے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور یہ پندرہ منٹ اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔

''وہ کہاں ہو گی۔ کس کے ساتھ ہو گی اور...... اور......'' اس کے دل و دماغ پھر سے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس نے گاڑی کا رخ اس روڈ کی طرف کیا ہی تھا جہاں بہت سے ''گیسٹ ہاؤس'' تھے۔

''کیا وہ لوگ کسی گیسٹ ہاؤس میں ہوں گے؟'' اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے جسم کی نس نس میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ کیونکہ جس طرف وہ مڑ رہا تھا وہاں پر موجود کئی لگژری ''گیسٹ ہاؤس'' اپنی بُری شہرت کی وجہ سے اکثر اخبارات میں بھی زیرِ موضوع رہتے تھے۔ جہاں اونچے طبقے کے بگڑے ہوئے سپوت اور امراء و وزراء اکثر اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ ریلیکس (Relax) کرنے آتے تھے۔ اگر یہاں وہ کالی کار اسے نظر آ گئی تو۔ ''میں دونوں کو فوری طور پر شوٹ کر دوں گا۔'' اس نے گاڑی کو تیسرے گیئر سے دوسرے گیئر میں ڈالتے ہوئے سوچا۔ وہ ذرا احتیاط کے ساتھ ان ''گیسٹ ہاؤسز'' کے کھلے گیٹوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔

''ایکسیوز می باس! یو ہیو اے ٹیکسٹ میسج۔''

"Excuse me boss! you have a text message"

اس کے موبائل پر موصول ہونے والے کسی میسج نے اسے پکارنا شروع کر دیا۔
''زائرہ......'' اس نے موبائل فون کی سکرین پر زائرہ کا نمبر جلتا بجھتا دیکھا تو بجلی کی سی تیزی سے گاڑی کو بریک لگا کر Message کا Inbox کھولا۔

"تم کہاں غائب ہو گئے ہو۔ستارہ آپی تیار ہیں اور ہمیں دیر ہو گئی ہے کبھی تو ذمہ داری کا ثبوت دیا کرو۔اب گھر آ جانا ہم یوسف پھوپھا کے ساتھ گھر جا رہے ہیں۔"

"گھر جا رہے ہیں...... کیا مطلب......" اس نے گاڑی کے اسٹیئرنگ پر اپنا مکہ پھر سے مارا۔"یہ...... یہ لڑکی...... یہ مجھے پاگل بنا رہی ہے...... دھوکے باز...... مجھے غیر ذمہ دار کہہ رہی ہے۔" اپنی تضحیک کے شدید احساس سے وہ سچ مچ پاگل ہو رہا تھا۔

"میں ابھی گھر جا کر چچا جان کو اس کے سارے کرتوت بتاتا ہوں۔" اس نے غصے سے گاڑی کو موڑا اور سیدھا چوتھے گیئر میں اڑا لے گیا۔گاڑی کے ٹائر چرچرانے کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز بھی آئی۔

❖......O......❖

وہ گھر آیا تو ہر ایک کا منہ اس کی طرف سے سوجا ہوا تھا۔وہ تیزی سے اپنی دادی کی طرف بڑھا جو اسے ستارہ آپی کے کمرے کی طرف جاتی دکھائی دی تھیں۔

"دادی جان! وہ میں......" اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر انہوں نے ایک برہم سی نظر اس پر ڈال کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"میری بات تو سنیں......" وہ پھر بھی سامنے آ گیا اور انہیں کندھوں سے تھام کے کھڑا ہو گیا۔

"چھوڑ مجھے...... مجھے اس وقت تیری کوئی بات نہیں سننی۔تیری لاپروائیاں اس حد تک بڑھ جائیں گی میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔"

وہ خاصی خفگی سے بولیں۔"دادی جان! میں...... میں تو۔"

"کہا ناں چپ کرو...... بعد میں بات کریں گے۔" انہوں نے اس کی بات سننے سے انکار کرتے ہوئے کہا اور کمرے میں چلی گئیں۔

"ترنم خالہ!" سامنے سے آتیں ترنم کو دیکھ کر وہ ان کی طرف بڑھا۔

"کہاں رہ گئے تھے تم...... پتہ ہے کتنی پریشانی ہوئی۔" وہ بھی اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"خالہ! مجھے آپ سے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے۔" وہ انہیں اصل بات بتانے کو بے تاب تھا۔

"اف تمہاری ضروری باتیں۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنا دایاں ہاتھ ماتھے پر مارتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"یہ وقت تمہاری ضروری باتوں سے زیادہ ضروری اور اہم باتوں کا ہے۔" وہ بھی اس

کی بات سنے بغیر ستارہ کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

سالار بھاگا ہوا آیا اور وہ بھی وہیں چلا گیا۔کوریڈور میں پریشان کھڑا ہوا زید کچھ نہ سمجھتے ہوئے رونے والا ہو گیا۔اس کا جی چاہا کہ وہ اس وقت واقعی کہیں بھاگ جائے یا پھر اپنے کمرے میں چھپ جائے اور خوب روئے۔کس قدر بے بسی کا عالم تھا اس پر اور کوئی اس کی بات سننے کو تیار بھی نہ تھا بلکہ سب اسی کو لعن طعن کر رہے تھے۔وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"زید...... زید......"

یہ اس کی پیاری ماں کی آواز تھی جس نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔وہ انہی قدموں پر گھوم گیا۔

"جی امی جان!"

"کہاں رہ گئے تھے بیٹا؟" انہوں نے پاس آ کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"پتہ ہے کتنی پریشانی ہوئی۔آخر تمہارے یوسف پھوپھا کو پارلر جانا پڑا۔" وہ اگرچہ خفا تھیں مگر ان کے انداز میں برہمی سے زیادہ فکر مندی تھی اور لہجہ کورا ہونے کی بجائے محبت سے بھیگا ہوا ہی تھا۔اس نے چاہا کہ ماں کو سب بتا دے لیکن اس وقت مناسب نہ تھا وہ چپ ہی رہ گیا۔

"سوری امی جان...... دراصل میں گاڑی میں سی این جی بھروانے گیا تو گاڑی اچانک ہی خراب ہو گئی۔" اسے فوری طور پر یہی بہانہ سمجھ آیا۔

"اچھا...... اچھا...... پر تمہیں چاہیے تھا کہ تم فون کر دیتے تاکہ یہاں پریشانی تو نہ ہوتی؟" وہ اب پیار سے اس کے گالوں کو چھوتی ہوئی بولیں۔

"جی وہ میں......"

"اچھا اب جلدی کرو۔تیار ہو کر آ جاؤ۔کھانا شروع ہونے والا ہے۔" انہوں نے اسے نصیحت کی اور وہ بھی ستارہ کے کمرے میں چلی گئیں۔

"امی جان! آپا کا نکاح ہو گیا۔" وہ اسی طرح ان کے پیچھے چلا آیا۔

"ہاں ابھی ابھی ہوا ہے وہ اپنے کمرے میں ہے۔تم جاؤ تیار ہو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے تمہیں! کیا اسی طرح پنڈال میں جاؤ گے؟" وہ دروازے میں روک کر اسے سمجھانے لگیں۔

"میں ذرا آپا سے مل لوں۔" وہ ستارہ سے ملنے کو بے تاب تھا۔اسے پتہ تھا وہ بھی اس سے بے حد خفا ہوں گی کہ وہ نکاح کے وقت بھی غائب تھا۔

"ابھی سب لوگ اندر ہیں تم جاؤ جا کر تیار ہو کر آؤ۔" اس بار تکلم ذرا سختی سے بولیں تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی تیار ہونے کو چل دیا۔



وہ تیار ہو کر باہر پنڈال میں پہنچا تو واقعی کھانا شروع ہو چکا تھا۔

"زید......" سالار نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔

"کہاں ہو یار؟ ادھر آ کر مہمانوں کو دیکھو۔" اس نے ذرا قریب آ کر کہا۔

"ہاں...... ہاں...... میں اسی لیے آیا تھا۔" وہ جھٹ اس کے ساتھ مل کر مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگ گیا پھر عادل نے اسے دیکھا تو اس نے بھی یہی پوچھا۔

"بھئی کہاں رہ گئے تھے۔ خیر تو تھی؟"

"ہاں...... ہاں وہ بس میں سی این جی بھروانے گیا تو گاڑی کی بیٹری اچانک ہی ڈاؤن ہو گئی۔ بس مکینک کو ڈھونڈنے میں دیر لگ گئی۔" اس نے وہی بہانہ کیا جو اپنی امی جان سے کیا تھا۔

"تو کم از کم فون ہی کر دیتے۔" سالار نے کہا۔

"فون...... ہاں فون...... وہ میں نے سوچا کہ ابھی گاڑی ٹھیک ہو جائے گی گھر والوں کو کیا پریشان کروں۔" وہ بے چارا جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

"تم نے تو اچھا ہی سوچا ہو گا مگر افسوس کہ برا ہو گیا پتہ ہے تمہیں؟ نانا جان تم سے سخت خفا ہیں۔" عادل اسے سارے حالات بتا رہا تھا۔

"دادا جان......" وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

"ہاں...... وہ بے حد غصہ کر رہے تھے۔" سالار کو بھی زید سے بڑی ہمدردی ہو رہی تھی۔

"تو اور کیا کرتے اس زائرہ کی بچی نے انہیں فون کر کے زید کی شکایت جو لگا دی تھی۔" عادل نے بھولپن سے بتا دیا۔

"کیا...... کیا زائرہ نے میری شکایت لگائی تھی؟" زید کا خون پھر غصے سے کھول اٹھا۔

"کیا کہا تھا اس زائرہ نے؟" وہ سننا چاہتا تھا کہ زائرہ نے دادا جان کو اس کے خلاف کیا کہا تھا۔

"اور تو مجھے پتہ نہیں ابو بتا رہے تھے نانا جان کہہ رہے تھے۔" "آنے دو آج اس لڑکے کو...... اس کی خبر تو میں لوں گا۔ میں نے ہی اسے سر پر چڑھا لیا ہے وہاں بچیاں سخت پریشان ہیں اور یہ خدا جانے کیا مستیاں کرتا پھر رہا ہے لاپروا...... نالائق...... نا ہنجار......" اور...... اور

وہ تم پر بہت غصہ ہو رہے تھے۔" عادل نے ساری بات حرف بہ حرف اس کے گوش گزار دی جو اس نے اپنے ابو جان کے منہ سے سنی تھی۔

"اچھا میں دادا جان کو خود ہی جا کر سب بتا دیتا ہوں۔" وہ جذباتی ہو کر ایک دم سے آگے بڑھا۔

"زید بھائی! رہنے دیں اس وقت کوئی بات نہ کریں۔ بس چپ چاپ کام میں لگے رہیں۔" سالار نے فٹ اس کا بازو تھام کر اسے روک لیا۔

"اور نہیں تو کیا بعد میں نانا جان خود ہی بھول جائیں گے ان کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

عادل نے بھی اسے سمجھایا۔ وہ ان کے کہنے پر رک گیا۔ کام بھی کرتا رہا۔ ایک ایک مہمان کو آگے بڑھ کر پوچھتا رہا۔ یکتا رہا کہ کسی چیز کی کمی نہ ہو کہ آج وہ دولہا کا بھائی ہونے کے باوجود اپنی ستارہ آپی کا بھائی تھا اور اسی کے فرائض ادا کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"ستارہ آپی...... کیسی لگ رہی ہوں گی۔" وہ ستارہ کو دیکھنے کے لیے چل دیا۔

"زید بھائی...... اب کہاں جا رہے ہیں۔" سالار نے اسے پنڈال سے باہر جاتے دیکھ کر پھر پوچھا۔

"بس ابھی آیا...... دو منٹ...... صرف دو منٹ۔" وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے خواتین والے پنڈال کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں ستارہ اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی تھی اس نے دور سے ہی دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہونے کے باوجود بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔

"اللہ میاں میری آپا کو کسی کی نظر نہ لگے۔" وہ دل ہی دل میں اس کی بلائیں اتارتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ہی اچانک وہ کسی طرف سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

"اوئے ڈفر! کہاں غائب ہو گئے تھے۔ تمہیں اتنا بھی خیال نہیں رہتا کہ تمہاری لاپروائی کسی کے لیے انتہائی پریشانی اور آزار کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔" وہ نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی سے بھرے پنڈال میں اسے "کچا" کر رہی تھی۔

"میں......؟" اس نے جیسے ہی کچھ کہنے کو منہ کھولا وہ پھر طنز سے بولی۔

"جی ہاں...... آپ اور کون؟ کیسے کیسے کیا مہم درپیش تھی۔ کون سی افتاد آن پڑی تھی۔" وہ ہاتھ نچا نچا کر یوں پوچھ رہی تھی جیسے وہ واقعی ہر بات سے بے خبر ہو۔

اس کے انداز دیکھ کر اس کا جی تو چاہا کہ وہ بھی سب کے سامنے اس کی اس شرافت کا بھانڈا پھوڑ دے۔ مگر وہ کسی کے ہاتھ کو اپنے کندھے پر دباتا محسوس کر کے چپ ہو گیا۔ دیکھا تو

وہ اس کی امی تھیں جن کی نظروں میں اس وقت چپ رہنے کا اشارہ تھا۔ کچھ نہ کہنے کی تنبیہ تھی۔ اس نے اپنے سامنے کھڑی زائرہ پر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی۔ بڑی گہری اور معنی خیز نظر جس کی کاٹ اگر وہ محسوس کرتی تو اس وقت اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکتی لیکن وہ تو سدا کی بے شرم اور خودسر تھی متواتر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہی۔

''کیا ہوا...... بولتی بند ہوگئی۔ کوئی بہانہ نہیں بن رہا؟'' وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتی ہوئی بولی۔

''بُری بات زائرہ...... ایسے پیش نہیں آتے۔ اپنے اردگرد کا خیال کرو۔'' ترنم بیگم نے اسے دھیرے سے گھرکا۔ جس پر وہ نہایت بدتمیزی سے ''ہونہہ'' کہتی ہوئی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

''جاؤ تم جاکر ستارہ کو سلام کرلو اور پھر جاکر مردانے میں بیٹھو۔'' وہ اسے ہولے سے سمجھاتی ہوئیں چند رشتہ دار خواتین کی طرف بڑھ گئیں۔ اس نے اسٹیج پر جاکر ہولے سے نہایت احترام سے اپنی آپا کو سلام کیا جس پر اس نے ایک بڑی ہی نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

شکر ہے وہاں...... ان کی آنکھوں میں کوئی گلہ نہ تھا۔ بلکہ محبت اور فکرمندی تھی جیسے پوچھ رہی ہوں۔ ''کیا ہوگیا تھا...... خیر تو تھی؟'' اس کا جی اس وقت بے اختیار چاہا کہ وہ ان کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لے اور وہ سارے آنسو بہا دے جو اس کے دل پر بوجھ بنے ہوئے تھے۔

''لیجیے ستارہ آپی آپ کے چہیتے اور لاڈلے زید صاحب آگئے ہیں جنہیں آپ بڑا اپنا بھائی...... کہتی ہیں۔ اس نے آج ہی ثابت کردیا کہ وہ آپ کا دیور ہی ہے۔ بڑا روایتی سا دیور......'' وہ پھر اس کے سر پر کھڑی دل جلا دینے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔

سیاہ شیفون کے سلور کامدار سوٹ میں بڑے ماڈرن انداز میں تیار ہوئی وہ بلاشبہ اس وقت بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ایک نظر سر سے پاؤں تک اسے گھورا۔ جس پر وہ ذرا گڑبڑا گئی۔ ''کک...... کیا ہے...... کیوں بُری نظر ڈال رہے ہو۔ لگ جائے گی۔''

''نہیں لگتی۔'' وہ اس کے قریب کھسک کر اس کے کان میں انتہائی سپاٹ لہجے میں بولا۔

''جن کے دل سیاہ ہوں۔ جن کے قدم سیاہیوں پر ہوں انہیں مجھ جیسوں کی نظریں نہیں لگتیں۔ البتہ یہ نظریں ان پر جمی ضرور رہتی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ اسے زید کے

ایسے تیکھے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔

''ہدیٰ، عیون، ردا...... آؤ بھئی جلدی سے ستارہ آپی کے ساتھ تصویریں بنوالیں۔ پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ جلدی کرو۔ دادا جان آجائیں گے تو کسی کو تصویر نہ بنوانے دیں گے۔'' وہ اپنی جھینپ مٹانے کو ان کی طرف لپکی جو پہلے ہی اسٹیج کی طرف آرہی تھیں۔



کچھ دیر بعد وہ لوگ مردانہ پنڈال سے کھانا وغیرہ کھلا کر فارغ ہوگئے یہاں تک کہ باہر کے بھی مہمان رخصت ہوگئے۔ ایسے میں وہ کئی بار دادا جان کے قریب آگیا اس نے بہانے بہانے سے ان کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی۔ جس پر انہوں نے محض ''ہوں، ہاں'' ہی کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا مطلب تھا وہ سچ مچ اس سے بے حد خفا ہیں۔ اب وہ جلد از جلد ان سے معافی مانگنے کے لیے بے قرار تھا۔ جبھی دادی جان، عمیس چچا کے ساتھ وہاں آگئیں۔

''میاں صاحب! میرا خیال ہے بہت دیر ہوگئی ہے اب رخصتی ہونی چاہیے پہلے بچوں کو ان کے کمرے تک پہنچا دیں۔ پھر باقی کے کام ہوتے رہیں گے۔''

وہ اپنا سفید غرارہ سنبھالتی ہوئیں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئیں وہ چہرے سے ہی تھکی ہوئی اور اداس دکھائی دے رہی تھیں۔

''جی دادا جان! بی بی جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ باقی کے کام ہم کروالیں گے۔'' اس نے قریب کھڑے سالار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' نور محمد جیلانی نے ذرا طنز اور خفگی سے پوچھا۔

''دادا جان! میں اور یہ لوگ......'' اس نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ سالار اور عادل کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا یہ لوگ بھی...... ورنہ تم کسی کام کو تنہا کرنے کی اہلیت کب رکھتے ہو؟'' وہ کچھ اور طنز سے بولے تو اس کا جی ان کے انداز پر ڈوبنے لگا۔

''دادا جان پلیز مجھے معاف کریں۔ دراصل گاڑی کی بیٹری......'' اس نے آگے بڑھ کر معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ وجہ بتانی چاہی۔

''بس بس رہنے دو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔''

وہ اسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''آؤ طاہرہ! واقعی بہت دیر ہوگئی ہے۔'' وہ بی بی جان کا ہاتھ تھام کر انہیں کرسی سے اٹھاتے ہوئے بولے۔ وہ پھر شرمندہ ہوکر اپنے قدموں پر جم گیا اس کا دل پھر زائرہ کے

خلاف نفرت سے بھرنے لگا۔

''زائرہ! میں سب کو تمہارا اصل چہرہ دکھا کر رہوں گا۔'' وہ وہیں کرسی پر بے بس ہو کر ڈھے سا گیا۔



''زید بھائی! زید بھائی!'' عیون اسے آوازیں دیتی ہوئی وہاں آ گئی۔ سالار اور عادل بھی بی بی جان کے ساتھ اندر چلے گئے تھے ایک وہ تنہا ہی اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ یا پھر کیٹرنگ والے اِدھر اُدھر اپنے سامان کی سمیٹا سمائی کرتے پھر رہے تھے۔

''زید بھائی!'' عیون نے اس کے کندھے کو ہلکے سے ہلاتے ہوئے پھر پکارا۔

''ہوں...... ہاں......'' وہ اپنے خیالات سے چونکا تو وہ بے حد معصومیت سے مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

نیوی بلیو سوٹ میں بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے اپنے شانوں پر ڈالے ہلکے ہلکے میک اَپ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ جو اسے ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جسے دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں جلترنگ سے بج اٹھتے تھے اور دھڑکنیں بے ساختہ ہتھیلیاں بن کر دعا کے لیے پھیل جایا کرتی تھیں۔

''خدایا! اگر تجھے میری کوئی ادا بھاتی ہے تو اس کو میرا کر دینا۔''

''زید بھائی......'' اس کے گلاب سی پنکھڑی جیسے لب پھر ہلے۔

''آپ کو ستارہ آپی بلا رہی ہیں۔'' پھر اس نے خود ہی اپنی آمد کی وجہ بیان کر دی۔

''ستارہ آپی مجھے؟'' وہ چونک کر اٹھا اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''اوہ...... مجھے یہاں تنہا بیٹھے ایک گھنٹہ ہو گیا اور کسی نے میری خبر تک نہیں لی۔'' وہ اداسی سے اٹھا۔

''کہاں ہیں وہ...... کیا رخصتی ہو گئی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کے ساتھ چلا آیا۔

''جی وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔ وہیں پر باقی سب بھی ہیں سلامیاں دے رہے ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بتا رہی تھی۔ بڑے ہی ہولے اور نرم لہجے میں۔ ٹھہر ٹھہر کر بولتی۔ خوشی ہوتی یا غم اس کا یہی انداز ہوا کرتا تھا۔ سب سے جدا سب سے منفرد انداز تکلم رکھنے والی عیون۔ اپنی باقی عادات میں بھی بے حد اچھی تھی۔ اسی لیے سب اسے پیار کرتے تھے۔ اس نے پھر نادانستہ ایک نظر اس پر ڈالی۔

''آپ کیوں یہاں اکیلے بیٹھے تھے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے ہر وقت

شرارتیں کرتے اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آنے والے زید کو یوں تنہا اور گم صم دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ پریشان ہونے کے باوجود مسکرانے لگا۔

''اچھا تو پھر آپ اداس ہوں گے۔ ستارہ آپی کی شادی جو ہو گئی وہ آپ کی بہن جو ہیں۔ بھائی تو ایسے ہی اداس ہوتے ہیں۔ ہیں ناں؟'' وہ بڑے ہی بھولپن سے پوچھ رہی تھی جس پر زید کی مسکراہٹ گہری اور دل پر چھائی پریشانی کافی حد تک چھٹ گئی۔ اس کے دل سے پھر سرگوشی ابھری۔

''یارب! اسے میرا کر دینا۔''



''کبھی تو وقت پر پہنچ جایا کرو۔'' عمیس چچا نے اسے دیکھتے ہی جھاڑ پلانا شروع کر دی۔

''جی وہ میں...... میں پنڈال میں ہی تھا۔'' اس نے دبے دبے الفاظ میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

''میں نے یہ نہیں پوچھا کہ جناب کہاں تشریف رکھتے تھے۔ میں تو عرض کر رہا تھا کہ گھر والوں کو بات بات پر پریشان کرنا چھوڑ دیں۔ دیکھو اب تمہارے انتظار میں سب کھڑے ہیں فیملی فوٹو ہی نہیں بن رہا تھا۔''

انہوں نے بدستور طنز کرتے ہوئے کہا۔

''عمیس بس کرو۔ وہ پنڈال میں باقی کام سمیٹ رہا تھا۔ ہمیں بتایا تھا اس نے۔'' طاہرہ بیگم نے فٹ اپنے پوتے کی حمایت کی۔

''چلو میاں آگے بڑھو اور بھابی کو سلامی دو۔ پھر فیملی فوٹو بنے۔'' انیس جیلانی نے ماحول کو مکدر ہونے سے بچانے کے لیے اسے بازو سے تھام کر آگے کر دیا۔

''جی...... جی...... وہ میں گفٹ تو لے آؤں۔'' وہ پریشان ہو کر دوبارہ پلٹا کیونکہ اس کا گفٹ تو اس کی الماری میں ہی تھا۔

''اُفوہ...... ابھی مزید انتظار۔'' وہ کمرے کے دروازے سے نکل رہا تھا تبھی زائرہ کی تیکھی آواز نے اس کی کمر پر وار کیا۔

''بیٹا جلدی کرنا۔'' تکلم بیگم کی آواز فوراً ہی نرم پھاہے کی طرح اس کی زخمی پشت سے ٹکرائی۔

''جی امی جان بس دو منٹ۔'' وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے کمرے کی طرف گیا اور

واقعی دو منٹ میں واپس آ گیا۔

''السلام علیکم آپا۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھتا ہوا سلام کر رہا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کی بے حد دھیمی آواز صرف اسی کو سنائی دی باقی سب نے تو اس کا جھکا ہوا سر ہی ہلتا دیکھا تھا۔

''یہ...... یہ...... آپ کے لیے۔'' اس نے ایک چھوٹا سا مخملیں ڈبہ اس کی طرف بڑھایا جسے ستارہ کے حنائی ہاتھوں نے بڑی محبت سے تھام لیا۔ ''شکریہ۔'' اس نے اپنی جھکی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے اٹھائیں۔ جن میں اس کے لیے وہی محبت موجیں مار رہی تھی جو ایک بہن کی اپنے بھائی کے لیے ہوتی ہے۔

''کیا ہے۔ کھولیں اس میں کیا ہے؟'' ساری لڑکیوں نے ایک دم شور مچا دیا۔ ستارہ کچھ گھبرا رہی تھی۔ چاہتی تھی اس ڈبے کو سب کے سامنے نہ کھولے۔ وہ جو کچھ بھی تھا اسے ساری دنیا کے قیمتی تحفوں سے زیادہ عزیز تھا۔

''کھولیں ناں...... دکھائیں تو کیا ہے۔ دیکھیں آپ کے پیارے زید نے کیا دیا ہے۔'' سب سے زیادہ زائرہ ہی بول رہی تھی۔ ستارہ نے لرزتے ہاتھوں سے اس مخملیں ڈبے کو کھولا۔ ایک بے حد نفیس اور نازک سی ریسٹ واچ تھی جو کتنی قیمتی تھی وہ اس کی چمک دمک سے ہی پتہ چل رہا تھا۔

''واہ......'' ایک ساتھ ردا اور ہدیٰ کے منہ سے نکلا۔ "Its so beautiful" عیون نے بھی دھیمے لہجے میں بھرپور تعریف کی۔

''اوہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا...... ہم تو سمجھے تھے کوئی گولڈ کی چیز ہوگی۔ پر یہاں تو۔'' زائرہ نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

وہ کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا مگر جواد بھائی کی آواز نے اس کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ فوٹو گرافی کر رہے تھے اور کیمرہ تھامے ان سب کے اک آخری پوز کے لیے کھڑے تھے۔

''پلیز جنٹل مین...... ون فیملی فوٹو۔'' انہوں نے مخاطب تو زید کو کیا تھا مگر یہ درخواست سب سے تھی۔

''جلدی کرو بچو! تمہارے بڑے ابا آ گئے تو ساری فوٹو گرافی دھری کی دھری رہ جائے گی میں نے پہلے ہی بہت مشکل سے انہیں منایا تھا۔''

طاہرہ بیگم جو کافی دیر سے فوٹو گرافی اور سلامیوں کے اس سلسلے کو دیکھ رہی تھیں کرسی سے

اٹھتی ہوئی بولیں۔

''جی نانو...... آپ بھی آئیں ناں۔'' عیون نے آگے بڑھ کر محبت سے انہیں پکڑا اور آگے لے آئی۔

''ویسے دادا جان کے بغیر یہ فیملی فوٹو مکمل نہیں ہو رہا۔'' جواد نے کیمرے کے زوم کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''نہ وہ آئے نہ تمہاری یہ فوٹو بنی۔ رہنے ہی دو۔'' طاہرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زید کو بھیجیں ناں جا کر لے آئے۔ اس کی تو کوئی بات دادا جان نہیں ٹالتے۔''

''میں بلا کر لاتی ہوں ابا جان کو...... وہ میری بات بھی نہ ٹالیں گے۔'' انہوں نے زید پر بات آنے سے پہلے ہی سنبھالی اور خود انہیں بلانے چل دیں۔

''چلیں جی پھر گئے بیس پچیس منٹ۔'' لمحہ لمحہ گنتے ہوئے احمد حسن کی جان پر بن گئی۔

''یار یہ دنیا بدل گئی مگر ہمارے پاکستان کے رسم و رواج نہ بدلے۔''

وہ جواد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ اسے اس وقت یہ سب اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اس کی جانِ حیات اس کے سامنے ٹھیک اسی روپ میں موجود تھی جو وہ اکثر اپنے خیالوں اور خوابوں میں دیکھا کرتا تھا۔ مگر پورے کا پورا خاندان اس وقت ظالم سماج بنا ہوا تھا۔ شبانہ بیگم نے اپنے بھتیجے کی بے قراری کو محسوس کر لیا تھا۔

''چلو بھئی بچو اب بس کرو۔ باقی سب کل سہی۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر سب کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ترنم کے ساتھ ابا جان بھی کمرے میں داخل ہوئے تو سب جلدی سے سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''بھئی یہ کیا واہیات شوق ہیں آج کل کے بچوں کے۔'' خود وہ تصویریں بنوانے کے سخت مخالف تھے لیکن بچوں پر زیادہ سختی نہ کرتے تھے۔ اس وقت بھی ذرا بے دلی سے سب کے ساتھ کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ بھی ترنم خود جا کر بلا کر لائی تھیں ورنہ طاہرہ بیگم کو تو انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔

جیسے ہی سب ریڈی ہوئے اور جواد نے کلک کرنا چاہا نور محمد جیلانی کی آواز آئی۔ ''رکو ذرا......'' سب کے سانس تک رک گئے۔

''تم اِدھر آؤ ہمارے ساتھ۔'' کونے میں کھڑے زید کو بلاتے ہوئے انہوں نے ذرا کھسک کر اپنے ساتھ جگہ بنائی۔

''جی دادا جان......'' وہ لپک کر ساتھ آ کھڑا ہوا۔ جسے دیکھ کر جہاں ترنم بیگم اور عیون

کے چہروں پر سکون اور طمانیت کی چمک آ گئی وہیں پر زائرہ اور عمیس کے ماتھے کئی ناگوار لکیروں سے بھر گئے۔



ویسے کے روز سب کچھ نارمل ہو چکا تھا۔ نور محمد جیلانی کل والی بات پر رات کو ہی زید سے صفائی لے چکے تھے۔

"تو میری جان تجھے چاہیے تھا کہ تُو فون کر کے اپنے دادا جان کو اطلاع تو دے دیتا۔" طاہرہ بیگم اس کے بالوں کو پیار سے سہلاتی ہوئی بولی تھیں۔

"بس بی بی جان! مجھ سے یہی غلطی ہوگئی میرا موبائل چارج نہ تھا اور میں نے کسی پی سی او سے فون اس لیے نہ کیا کہ مجھے امید تھی میں جلد ہی پارلر پہنچ جاؤں گا۔" وہ ان کے گھٹنوں پر چہرہ جمائے بیٹھا تھا۔

"بہرحال آئندہ ایسی لاپروائی نہ ہو۔" دادا جان نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"جی ہرگز نہیں۔ میری توبہ۔" وہ کان پکڑ کر توبہ کرنے لگا جس پر وہ مسکرا دیئے۔

"پتہ ہے ہماری اس وقت حالت کیا تھی؟" وہ اسے کان سے گھسیٹ کر اپنے قریب کرتے ہوئے بولے۔

"جی میں جانتا ہوں۔" اس نے وارفتگی ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"یار! میرا دل اب چھوٹی چھوٹی پریشانیوں سے بھی ہل جاتا ہے۔ میری جان تو تم لوگوں میں ہے۔ مجھے ایسے جھٹکے نہ دیا کرو۔" انہوں نے پوتے کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے محبت سے کہا۔

"سوری......سوری دادا جان! سچ اب کبھی لاپروائی نہ کروں گا۔" وہ بار بار شرمندہ ہو رہا تھا۔

"میرے جی میں اس وقت سو طرح کے خدشے اور وسوسے جنم لے رہے تھے کہ تم کہاں ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا؟ وغیرہ وغیرہ اور ہر بُرے خیال کے ساتھ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھ میں تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔ اللہ کبھی نہ کرے۔" زید نے تڑپ کر ان کے ہاتھ لبوں سے لگا لیے۔

"زید! تُو مجھے اتنا پیارا کیوں ہے؟ میں نہیں جانتا بس تُو مجھے کبھی کوئی دکھ نہ دینا...... ورنہ میں......" فرطِ جذبات سے ان کی آواز رندھ گئی۔

"اللہ کرے آپ کو دکھ دینے سے پہلے مجھے موت آ جائے۔" اب اس نے انہیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ دونوں کچھ دیر اسی جذباتی حالت میں کھڑے رہے تو پان بناتی ہوئیں طاہرہ بیگم کو بولنا ہی پڑا۔

"ارے کیا بچپنا ہے بھئی...... ایک بچہ...... دوسرا اس سے بھی ننھا۔" انہوں نے پہلے زید اور پھر میاں صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیجیے پان تیار ہے۔" انہوں نے بات بدلنے کے لیے نور صاحب کے ہاتھ میں پان تھما دیا۔

"اور بی بی جان میں......" وہ منہ کھول کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جس میں حسبِ معمول بی بی جان نے دوسرا پان اپنے ہاتھ سے ڈال دیا۔

"دیکھوں گی جب بیوی آ جائے گی تو کس کے ہاتھ سے کھائے گا۔" وہ لاڈ سے بولیں۔

"صرف اور صرف اپنی بی بی جان کے ہاتھ سے۔" اس نے بی بی جان کی کتھے سے بھری انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا۔

"کتنی بار کہا ہے۔ یہ نہ کیا کر۔ گندے غلیظ۔" وہ اپنی انگلیاں چھڑاتے ہوئے ناراضگی سے بولیں۔ وہ اس کام سے ذرا چڑتی تھیں مگر زید کو تب تک [illegible] آتا تھا جب تک وہ ایسا نہ کر لیتا۔

"شکریہ بی بی جان۔" اس نے پلٹ کر اپنی دادی کا ماتھا چوما اور پھر دادا کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"Sory once again dada ji" وہ پھر کان پکڑے کھڑا تھا۔

"Mention not my dear" وہ پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولے۔

"But not again" ساتھ ہی انہوں نے تنبیہ بھی کر دی۔

"Never for ever" وہ تہہ دل سے وعدہ کر رہا تھا۔

"چلو اب جا کر آرام کرو صبح بہت سارے کام ہیں تمہارے کرنے کو۔" وہ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

"جی دادا جان میں صبح ہی آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

"وہ تو صاحبزادے کو آنا ہی ہوگا۔ مسجد کون جائے گا۔ خبردار فجر گھر پر پڑھی تو۔" وہ آج

فوراً ہی مان گیا ورنہ تو اکثر فجر کے وقت وہ مسجد جانے کی ڈنڈی مار جایا کرتا تھا اور نماز جلدی سے گھر پر ہی ادا کر کے دوبارہ سو جایا کرتا تھا۔

''جیتے رہو۔'' جیلانی صاحب اور بیگم جیلانی کے لبوں سے ایک ساتھ دعا نکلی اور دل سے ''آمین۔''

وہ بے حد مطمئن اور خوش ہو گیا تھا اور دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ بھی دنیا کی ناراضگی برداشت کر سکتا مگر اپنے دادا جان اور ستارہ آپی کی خفگی اس کے لیے سوہانِ روح بن جایا کرتی تھی۔

ناشتے سے کچھ دیر بعد ہی وہ ستارہ کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا اور وقفے وقفے سے اس کے کانوں میں جانے کیا کہتا تھا جس پر وہ اور بھی شرما کر سمٹ جاتی تھی۔ سامنے صوفے پر بظاہر اخبار پڑھتے ہوئے احمد حسن کی ساری توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔ وہ کچھ دیر تو ان دونوں کو اس طرح سے سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ کر مسکراتا رہا مگر پھر اس کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ غائب ہونے لگی اور وہ عجیب عجیب سے زاویوں میں سکڑنے اور پھیلنے لگے۔

''بھئی کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' آخر کار وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''یہ ہم دونوں کی باتیں ہیں بھائی جان! انہیں اور کوئی شیئر نہیں کر سکتا۔'' زید نے ذرا لاڈ سے کہا مگر وہ جانتا نہ تھا کہ اس کے بڑے بھائی کی طبیعت اب خاصی بدل چکی ہے۔ شک کا سانپ اس کے لہو میں سرسراتا رہتا ہے جو کبھی کبھی پھن اٹھا کر پھنکارنے لگتا ہے۔ وہ جس تہذیب میں برسوں رہ کر تعلیم یافتہ بن کر آیا ہے۔ وہاں ''شک اور حسد'' وبائی بیماریوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اور ہر شخص اس کا متاثرہ ہوتا ہے۔

''زید! اب تم بچے نہیں رہے ہو۔ عقل کرو۔ نہ ہی ستارہ اب سنگل Single ہے۔ میری بیوی ہے یہ...... اور میری محبوبہ بھی...... کوئی میری محبوبہ کے قریب مجھ سے زیادہ آئے یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے ستارہ کی کمر کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے کہہ دیا جس پر ستارہ ہکا بکا سی اسے تکنے لگی۔ جبکہ زید خاصا کھسیانا ہو گیا۔

''تارہ آپی! میں ذرا شام کے انتظامات دیکھ آؤں۔'' وہ بہانہ بنا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

''احمد! بُری بات۔'' ستارہ نے زید کے جانے کے بعد ہولے سے گلہ کیا۔

''کیا بُری بات؟'' وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار نثار کرتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کا دل......''

''میرا دل تمہارے معاملے میں سچ مچ بہت وہمی اور کریزی ہے۔'' اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا اور خود کہنے لگا۔

''سنو ستارہ! میرے اور تمہارے درمیان اگر 'بال' بھی آئے گا تو مجھے دیوار لگے گا اور مجھے ''محبت'' میں حدیں، دیواریں، فاصلے ہرگز بھی برداشت نہیں۔ میں نے تو تمہارے قرب کے بغیر جو وقت کاٹا ہے ابھی اس کے عذابوں کا حساب باقی ہے۔'' وہ بے حد رومان پسند تھا اور جذباتی بھی۔

''احمد پلیز......'' ستارہ جیسی ٹھہری ہوئی طبیعت کی لڑکی اس کے ان اندازوں سے گھبرا رہی تھی۔ اسے احمد حسن کے جذبوں پر شک نہ تھا۔ وہ واقعی ستارہ کو شدت سے چاہتا تھا اور بچپن سے چاہتا تھا لیکن اتنی اور ایسی قربت۔ وہ اس کی بے باکیوں سے گھبرا رہی تھی۔

''پلیز...... کیا پلیز؟ بھئی اب تو تم میری بیوی ہو۔ میرا حق ہے تم پر۔'' وہ اس کے کسمسا کر پیچھے ہٹنے پر منہ بناتا ہوا بولا۔

''اچھا آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ شام کو کیا پہن رہے ہیں۔ تھری پیس، ٹو پیس...... شیروانی یا پھر شلوار قمیص۔'' ستارہ نے بڑے طریقے سے بات بدلی اور وارڈ روب کھول کر اس کے لباس دیکھنے لگی۔

''تم بتاؤ کیا پہنوں؟ تمہیں کیا پسند ہے؟'' وہ بھی فوراً ہی بہل گیا۔

''میری پسند سے پہنیں گے؟'' وہ خوش ہوتی ہوئی بولی۔

''اب تو عمر بھر صرف تمہاری پسند سے ہی پہنوں گا۔ تمہاری پسند سے جیوں گا اگر تم بھی میری پسند کا خیال رکھو گی۔'' وہ صاف دلی سے کہہ گیا۔ مگر ستارہ کے نرم و نازک احساس پر ایک چوٹ پڑی۔

''یعنی آپ محبت بھی شرطوں سے کرتے ہیں؟'' اس نے اپنے اندر کی پریشانی پھر بھی ظاہر نہ ہونے دی۔

''بالکل...... زندگی گزارنے کا یہی گُر ہونا چاہیے Give and take۔'' وہ بڑی آسانی سے کندھے اچکاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''حالانکہ......'' ستارہ نے اس کی چمکیلی سبز مائل آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کیا حالانکہ؟'' وہ اسے یوں اپنی آنکھوں میں جھانکتا پا کر کہہ رہا تھا۔ ''میرا دل بہت چھوٹا ہے لیکن صرف تمہاری محبت کے معاملے میں۔''

"اچھا...... اچھا آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ شام کو کیا پہن رہے ہیں۔" اس نے جھٹ سے بات بدلی اور خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر الماری کھول کر دیکھنے لگی۔

"تم بتاؤ کیا پہنوں؟" وہ بھی اس کے ساتھ آ کر اپنے شام کے لباس کا انتخاب کرنے لگا۔

"آپ جو بھی پہنیں آپ کو اچھا لگے گا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر پیار سے بولی۔

"سچ کہو۔" اس نے پھر سے بانہوں سے تھام لیا۔

"دیکھو! ادھر دیکھو۔" وہ اس کی جھکی پلکوں اور بلش ہوتے گالوں کو دیکھ کر بے قرار ہوتا جا رہا تھا۔

"دیکھو ناں پلیز...... ایک بار...... اور کہو تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہو جتنا کہ میں۔" وہ اس کے لبوں سے اقرار سننا چاہتا تھا۔

"تم نے رات بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے جینے کے لیے تمہارے اقرار کی ضرورت ہے۔ کہو ناں...... پلیز؟" وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح ضد کر رہا تھا۔

"کیا آپ کو کچھ شک ہے؟" وہ نظریں جھکائے جھکائے ہی بمشکل بولی۔

"شک نہیں ہے۔ مگر میرا یقین بھی تو وعدہ چاہتا ہے۔ عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ۔ صرف اور صرف مجھے چاہنے کا وعدہ۔" وہ بے حد جذباتی تھا۔ ستارہ نے دھیرے سے آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں اور آہستگی سے بولی۔

"احمد! محبت کرنے والوں کو 'وعدوں' کی ضرورت نہیں پڑتی محبت کا وجود دیکھنے کے لیے ظاہری آنکھوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ محسوس کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کا احساس ہی اس کے ہونے کا اقرار ہے اور اس کا اقرار 'زندگی' ہے۔

یہ...... یہ دھک دھک کرتا ہوا دل...... آتی اور جاتی سانسیں۔ کیا آپ کو اب بھی میرے وجود سے 'احمد، احمد' کی صدا سنائی نہیں دے رہی؟" ستارہ نے اس کا ہاتھ دھیرے سے پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

"میری تارہ...... میری حیات۔" وہ جو برسوں سے اس کے منہ سے اپنی محبت کا اقرار سننے کو ترس رہا تھا اور اب رات بھر سے تڑپ رہا تھا۔ اس قدر خوبصورت جواب سن کر نہال ہی ہو گیا۔ دل و جان سے اس پر نثار ہی ہو گیا اور وہ اس کے سینے سے تارہ تارہ کی آتی صدا سن کر اپنے رب کی شکر گزار۔

❖......O......❖

یہ ستارہ کے ولیمے کی دوسری شام تھی اور اس شام کا کھانا نور محمد جیلانی صاحب نے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ارینج کیا تھا اس میں ان کے کاروباری حلقوں کے دوست احباب اور ان کے بیوی بچے مدعو تھے۔ وہ سب گھر والے تیار ہو رہے تھے۔ آج زید سب سے پہلے تیار ہو گیا تھا اور اب باقی سب پر رعب جماتا پھر رہا تھا۔

"جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔" سب سے پہلے وہ ہدیٰ کے سر ہوا۔ کیونکہ وہ سب سے آخر تک لگی رہتی تھی پھر بھی تیار نہ ہوتی تھی اور اس کی وجہ سے اکثر باقیوں کو ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔

"محترمہ جلدی کر لینا۔" وہ اسے بال برش کرتے ہوئے دیکھ کر پریشانی سے بولا۔

"لو جی ابھی تک تو تمہارے بال ہی نہیں بنے۔ باقی سب کب ہو گا۔"

"زید بھائی! تنگ نہ کریں پلیز۔" وہ اپنے گھنگریالے بالوں کو سیدھا کرتے ہوئے روہانسی ہو رہی تھی مگر وہ تھے کہ ہو ہی نہ رہے تھے۔

"ہٹو بھی...... لاؤ میں کر دوں۔" اس نے وہ ہیئر برش اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھا اور دراز میں سے گول برش نکال کر ڈرائیر ڈھونڈنے لگا۔

"آپ کیا کرو گے؟" وہ بدستور جھنجھلائی ہوئی تھی۔

"کہاں گیا۔" وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

"ڈرائیر یہاں نہیں ہے۔" ہدیٰ نے اسے بتایا۔

"تو پھر کہاں ہے؟" وہ ذرا غصے سے بولا۔

"وہ تو زائرہ آپی لے گئی تھیں ان کا ڈرائیر خراب ہو گیا تھا اس لیے۔" وہ سہمی سی بولی۔

"تو چھٹی کرو تمہارے بال نہیں بن سکتے۔ اب اس نک چڑھی سے کون واپس لائے جا کر۔ ورنہ تو میں بلو ڈرائی کر دیتا۔" وہ برش واپس دراز میں ڈالتا ہوا بولا۔

"بلو ڈرائی...... کیا آپ کو بلو ڈرائی کرنے آتے ہیں۔ پلیز کر دیں ناں۔" وہ خوش ہو کر اس کی منت کرنے لگی۔

"تو لے آؤ ڈرائیر۔ کر دوں گا۔" وہ آرام سے بولا۔

"ابھی لائی۔" وہ خوشی سے بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"اور یہ تم کیا کر رہی ہو ردا؟" وہ لپ اسٹک لگاتی ردا کے قریب آ گیا۔

"نظر نہیں آتا آپ کو؟" وہ لپ اسٹک اس کے سامنے نچاتی ہوئی بولی۔

''مجھے تو آتا ہے مگر تمہاری بینائی کے حالات خراب ہیں دیکھو غور سے۔'' وہ اسے کندھوں سے تھام کر آئینے کے سامنے لے آیا۔ گہرے نارنجی رنگ کی لپ اسٹک واقعی اس کے چہرے پر اچھی نہ لگ رہی تھی۔

''تو پھر اور کون سا رنگ لگاؤں۔'' وہ سچ مچ روہانسی ہو گئی۔

''ضروری نہیں کہ نارنجی سوٹ پر نارنجی لپ اسٹک ہی ہو۔'' وہ سامنے دھری ہوئی بہت ساری لپ اسٹکس کو کھول کھول کر دیکھنے لگا۔

''ہاں...... یہ لگا لو۔ بہت بھلی لگے گی۔'' اس نے ایک ہلکے براؤن رنگ کی لپ اسٹک کھول کر اس کی طرف بڑھائی۔ جسے ردا نے اپنی پہلی لپ اسٹک اتار کر جلدی سے لگا لیا۔

''اوہ تھینک یو برادر! یہ تو کمال لگ رہی ہے۔'' وہ خوش ہو کر شکریہ ادا کرنے لگی۔ ہیئر ڈرائیر لے آئی تھی اس نے اس کے گھنگریالے بالوں کو سلیقے سے بلو ڈرائی کر کے ایک ڈھیلے سے ربڑ بینڈ سے باندھ دیا۔

''زید بھائی! آپ تو پورے بیوٹیشن ہیں۔'' وہ بھی بے حد خوش ہو گئی تھی۔

''جی ہاں آپ نے بالکل درست کہا۔ بیوٹیشن ہیں یہ۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سالار اور عادل نے مذاق سے کہا۔

''تو پھر بھائی تو نہ ہوئے البتہ۔'' عادل جو اس کا اچھا دوست بھی تھا شرارت سے کہنے لگا۔

''تم جو بھی کہہ لو۔ مجھے پروا نہیں۔ میرا شوق مجھے دوسروں کے کام آنے کا موقع دیتا ہے اور بس۔'' اس نے ذرا بھی بُرا نہ منایا۔

''کیا یار! تم بھی ناں ہر وقت لڑکیوں میں گھسے رہتے ہو۔ مرد ہو مردوں میں رہا کرو۔'' سالار نے اپنے بازوؤں کے مسلز دکھاتے ہوئے بڑے فخر سے کہا۔

''ایسے برائلر مردوں کا کیا فائدہ؟ جو جم جا جا کر اور مصنوعی طاقتیں سپلیمنٹ پی پی کر ایسے غبارے نکال لیں۔'' اس نے بھی اس کے مسلز پر شرارت سے چٹکی بھرتے ہوئے اپنا حساب پورا کرنا چاہا۔

''جو ذرا سی سوئی لگنے سے پُھس ہو جاتے ہوں۔''

''اچھا اچھا باتیں مت بناؤ اور نکلو اپنی سہیلیوں میں سے...... باہر بڑے ابا تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔'' سالار نے اپنی شرمندگی مٹانے کو کہا۔

''اوئے ہاں! دادا جان۔'' وہ کچھ یاد آ جانے پر بجلی کی سی تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

کمرے کے ایک کونے میں کھڑی عیون کے ہاتھ میں پکڑا کاجل پکڑا ہی رہ گیا جسے وہ پچھلے کئی منٹوں سے صرف دیکھے ہی جا رہی تھی۔ وہ زید کے منہ سے صرف یہ سننے کو کھڑی تھی کہ وہ جاتا جاتا اس کے قریب آئے گا اور دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کرے گا۔

''کاجل ضرور لگانا۔ تمہاری آنکھوں میں بہت جچتا ہے۔'' لیکن آج وہ ایسا نہ کہہ کر گیا تھا اس لیے اس نے کاجل بھی نہ لگایا اور بس ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر تیار ہو گئی تھی۔



وہ کافی دیر سے نوٹس کر رہا تھا کہ ''زائرہ'' کئی بار واش روم جانے کے بہانے سے ادھر اُدھر ہو چکی تھی۔ اس کی نظریں بہت بے چینی سے کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر کس کو؟ اس نے بھی اپنی آنکھیں اسی کے تعاقب میں ڈال دی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا وہ آج بھی اپنے موبائل سیٹ پر ہی مصروف تھی۔ کبھی کان سے لگا کر ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کی باڑ لگا کر ہولے ہولے کسی سے باتیں کرنے لگتی اور کبھی میسج کرنے اور پڑھنے لگتی۔ اس کا مطلب تھا وہ مسلسل کسی سے رابطے میں تھی۔

''کس سے؟ کون تھا۔ آخر وہ کون تھا؟'' یہی تو اب زید نے پتہ لگانا تھا۔ وہ آج بھی غیر محسوس طریقے سے اس کے ساتھ ساتھ سایا بنا ہوا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا اس نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہ کھایا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پریشان سی کھڑی وہ صرف اپنے موبائل سے مصروف تھی۔

''کاش کسی طرح سے میرے ہاتھ وہ نمبر لگ جائے جس پر یہ رابطہ کرتی ہے۔'' وہ انکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا۔

''کیسے ٹریس کروں۔ کیسے ٹریس کروں؟'' بے بسی کے احساس سے اس کی کنپٹیاں جلنے لگیں۔

''زیدّ بھائی! زید بھائی! امی جان نے آپ کو بلایا ہے۔'' معید ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''شاہانہ پھپھو مجھے بلا رہی ہیں۔ مگر کیوں......'' وہ اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

''جی وہ عیون آپی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور انہیں قے ہو رہی ہے۔'' وہ تیز تیز سانسوں کے درمیان بول رہا تھا۔

''عیون کی طبیعت۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اس طرف بھاگا جدھر سے وہ آیا

تھا۔

''کیا ہوا پھپھو'' سامنے ہی لیڈیز باتھ روم کے باہر اسے شاہانہ پھپھو مل گئیں جنہوں نے نڈھال سی عیون کو سہارا دیا ہوا تھا۔

''پتہ نہیں اچانک ہی اس کا دل گھبرانے لگا اور اب مسلسل قے ہو رہی ہے۔'' اس کی پیاری پھپھو بے حد پریشان تھیں۔

''زید تم اسے گھر چھوڑ آؤ۔'' وہ پیار سے درخواست کر رہی تھیں۔

''میں......جی وہ مجھے تو دادا جان نے۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ جی جان سے حاضر ہوتا اور ایسی حالت میں عیون کو فوراً لے جاتا مگر اس وقت ''زائرہ'' اس کے پاؤں کی بیڑی بنی ہوئی تھی۔

''ابا جان سے میں کہہ دیتی ہوں۔ وہ تم سے خفا نہ ہوں گے بلکہ دیکھ لینا وہ خود تم سے ہی کہیں گے۔'' پھپھو اور بھی پیار سے بولیں جس میں اس کے لیے مان بھی تھا۔

''جی پھپھو بس دو منٹ۔ میں ابھی آیا۔'' وہ انہیں انکار نہ کر سکتا تھا کچھ سوچ کر تیزی سے عادل کی طرف بڑھا۔ اس نے عادل سے جانے کیا کہا اور پھر اسی تیزی سے واپس آ گیا۔ معید اور شاہانہ پھپھو عیون کو سہارا دے کر باہر گاڑی تک لائے۔

''آئیں پھپھو۔'' اس نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''امی جان! میں ٹھیک ہوں آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سی بولی۔ حالانکہ اس کا رنگ تھوڑی سی دیر میں ہی زرد پڑ چکا تھا۔

''ہاں مجھے نظر آ رہی ہو جتنی تم ٹھیک ہو۔'' انہوں نے بیٹی کو پیار سے ڈانٹا تو وہ دوبارہ خاموش ہو گئی۔

''پھپھو آپ خود بھی ساتھ چلتیں۔'' زید نے اس کی خراب طبیعت کی طرف سے فکر مند ہو کر انہیں کہا۔

''میں مہمانوں کو چھوڑ کر اس طرح ابھی نہیں آ سکتی۔ تم اسے گھر چھوڑ آؤ یہ دوا کھا کر آرام کرے گی اتنی دیر میں ہم لوگ واپس پہنچ جائیں گے۔'' انہوں نے بڑے آرام سے عیون کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کسی اور لڑکی کو بھیج دیں ساتھ۔'' اچانک ہی کچھ سوچ کر اس نے کہا۔

''کس سے کہوں......سب یہاں انجوائے کر رہی ہیں۔'' انہوں نے سب کے خیال سے کہا۔

''زائرہ! ہاں میرا خیال ہے زائرہ بھی بور ہو رہی ہے ہو سکتا ہے اس کی طبیعت بھی کچھ خراب ہو۔ اسے بھیج دیں۔''

''زائرہ!'' شاہانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی پھپھو! ''زائرہ۔'' اس نے اپنی ترکیب کامیاب ہوتی دیکھ کر مزید زور دیتے ہوئے کہا۔

شاہانہ پھپھو زائرہ کو بلانے چل دیں اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ ''یا اللہ! زائرہ میرے ساتھ گھر ہی چلی جائے تو اچھا ہے۔'' اللہ نے اس کی دعا سن لی تھی۔



ستارہ کی شادی کو کئی روز ہو چکے تھے۔ سب کچھ معمول پر آ چکا تھا۔ گھر کے بھی افراد اپنی اپنی مصروفیات میں لگ چکے تھے۔ ہر طرف سکون و شانتی کی بہاریں تھیں۔ وہ بھی بظاہر تو اپنے معمولات پر آ گیا تھا اور کچھ مطمئن بھی دکھائی دیتا تھا لیکن وہ بے خبر ہرگز نہ تھا۔ بلکہ بڑا ہی چوکنا ہو کر حالات پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا لیکن بڑی احتیاط کے ساتھ۔ وہ اس کی نظروں میں مشکوک ہو چکا تھا اس لیے وہ بھی بے حد محتاط ہو چکی تھی۔ اب وہ اسے کم ہی دکھائی دیتی تھی اور اگر وہ آتے جاتے اس سے ٹکرا بھی جاتی تو بغیر کچھ کہے تیزی سے گزر جاتی یا پھر کبھی کبھی سلام کر دیتی۔ اب وہ اس کے ساتھ الجھتی نہ تھی اور یہ اچنبھے کی بات تھی جس پر زید کی چھٹی حس مطمئن نہ تھی۔

وہ اب بھی چھپ چھپ کر اس کی جاسوسی کر رہا تھا۔ کالج تو عیون، ردا اور زائرہ کا ایک ہی تھا اس لیے وہ اکٹھی ایک ہی گاڑی پر جاتی تھیں۔ لیکن شام کو وہ اکیڈمی پڑھنے ڈرائیور کے ساتھ تنہا ہی جاتی تھی۔ لہٰذا شام کو زید بڑی ہی احتیاط سے اس کا پیچھا کرتا اور اسے نظروں میں رکھتا تھا۔ وہ اس کے تیوروں کو اچھی طرح سے جان گیا تھا۔ سمجھ رہا تھا اس کا یہ پُرسکون دکھائی دینا بے وجہ نہیں ہے۔ اس کا دل کہتا تھا کوئی بڑی بات ہونے والی ہے مگر کیا؟ اس کا دماغ یہاں آ کر جلنے لگتا۔ وہ اس کے بارے میں کسی کو بتانا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا گھر والے اس پر پابندی لگا دیں۔ اس کا یوں وقت بے وقت باہر اندر جانا ختم ہو جائے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہ تھا کہ کوئی اس کی بات کا اعتبار کرتا۔ ایسے ہی خیالات کی آگ میں آج پھر اس کا دل و دماغ سلگ رہا تھا۔ آج پھر اس کی بے حد گہری اور پیاری سہیلی رامین صبح سے آئی ہوئی تھی اور وہ دونوں پچھلے دو گھنٹوں سے کمرے میں بند تھیں۔ کمبائن اسٹڈی کی آڑ میں اندر جانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ وہ کئی بار بہانے بہانے سے ان کی طرف چکر لگا رہا تھا۔ اب پھر وہ اپنی خالہ جان

کے ساتھ کچن میں موجود تھا جو زائرہ اور رامین کے لیے نوڈلز، سوپ، نگٹس اور خدا جانے کیا کیا بنانے میں مصروف تھیں اس کے عمیس چچا جس قدر کنجوس طبیعت کے واقع ہوئے تھے ترنم اسی قدر کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی مالکہ تھی۔

"کیا ہو رہا ہے خالہ جان؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

"ہونا کیا ہے جانِ خالہ......بس کھانا پکانا اور کیا؟" ترنم نے مسکراتے ہوئے اپنی اَزلی خوش مزاجی سے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی پُر تکلف ضیافت کا سامان ہے کس خوش نصیب کی دعوت ہے آج؟" وہ ایک گرما گرم نگٹس پر ہاتھ صاف کرتا ہوا بولا۔

"ضیافت کس کی ہو گی۔ وہ تو بچیاں مل کر پڑھائی کر رہی ہیں ان کے لیے بھجوا رہی ہوں۔ لو تم بھی کھاؤ۔" انہوں نے ایک پلیٹ میں نوڈلز نکال کر اس کے سامنے رکھیں۔

"کیچ اپ......ہاں کیچپ ذرا فریج سے نکال لو۔" وہ ہاٹ پاٹ میں باقی کی نوڈلز ڈالتی ہوئی بولیں۔

"جی خالہ جان۔" اس نے آگے بڑھ کر فریج سے کیچپ نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈالی اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

"خالہ جان! یہ ردا کہاں ہیں۔ کیا وہ بھی اپنی کسی فرینڈ کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔" اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ جتنا پڑھنے والی ہے تم جانتے ہو۔" خالہ اس کی بات پر ذرا جلے دل سے بولیں۔

"ہو گی اپنے کمرے میں۔" ساتھ ہی انہوں نے بتا بھی دیا۔

"اور خالہ جان رمیض......رمیض کہاں ہے؟" وہ جلدی اپنی پلیٹ ختم کر کے اٹھا۔

"وہ ٹیوشن گیا ہوا ہے۔" انہوں نے کام کرتے کرتے بتایا۔

"خالہ جان! مزہ آ گیا نوڈلز کھا کر۔ شکریہ۔" وہ وہیں سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

"اچھی لگی......اور لے لو۔" وہ اسے اور دینے کو آگے بڑھیں۔

"نہیں......نہیں......بس......میں نے کچھ دیر پہلے ہی سموسے کھائے تھے۔" وہ پیار سے انہیں منع کرتے ہوئے بولا اور پھر ردا کے کمرے کی طرف چل دیا۔ آج وہ ایسے بلا وجہ ہی یہ سب کر رہا تھا۔ ردا کے پاس بھی وہ کچھ دیر یونہی پڑھائی کی باتیں کرتا رہا اور پھر چلا آیا۔ ابھی وہ درمیانی لان میں سے گزر ہی رہا تھا جب بخشو بابا (ان کا ڈرائیور) ہاتھ میں ایک سیاہ

ڈائری لیے آتا دکھائی دیا۔

"السلام علیکم بخشو بابا۔" اس نے ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام زید میاں جیتے رہو۔" بخشو بابا نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا لے کے جا رہے ہیں بابا؟" اس نے ان کے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی تھی۔ زائرہ بٹی کی ہو گی انہیں دینے جا رہا ہوں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"زائرہ کی ڈائری۔" اس کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔

"لائیں بابا میں دے دیتا ہوں۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ وہاں سے ہو کر واپس جا رہا تھا۔

"میں ہی دے دیتا۔ وہ ناراض ہو گی۔" بخشو بابا بھی اس کی بدتمیزی سے ڈرتا تھا۔

"ارے نہیں ناراض ہو گی۔ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کی دوست آئی ہے ناں اس نے کچھ منگوانے کے لیے مجھے بلایا ہے۔" اس نے ایک اور بہانہ تراشا۔

"اچھا ٹھیک ہے پر......"

"ارے کچھ نہیں کہے گی وہ آپ جائیں۔" زید نے ڈائری ان کے ہاتھ سے لی اور انہیں دکھانے کو دوبارہ اس طرف پلٹ گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا بخشو بابا اسے کھڑے دیکھ رہے تھے جس پر اسے دوبارہ اندر جانا پڑا مگر اندر جا کر وہ پچھلی گلی سے نکل کر اپنے گھر کے پچھلے صحن میں آ گیا۔ یہ ڈائری اسے امید کی ایک کرن نظر آ رہی تھی۔ اسے لے کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور اپنے بستر پر اوندھا لیٹ کر کچھ لمحوں تک اس ڈائری کو گھورتا رہا جیسے کھولنے سے پہلے دعائیں مانگ رہا ہو۔ پھر اس کے صفحے بڑے آرام سے ایک ایک کر کے پلٹنے لگا۔



"تمہیں پتہ ہے وہ آج کل تم سے کتنا خفا ہے؟" رامین نے اس کے چہرے پر اپنی معنی خیز نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"پتہ ہے مجھے......لیکن میں کیا کروں۔ تمہیں پتہ تو ہے یہ "زید" ایک بلا بن کر پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس سے کہو صبر کرے۔" زائرہ نے پریشانی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبے

ڈوبے جواب دیا۔

”محبت میں یہی ایک کام تو نہیں ہوسکتا۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”ہاں...... واقعی...... صبر تو ایک جبر لگتا ہے جسے برداشت کرنا۔ اُف مت پوچھو کتنا تکلیف دہ ہے۔“ وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

”ہاں بھئی...... ہم جیسے کورے کیا جانیں۔ عشق کی لذتیں وہی جانیں جنہیں یہ نصیب ہوتا ہے۔“ رامین نے ایک لمبی سی سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

”بکواس مت کرو۔ تُو جتنی کوری ہے۔ مجھے سب خبر ہے۔“ رامین کے آہ کھینچنے پر زارہ نے قریب پڑا کشن اٹھا کر اس پر دے مارا۔

”اچھا وہ...... وہ...... وہ تو۔“ اس نے وہ کشن اپنی گود میں رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے یوں کہا جیسے کچھ بھول گئی ہو۔

”ہاں...... وہ...... اور پھر...... وہ...... اور۔“ زارہ اسی کے انداز میں وہ کی گنتی کرتی ہوئی بولی۔

”وہ سب تو بس ایویں ہی ہے۔“ وہ بڑی بے شرمی سے کندھے اچکاتی ہوئی بولی۔

”تم ہو کیا چیز؟ میں تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں سکی۔“ زارہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”چیز...... میں چیز نظر آتی ہوں تمہیں...... بڑا افسوس ہے یار۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

”زارہ! میری جان! یہ جو ہماری زندگی ہے ناں۔ یہ صرف ایک بار کے لیے ملی ہے اور جوانی بھی اور...... اور اس پر ستم یہ خوب صورتی بھی سدا نہ رہے گی۔ سوائے کسی ایک بندے کے لیے رو رو کر مر مر کر کیوں ضائع کریں۔“

”اچھا تو کیا تمہاری طرح سے فلرٹ کرتے پھریں؟“ وہ اس کی ہم خیال نہ ہوئی۔

”یہ تم انسانی جذبات کی اتنی بے عزتی کیوں کرتی ہو۔ ’فلرٹ‘ کہہ کر۔“ وہ ذرا نخرے سے چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”تو پھر اسے کیا کہنا چاہیے۔ میڈم جی۔“ وہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو کر اپنا عکس آئینے میں دیکھنے لگی۔

”چھوڑو یار تم کن چکروں میں الجھ رہی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

”بھئی میں کیا کروں میں تو کسی کا دل توڑ نہیں سکتی۔ اب کوئی مجھے اتنے پیار سے فون

کرے...... میل کرے...... یا پھر کارڈ بھیجے اور دوستی کرنے کو کہے تو میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔ آخر کو اخلاق بلکہ ’حُسنِ اخلاق‘ کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔“ اس نے ”حُسنِ اخلاق“ کو ذومعنی انداز میں کہا۔

”کارڈ...... ارے ہاں کارڈ...... وہ تمہارے حسان راؤ کا تازہ ترین کارڈ ہے۔ کارڈ جس پر اس نے تمہیں اور جانے کیا کیا لکھا ہوگا۔“

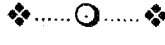
رامین کو ایک دم سے وہ کارڈ یاد آ گیا جو حسان راؤ نے آج صبح کالج سے واپسی پر گاڑی روک کر دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہا۔

”کہہ دینا اپنی فرینڈ کو اگر وہ کل مجھے ملنے نہ آئی تو میں کل رات کی ہی فلائیٹ سے واپس کینیڈا چلا جاؤں گا۔“

”ارے ہاں...... وہ کارڈ...... وہ تو میں نے ابھی پڑھا بھی نہیں۔ وہ تو میں نے اپنی ڈائری میں رکھا تھا۔“

”میری ڈائری۔“

کچھ یاد آنے پر وہ بے چینی سے چیزیں اِدھر اُدھر پلٹنے لگی۔ اپنا کالج بیگ اس نے پورے کا پورا قالین پر الٹ دیا۔ فائلیں ورق ورق بکھرا دیں۔ تکیے کشن...... وہ بے انتہا پریشان ہوگئی تھی۔ کہاں گئی۔ کہاں گئی...... وہ رو دینے کو تھی۔



ستارہ اور احمد حسن اپنے ہنی مون سے رات ہی واپس آئے تھے دونوں کے تر و تازہ اور کھلے ہوئے چہرے اس بات کے غماز تھے کہ وہ دونوں بے حد خوش ہیں۔ ستارہ تو اور بھی سرخ و سپید ہوگئی تھی۔ صرف ایک ہفتے میں اس کا رنگ روپ اور بھی نکھرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی اچھی ہوگئی تھی۔ سب گھر والے انہیں خوش دیکھ کر بے حد مطمئن اور شاد تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش جیلانی صاحب اور بیگم جیلانی تھے۔ آج ان دونوں کو اسی خوشی کی وجہ سے نیند نہ آ رہی تھی۔

”میاں صاحب! سنتے ہیں۔ سو تو نہیں گئے۔“ طاہرہ بیگم نے کروٹ بدل کر انہیں کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا۔

”آج نیند آ ہی نہیں رہی۔“ وہ سیدھے ہو کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے بولے۔

”مجھے بھی......“ طاہرہ بیگم بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"دیکھا آپ نے ہماری تارہ کا رنگ روپ کس قدر نکھر گیا ہے۔" وہ اب بھی تارہ کو اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے تھیں۔

"اللہ کا شکر ادا کرو بیگم ورنہ سچ کہوں مجھے بڑی فکر تھی احمد کی طرف سے۔" جیلانی صاحب نے اپنے دل کی بات بتائی۔

"آپ تو بس وہمی ہیں اور کچھ نہیں۔ بھلا احمد کیوں کر ہمیں پریشانی دیتا۔" وہ جیلانی صاحب سے کچھ ناراض ہوتی ہوئی بولیں انہیں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں سے بے پناہ محبت تھی اور ان پر بلا کا اعتماد بھی تھا۔ وہ تو اپنے میاں صاحب سے اتنی سی بات پر بھی خفا ہو جاتی تھیں اگر وہ کبھی کہہ دیتے۔

"طاہرہ بیگم! بچیاں اب بڑی ہو چکی ہیں آپ ذرا ان کے اوڑھنے پہننے اور اندر باہر جانے پر نگاہ رکھا کریں۔" تب وہ انہیں الٹا سمجھانے لگتیں۔

"ہماری بچیاں جس ماحول اور تربیت میں پل کر جوان ہوئی ہیں وہ انہیں اچھا برا تمیز کرنے کی صلاحیت دے چکا ہے۔"

"بیگم! ہم اپنے گھر کے ماحول سے مطمئن ہو سکتے ہیں مگر زمانہ جس ڈگر پر جا رہا ہے اس کے فتنوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری تربیت، ہمارا خون اتنے ہلکے نہیں ہیں جو زمانے کا رنگ ان پر آسانی سے چڑھ جائے۔" طاہرہ بیگم فخر سے کہتیں اور نور صاحب مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ آج بھی طاہرہ بیگم کے ایک ہی جواب سے لاجواب ہو کر مسکرا دیئے تھے۔

"آپ نے دیکھا اب تارہ دردانہ سے بہت شباہت دینے لگی ہے۔" وہ اپنی مرحومہ بیٹی کا ذکر کرنے لگیں جسے وہ کبھی بھی نہ بھولی تھیں۔

"مجھے تو وہ اکثر بالکل ہی دردانہ دکھائی دیتی ہے۔" نور صاحب بھی اداسی سے بولے۔

"دیکھا آپ نے...... اس مردود کو نہیں آیا ناں؟" اچانک ہی انہوں نے شاہد کا ذکر چھیڑ دیا۔

"کیا ہو جاتا اگر دو گھڑی کو آ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اسے دعا دے کر رخصت کر دیتا۔" وہ دلگیر ہو رہی تھیں۔

"ہاں اگر وہ آ جاتا تو بہت اچھا ہو جاتا۔ میں بھی شاید اسے دل سے معاف کر دیتا۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اس نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اچھے خاندان اور اچھی ذات کا نہ تھا۔ غیر ہی تھا۔ پرایا ہی تھا۔" طاہرہ بیگم کی آنکھوں کی نمی سے ان کا لہجہ بھیگنے لگا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ ذات کا کوڑھی ہی تھا۔ اس کے اندر کا لالچ ایک سال بھی چھپا نہ رہ سکا اور سڑاند دینے لگا۔ میں آج تک ان لمحوں کو روتا ہوں جب ہم نے اسے معاف کیا اور اپنایا۔" جیلانی صاحب ماضی کو یاد کرنے لگے۔

"چھوڑیں میاں صاحب! ان باتوں کو جو صرف دکھ کا باعث تھیں۔ کل بھی اور آج بھی۔" طاہرہ بیگم نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ انہیں اپنی بیٹی کی یاد آتے ہی وہ سارے دکھ درد بھی یاد آ جاتے تھے جو ان کی بیٹی نے اٹھائے تھے۔

"چھوڑیں دفع کریں آپ اس منحوس کا کیا ذکر لے بیٹھیں۔ کوئی اور بات کریں۔" نور صاحب نے اپنی زوجہ کا دھیان بٹانے کو کہا۔

"آپ نے اپنے باقی بچوں کے بارے میں بھی کچھ سوچا کہ نہیں۔" وہ بڑی محبت سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"باقی بچوں کے بارے میں کیا؟" طاہرہ بیگم نے کچھ سمجھتے اور نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی اپنے اردگرد نظر ڈالیے۔ جواد، سالار، عادل اور...... اور...... اپنا زید...... اب ان کی باریاں ہیں۔" وہ انہیں کھل کر سمجھانے لگے۔

"ابھی تو بچے پڑھ رہے ہیں۔" طاہرہ بیگم کی دلچسپی اب ان کے اشاروں کی طرف تھی۔ مگر ابھی وہ ان کے خیالات کو صاف صاف جاننا چاہ رہی تھیں کہ آخر وہ اپنے دل میں کیا تانے بانے بنے بیٹھے ہیں۔

"دیکھو طاہرہ!" میاں جی نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بات شروع کی۔ وہ سنجیدہ ہونے کے باوجود خوش تھے۔ اسی لیے مسکرا رہے تھے۔

"ہم نے جواد کی آنکھوں میں زائرہ کے لیے پسندیدگی محسوس کی ہے اور زید کی آنکھوں میں عیون کے لیے اور ہمارا خیال ہے آپ نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا؟" اب وہ اپنی بات بتانے کے ساتھ ساتھ ان سے بھی سوال کر رہے تھے۔

"لگا تو مجھے بھی کئی بار ہے۔" وہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ بچے ہمارے فیصلے سے نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ بڑی ہی گرمجوشی سے ہمارے فیصلے کا خیر مقدم بھی کریں گے۔" وہ تو گویا فیصلہ بھی کر چکے تھے۔

"یعنی آپ کا کیا مطلب ہے؟" بی بی جان کو جس بات کی تہہ میں جانے کی پچھلے کئی

روز سے بے چینی تھی وہ معاملہ کھل کر ان کے سامنے آ ہی گیا تھا دراصل جیلانی صاحب ستارہ کی شادی کے دنوں میں کئی بار کہہ چکے تھے کہ۔

''اگر ہمیں یقین ہو جائے کہ جو ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ سچ ہے تو ہم اس شادی پر کئی اور خوشخبریاں سنا دیتے۔'' تب طاہرہ بیگم کو ان کی یہ مبہم سی بات اتنی قابل توجہ بھی نہ لگی تھی اس لیے انہوں نے اس کے بارے میں زیادہ تجسس بھی نہ کیا۔ تب انہیں اور بہت سے ضروری کام تھے۔

''اچھا تو اب آپ کو کیسے یقین ہو گیا؟'' اب ان کا تجسس ایک دم ہی بے تابی میں تبدیل ہو گیا۔

''بس کئی باتیں ایسی ہو گئیں جنہوں نے ہمارے دل کی بڑی ڈھارس بندھائی۔'' وہ محسوس ہونے والی باتوں کی وضاحت الفاظ میں نہ کر سکتے تھے اس لیے بس اتنا ہی بولے۔

''طاہرہ بیگم! آپ کل دوپہر کے کھانے پر ان بچوں کے والدین کو مدعو کریں ہم ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے اپنی طرف سے تو حتمی طور پر طے کر لیا تھا لیکن ان کے والدین کی مرضی بہرحال ضروری تھی۔ اور ان بچوں کی مرضی؟

طاہرہ بیگم ان کی آنکھوں میں جگنو چمکتے دیکھ کر خوش تو ہوئیں مگر ان کا دل کچھ مطمئن نہ تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر بچوں نے میاں جی کے فیصلوں کے سامنے سر نہ جھکایا تو...... تو کیا ہو گا؟ وہ اندر ہی اندر ڈر رہی تھیں۔ فکرمند تھیں۔ ایک پریشانی انہیں لاحق ہو گئی تھی۔

''بچوں کا دل میں پڑھ چکا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔'' نور صاحب نے بیوی کی سوچ پڑھ کر انہیں تسلی دینے کو کہا۔

''ہمیں پھر بھی عیون اور زائرہ کی مرضی کھل کر لینی چاہیے۔ وہ بیٹیاں ہیں کہیں محض ہماری خوشی کی خاطر اپنی زندگیاں قربان نہ کر دیں۔'' طاہرہ بیگم نے ان سے صاف صاف کہہ دیا۔

''عیون کے لیے تو ہم جو بھی فیصلہ کریں وہ بخوشی اور دل سے تسلیم کرے گی۔ البتہ زائرہ کی طرف سے ہمارے جی میں بھی کچھ کھٹک ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہمیں اس کی طرف سے پریشانی رہتی ہے۔ عمیس کے بے جا لاڈ پیار سے ہم بڑے خائف ہیں۔ اس نالائق کو ذرا عقل نہیں۔ بیٹے کا تو ہر لحظہ دم خشک کیے رہتا ہے۔ مگر بیٹیوں خصوصاً زائرہ کو حد سے زیادہ لاڈ سے بگاڑ رہا ہے۔'' وہ زائرہ کی عادتوں کا ذکر بھی کرنے لگے۔

''آپ نے دیکھا ہو گا وہ ستارہ کی رخصتی کے وقت زید کا کس قدر مذاق اڑا رہی تھی اور

بدتمیزی سے پیش آ رہی تھی۔''

''ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں ہم نے بھی کئی بار عمیس کو سمجھایا ہے۔ ترنم کو بھی بتایا ہے کہ بیٹیوں کے معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ جتنی ضروری ان کے لیے محبت ہوتی ہے اتنا ہی ان کی تربیت کی ذمہ داری بھی کڑی ہوتی ہے۔ مگر یہ دونوں میاں بیوی سنتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں یہ ہماری بیٹیاں نہیں بیٹے ہیں۔ بھلا ایسا کبھی ہوتا ہے۔ بیٹی اور بیٹے تم کا فرق رب تعالیٰ نے یونہی تو نہیں رکھا۔'' وہ خود اس کی طرف سے پریشان تھیں۔

''بہرحال آپ پہلے میرے بچوں کو تو بلائیے کل دوپہر کے کھانے پر...... ہم پہلے ذرا ان سے بات کر لیں۔ ان کے بچوں سے پھر پوچھیں گے۔'' وہ ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنے کے لیے ذرا انداز سے بولے۔

''جی بہت بہتر میرے بچوں کے بچوں کے دادا جی۔'' انہوں نے بھی انہی کے انداز میں کہا۔ جس پر دونوں ہنس دیئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی جانب کا ٹیبل لیمپ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اب نیند نے ان کی پلکوں پر پاؤں رکھ دیئے تھے اور حواس اس کی چاپ پاتے ہی اسے خود سپردگی کے لیے تیار تھے۔



پہلے اس نے سوچا کہ ترنم خالہ سے ہی بات کر لے اور انہیں اعتماد میں لے کر سب بتا دے لیکن جس طرح سے وہ اپنی بیٹیوں پر اعتبار کرتی تھیں اور ان سے محبت کرتی تھیں وہ شاید اتنا بڑا دھچکا برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنی امی سے بات کرے وہ خود ہی خالہ جان کو سمجھا لیں گی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے میں امی جان سے بات کرتا ہوں۔ وہ یہی سوچ کر اپنی ماں کے پاس آیا تھا لیکن وہاں تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ جواد بھائی ان کے پاس بیٹھے تھے اور امی جان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگائے ہوئے تھے۔

''لگتا ہے اندر کوئی بہت ہی جذباتی مذاکرات چل رہے ہیں اور میں شاید غلط وقت پر آ گیا ہوں۔'' اس نے واپس پلٹنا چاہا۔

''غلط کہاں...... تم تو عین اچھے وقت پر آئے ہو۔ بلکہ میں تو تمہیں بلوانے والی تھی۔'' امی جان نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا یہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے جو ان کی آنکھوں میں اس وقت تھے۔

''خیریت! خیریت تو ہے مائی ڈیئر مام۔'' وہ اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے پیار سے بولا۔

"بالکل خیریت ہے۔ اِدھر آؤ تم یہاں بیٹھو میرے پاس۔" وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتی ہوئی بولیں۔

"اب میری بات کو غور سے سنو اور پھر مجھے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دینا۔ جس طرح جواد نے دیا ہے۔" وہ کوئی سنجیدہ بات کرنا چاہ رہی تھیں اسی لیے تو خود بھی سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

"کہیے امی جان! میں ہمہ تن گوش ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"زید! میں نے کہا ناں صرف میری بات سنو اور غور سے سنو۔ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ اب تم بچے نہیں رہے ہو۔" وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئیں۔

"سوری مما جان!" اس نے ماں کی خفگی کے ڈر سے فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹا تمہارے دادا جان کچھ فیصلے کرنا چاہتے ہیں جن پر بی بی جان بھی خوش ہیں اور جن کے ہو جانے سے جیلانی خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ جائیں گے۔ مضبوط ہو جائیں گے۔" وہ بات کرنے سے پہلے تمہید باندھ رہی تھیں۔ وہ بظاہر تو ان کا اک اک لفظ غور سے سن رہا تھا مگر اس کے اندر بہت سی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پریشانی اور نئی آزمائش کی گھنٹیاں۔ اس کے حواسِ خمسہ الارم بن گئے تھے۔

• "تمہارے دادا جان چاہتے ہیں کہ جواد اور زائرہ جبکہ تمہاری اور عیون کی نسبت باقاعدہ طے کر دی جائے۔ دعائے خیر کر دی جائے۔"

تکلم بیگم نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"جواد سے تو میں نے اس کی مرضی لے لی ہے۔ یہ ہماری پسند پر بے حد خوش ہے۔ پتہ ہے کیوں؟" اب وہ خوشی اور شرارت سے مسکراتی ہوئیں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

"یہ تمہارا جواد بھائی! جو بظاہر تو ہر وقت موٹی موٹی کتابوں میں کھویا رہتا ہے۔ مگر اس کا دل کہیں اور کھو چکا ہے۔ بڑا ہی گھنا ہے یہ۔" وہ جیسے جیسے بتاتی جا رہی تھیں زید کو لگ رہا تھا اس کے جسم کا سارا خون برف ہوتا جا رہا ہو اور دھڑکنیں یخ ہو کر کانپنے لگی ہوں۔

"یہ پتہ نہیں کب سے اپنی آنکھوں میں اس کے خواب سجائے بیٹھا تھا مگر مجال ہے جو کبھی اپنی ماں سے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ اب اگر ترنم اپنی بیٹی کے لیے کسی اور کو پسند کر لیتیں اور کسی روز ہمیں یہ خوشخبری سنانے آ جاتیں تو بھلا ہم کیا کر لیتے اور یہ خود کیا کر لیتا؟ اُف مجھے تو

اس خیال کے ساتھ ہی جھرجھری آتی ہے۔" وہ جواد کی طرف مصنوعی ناراضگی سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

"سوری امی جان۔" جواد نے فٹ سے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑتے ہوئے کہا۔

"سوری کیا...... بتاؤ ناں...... اگر ایسا ہو جاتا تو؟" وہ اسی دھیمی مسکراہٹ والے غصے سے بولیں۔

"مما جان! اب خالہ جان نے کیا کہا؟" وہ اپنا اور عیون کا نام تو شاید سن ہی نہ سکا تھا اس لیے اس کے جذبات پر کسی خوشی کا اثر نہ تھا بلکہ وہاں تو سخت پریشانی کا بوجھ پڑا تھا۔

"ترنم نے......" تکلم بیگم نے ذرا ترچھی نگاہ سے جواد کو دیکھا اور پھر زید کو جس میں خوشی اور خود اعتمادی دونوں واضح تھیں۔

"اسے بھلا میرے جواد سے بڑھ کر کوئی کہاں ملے گا؟ وہ بھی خوش ہے۔" انہوں نے اپنے خوبصورت اور لائق بیٹے کو نظروں میں بھرتے ہوئے فخر سے کہا۔

"اور زائرہ......؟" اس کی ٹھنڈی برف سانسیں سینے میں گر گئیں۔

"زائرہ کو بھلا کیا اعتراض ہوگا؟" بیگم تکلم پورے اعتماد سے بولیں۔

"پھر بھی امی جان اس سے پوچھنا تو چاہیے۔" بمشکل اس کی آواز نکل رہی تھی۔

"وہ کیا کہے گی بھلا...... ہماری بچیاں والدین کے فیصلوں سے ہی راضی رہتی ہیں۔" ان کا اعتماد بدستور قائم تھا۔

"مما ہو سکتا ہے وہ خود کسی اور پسند کرتی ہو۔" اس نے ایک لمبی سانس کے ساتھ اپنے سینے میں گڑی برف کی ایک برچھی کھینچی اور خود کی ہمت پر دے ماری...... وہ جانتا تھا اس کی یہ بات مما کے ساتھ ساتھ جواد بھائی کے دل کو بھی ناگوار گزرے گا۔

"پاگل ہو گئے ہو تم...... کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔" اس کی امی اس پر شاکی ہو گئیں۔ ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"خبردار آئندہ ایسی بات مت کرنا۔"

"امی جان! امی! آپ میری بات کو غلط مت سمجھیں میرا کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ لڑکیوں کو ان کی شادی کے موقع پر پسند ناپسند کا حق ہمارا دین دیتا ہے اس لیے انہیں پوچھنا چاہیے۔" اس نے بات کو سنبھالتے ہوئے بڑے پیارے انداز سے کہا۔

"ہاں امی جان زید کی بات ٹھیک ہے۔" جواد کے چہرے پر بھی کچھ پریشانی نظر آنے

لگی۔

"اس لڑکے کا تو دماغ چل گیا ہے۔تم خواہ مخواہ کے وہم مت کرو۔" وہ اسے گھورتی ہوئیں جواد کو پکارنے لگیں۔

"پھر بھی مما آپ خالہ جان سے کہیں وہ زائرہ کو مزید پوچھ لیں۔" جواد نے اداسی سے کہا اور مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"جواد...... جو جی...... جو جی...... سنو تو...... میرے بچے۔" تکلم بیگم بیٹے کو پریشان ہو کر جاتا دیکھ کر اس کے پیچھے لپکیں۔لمحہ بھر رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"جاؤ اب تم خود ہی جا کر اس سے پوچھو اور پھر مجھے آ کر بتا دینا۔" ان کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ ایسا سخت ناراضگی میں کہہ رہی ہیں۔

"میں آپ کو کیسے بتاؤں امی جان...... کیسے سمجھاؤں۔" وہ اپنی بے بسی پر رو دینے کو تھا۔ٹھیک ہے اب میں ہی اس سے بات کروں گا یہ سوچ کر وہ اپنی خالہ جان کے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔



"تارہ آپی!" وہ ترنم خالہ کی طرف سے لوٹا تو بے حد تھکا تھکا اور پریشان تھا۔

"ارے تم...... زید! آؤ ناں دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟" وہ جو کپڑوں کی الماری کھولے کھڑی احمد کے لیے شلوار قمیص نکال رہی تھی اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر اس کی طرف بڑھی۔

"آپی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔" وہ اداس اور پریشان سا اندر آ گیا۔

"ایک کیا سو باتیں کرو...... مگر یہ کیا منہ لٹکائے ہوئے ہو۔خیر تو ہے۔" وہ اسے اداس دیکھ کر چھیڑنے لگی۔

"اچھا بیٹھو تم یہاں......" اس نے اسے کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔

"اب کہو کیا بات ہے؟" وہ اسے حوصلہ دینے کو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئی۔

"یہاں نہیں...... مجھے آپ سے بے حد سیریس بات کرنی ہے کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہیں؟" وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔

"کہیں باہر...... کیوں...... ایسی کیا بات ہے؟" اب وہ بھی کچھ پریشان ہو گئی اس ہر لمحہ

کے ہنسنے اور شرارت کرنے والے کے چہرے پر اس وقت سچ مچ بڑی سنجیدگی تھی۔وہ کسی بات کو لے کر واقعی پریشان تھا۔

"آپ چلیں تو؟" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلنے کو کہا۔

"زید! زید! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔یہاں بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔" ستارہ نے اسے دوبارہ سے کرسی پر بٹھا دیا۔

"ہم یہاں پر زیادہ آسانی سے بات کر سکتے ہیں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپا! آپ کو میں کیا بتاؤں میں کتنا پریشان ہوں۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"پتہ ہے آپ کے جانے کے بعد میں کس قدر تنہا اور پریشان ہو گیا تھا۔میں نے آپ کے واپس آنے کا اک اک پل گن گن کر گزارا ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"کیا...... کیا ہوا...... مجھے بتاؤ۔" وہ بڑے پیار سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔

"آپا! میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔مجھے آپ کی مدد درکار ہے پلیز میرا ساتھ دیں۔" وہ اس کی محبت پا کر بکھرنے لگا وہ سارا درد ساری پریشانی جو وہ اب تک تنہا برداشت کر رہا تھا اس کے ساتھ بانٹنے بیٹھا تو ایک معصوم بچہ بن گیا۔وہی چھوٹا سا بھولا سا بچہ جو جب کبھی کسی سے پٹ کر آیا۔یا اس کی چیز کوئی اور چھین لیتا تو وہ سیدھا اسی کے پاس آ کر روتا۔اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنی بات بتاتا۔شکایات کسی کی بھی ہوتی اس کو لگاتا۔ان دونوں کی عمروں میں بھی کچھ زیادہ فرق نہ تھا ستارہ اس سے یہی کوئی پانچ برس بڑی ہوگی مگر وہ اس کے لیے اس وقت اپنی مما جان سے بھی بزرگ ہوتی تھی۔اس کی بچپن سے یہی عادت تھی کہ اگر اس نے اپنی کوئی فرمائش منوانی ہوتی تھی تو سیدھا دادا جان سے کہتا تھا۔مگر دوسروں کے شکوے شکایات اور اپنے دکھ درد ستارہ کے ساتھ ہی بانٹتا تھا۔

"آپا! وہ زائرہ...... زائرہ......" اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ اصل بات کو کہاں سے شروع کرے۔"

"زائرہ...... ! کیا ہوا زائرہ کو...... کیا تم سے اس کا پھر جھگڑا ہو گیا۔" ستارہ سمجھی کہ پھر ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا ہے۔

"آپا! زائرہ...... اچھا نہیں کر رہی۔آپ اسے سمجھائیں۔" اس نے خود کو نارمل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اچھا...... اچھا میں سمجھاؤں گی۔مگر ہوا کیا؟" وہ اب تک وہی سمجھ رہی تھی کہ یہ دونوں

کسی بات پر الجھے ہوں گے۔

"اس کا افیئر چل رہا ہے؟" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"افیئر......" ستارہ کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

"ہاں......اور وہ......" وہ اس کے قریب ہو کر سرگوشی کرتے ہوئے بولا کہ کہیں اس کی آواز کسی تیسرے تک نہ پہنچ جائے۔

"اوہ ہیلو......اوں......ہوں......ہوں......" اچانک ہی احمد نے کھنکارتے ہوئے کہا۔ وہ باتھ روم میں تھا اور ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا۔

"اوہ احمد بھائی! آپ......" وہ ایک دم سے انہیں دیکھ کر گھبرا گیا اور کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"جی......میں احمد حسن......کیوں آپ کو یہاں میری توقع نہ تھی۔" وہ بظاہر تو مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجے کی چبھن چھپ نہ رہی تھی۔

"اوہ سوری احمد! میں تو بھول ہی گئی کہ میں نے آپ کو کپڑے دینے تھے۔" ستارہ شرمندگی سے ہو کر الماری کی طرف بڑھی۔ وہ واقعی بھول گئی تھی ورنہ اس کے آنے سے پہلے وہ احمد کے لیے کپڑے ہی تو نکال رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اس کے آ جانے پر تمہیں پہلے کب کچھ یاد رہتا ہے۔" وہ زید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا دباؤ ڈالتا ہوا کہہ رہا تھا۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ کا بھی دباؤ تھا۔ زید کھسیانا سا ہو کر اٹھ گیا۔

"سوری بھائی مجھے خبر نہ تھی کہ آپ باتھ روم میں ہیں ورنہ میں......"

"ورنہ تم یقیناً نہ آتے۔" اس نے اس کا ادھورا جواب اچک کر پورا کر دیا۔

"بیٹھو......بیٹھو......میں تو بس نکل ہی رہا تھا۔ مجھے تو کہیں کام سے جانا تھا۔" اس نے اسے دوبارہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"احمد! آپ کے کپڑے......" اتنے میں ستارہ نے اس کی شلوار قمیص ہینگر سے اتار کر اسے پیش کر دی۔

"بہت بہت شکریہ......" وہ مسکراتا ہوا اپنے کپڑے لے کر ڈریسنگ روم میں بڑھا۔

"زید! تم بیٹھو میں ذرا احمد کو تیار کر دوں انہیں کسی دوست سے ملنے جانا ہے ہم پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔" ستارہ نے سادگی سے کہا۔ مگر زید کو اپنے بھائی کی آنکھوں اور لہجے سے جو تاثر مل چکا تھا۔ وہ کچھ اچھا نہ تھا۔ اس لیے وہ مزید وہاں بیٹھنا نہ چاہتا تھا۔

"آپ! آپ بھائی کو تیار کریں۔ میرا کیا ہے پھر آ جاؤں گا۔" وہ جانے لگا۔

"مگر تم نے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی تھی۔" وہ اپنے اسی انداز میں پیار سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں ایسی بھی کوئی ضروری بات نہ تھی۔ پھر سہی۔" وہ اسے بہلانے کے سے انداز میں کہہ کر جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ مبادا وہ اسے روکنے پر مُصر نہ ہو جائے اور اس کا بھائی سچ مچ ناراض نہ ہو جائے۔

"اچھا سنو تو......" وہ پھر بھی اس کے پیچھے لپکی۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں اس سیاہ ڈائری کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ جسے وہ بار بار اس کی طرف بڑھاتا اور پھر پیچھے ہٹا لیتا تھا۔

"ہاں یہ......یہ آپ رکھ لیں اور اسے پہلے پڑھ لیں۔ ہم پھر بات کریں گے۔" اس نے بالآخر وہ ڈائری ستارہ کی طرف بڑھا ہی دی۔

"ایسا کیا ہے اس میں؟" وہ ڈائری لیتے ہوئے پریشان تھی۔

"آپ خود پڑھ لیں۔ میرا خیال ہے میں جو آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ وہ آپ کو اسے پڑھ کر معلوم ہو جائے گا۔" وہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد پریشان بھی تھا۔ "اور ہاں اسے بہت سنبھال کر رکھیے گا میں آپ سے کل لے لوں گا۔ احمد بھائی کے ہاتھ آ گئی تو بہت بُرا ہو گا۔" اس نے جاتے جاتے احتیاطاً کہا۔

"اچھا اچھا......میں ابھی فارغ ہو کر آتی ہوں۔ تم زیادہ پریشان مت ہو۔" اس نے دلاسہ دیتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔ جس پر وہ "جی اچھا" کہہ کر چلا گیا۔



"بابا دیکھیں ناں اماں کو مجھے جانے کی اجازت دے ہی نہیں رہیں۔"

زائرہ جو پچھلے دو گھنٹوں سے اپنی ماں کو کالج کے پکنک ڈے پر جانے کے لیے منا رہی تھی اور وہ مان ہی نہ رہی تھیں۔ عمیس جیلانی کو دیکھتے ہی وہ بڑے لاڈ سے باپ کی طرف بڑھی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی۔

"کہاں جا رہا ہے آپ کا کالج؟" وہ اچھے موڈ میں تھے اس لیے مسکرا کر پوچھنے لگے۔

"یہیں قریب ہی۔ چھانگا مانگا اور کہاں؟" وہ اسی ادا سے اٹھلا کر بولی۔

"اچھا واپسی کب ہو گی؟" انہوں نے اس کی بانہیں اپنے گلے سے نکال کر اس کا ہاتھ تھاما اور صوفے پر آ بیٹھے۔

"شام تک واپس آجائیں گے بابا۔"

"میں نے کہہ دیا ناں کہ کوئی ضرورت نہیں کسی ٹرپ ورپ پر جانے کی اور چھانگا مانگا میں ایسی اب کیا نئی بات ہوگئی۔ وہی برسوں پہلے والا جس کا مارا جنگل ہے جہاں تم لوگ کئی بار جا چکے ہو۔" ترنم بیگم جو اپنے شوہر کو دیکھتے ہی ان کے لیے سلیپر اور تولیہ وغیرہ لینے چل دی تھیں سلیپر ان کے پاؤں کے پاس رکھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"ہاں بیٹا یہ تو ہے۔ چھانگا مانگا میں کیا خاص رکھا ہے۔" عمیس میاں نے بیوی کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے اپنے جوتے اتار کر سلیپر پہنے۔

"بابا پلیز...... ہماری کلاس کے سبھی سیکشن جا رہے ہیں۔ ساری فرینڈز اور میں؟ بابا! سوچیں ذرا میرا کیسا بُرا امپریشن پڑے گا۔" اس نے بڑی معصوم سی شکل بنا کر آواز بھی گلوگیر بنا لی جیسے ابھی رو دے گی۔

"اچھا...... اچھا چلی جاؤ اور یہ بات بات پر رونی شکل مت بنایا کرو۔" وہ جو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ زائرہ کو چاہتے تھے فوراً ہی مان گئے وہ اسے اداس نہ دیکھ سکتے تھے۔

"عمیس صاحب! یہ آپ اچھا نہیں کرتے میں جس بات سے منع کرتی ہوں آپ وہ مان لیتے ہیں۔ اسی لیے یہ ضدی اور خودسر ہوتی جا رہی ہے۔" ترنم بیگم اپنے شوہر سے کچھ ناراض ہوگئیں۔ جس پر وہ ہنس کر بولے۔

"بھئی میں کیا کروں۔ یہ مجھے پیاری ہی بہت ہے۔" انہوں نے زائرہ کو پیار سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹیوں کو اتنا لاڈ پیار نہیں دیتے کہ ان کی تربیت کا نقص بن جائے۔" وہ بدستور خفا تھیں۔

"اچھا بابا! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاؤں۔" اس نے اپنی ماں کی خشمگیں نگاہوں سے بچنے کی راہ نکالی۔

"ہاں بھئی ضرور ویسے بھی تمہارے ہاتھ کی چائے تو بہت دنوں سے نہیں پی۔" وہ خوش ہو کر بولے۔

"کئی دنوں سے اسے آپ کے ساتھ کوئی کام بھی تو نہیں پڑا تھا۔" ترنم بیگم جو اس کی عادت سے اچھی طرح واقف تھیں کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈ تبھی کرتی ہے جب اسے کوئی مطلب نکلوانا ہو۔ ذرا طنز سے بولیں۔

"بس کرو ترنم! کیا ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" عمیس جیلانی نے بُرا مناتے

ہوئے کہا۔ وہ سب بچوں کے معاملات میں ایسے نہیں تھے۔ بلکہ صرف زائرہ کے معاملے میں ترنم بیگم کی نہ سنتے تھے۔ جبکہ ردا اور رمیض بے چارے تو ہر وقت ان کی ڈانٹ ہی کھاتے رہتے تھے۔ زائرہ چونکہ پڑھائی میں بے حد اچھی تھی ذہین تھی۔ اس لیے ان کی لاڈلی تھی۔ وہ تو کہا کرتے تھے۔

"دیکھ لینا تم...... یہی زائرہ میرا ہاتھ بٹائے گی۔ یہی سنبھالے گی میرا بزنس...... تمہارا نالائق بیٹا تو کسی کام آتا نظر نہیں آتا۔"

"بابا...... چائے!" وہ چائے کا کپ باپ کی طرف بڑھاتی ہوئی بے حد خوش تھی۔

"اب میں جاؤں جا کر تیاری کروں۔ کل علی الصبح کالج کے لیے نکلنا ہوگا وہیں سے کالج بسیں سب کو لے کر جائیں گی۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے جانے کی اجازت طلب کی۔

"ہاں...... ہاں جا کر آرام کرو اور ہاں سنو۔" انہوں نے چائے کا کپ ایک طرف رکھ کر اپنا پرس نکالا۔

"جی بابا......" وہ بڑی سعادت مندی سے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ رکھ لو۔" انہوں نے دو ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"اتنے روپے! اتنے کیا کرے گی یہ۔" ترنم بیگم نے فوراً میاں کو ٹوکا۔ زائرہ کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا جس پر عمیس میاں نے بیوی کو گھور کر دیکھا۔

"تم رکھ لو بیٹا! تمہاری ماں کو تو عادت ہے۔"

"جی بابا......" اس نے فوراً روپے پکڑے اور پھر سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تھینک یو بابا...... آئی لو یو۔"

وہ خوش ہو کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی اور ترنم بیگم بڑبڑاتی ہی رہ گئیں جس کا نوٹس زائرہ کی طرح عمیس جیلانی بھی نہیں لیتے تھے۔



آج دوپہر کے کھانے پر جیلانی خاندان کے سارے بڑے جمع تھے آج کا کھانا بڑے ڈائننگ ہال میں لگایا گیا تھا۔ انیس اور تکلم، عمیس اور ترنم آمنے سامنے کی کرسیوں پر تھے۔ ان کے ساتھ اسی طرح آمنے سامنے ایک طرف شبانہ اور یوسف جبکہ دوسری طرف شاہانہ اور معاذ...... اور ان سارے بڑوں میں آج ایک نئے بیاہتا جوڑے کا بھی اضافہ تھا جو اب

خاندانی مشاورت کا اہم حصہ بن چکا تھا یعنی ستارہ اور احمد حسن...... آج کے کھانے بھی گھر کی خواتین کی بجائے خانساماں نے بنائے تھے۔ نور جیلانی صاحب نے رات کو ہی خانساماں کو بلا کر سمجھا دیا تھا کہ کیا پکے گا۔ وہ اپنی بہوؤں اور بیٹیوں کو آج باورچی خانے میں الجھانے کی بجائے چاہتے تھے کہ وہ بے فکری اور خوشی کے ساتھ یہ ایک وقت کا کھانا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں۔

کھانے کے دوران سب کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ میاں جی نے سب کے کاروباری حالات کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے ستارہ کی شادی سے تقریباً چھ ماہ قبل ہی اپنے بچوں کے کاروبار علیحدہ علیحدہ کر دیئے تھے اور جائیداد کی وراثت کے کاغذات بھی تیار کروا لیے تھے اور اب اپنے باقی بچوں کے معاملات طے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اللہ کے گھر پر جا کر گزارنا چاہتے تھے۔ ویسے تو وہ تقریباً ہر سال عمرے کے لیے ضرور جاتے تھے مگر حج انہوں نے ابھی تک ایک ہی کیا تھا۔ اب وہ دوسرا حج کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

کھانا بڑے ہی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ بعد میں وہ لوگ اپنے اس مشترکہ سٹنگ روم میں آ گئے جہاں پر نرم و گداز قالینوں پر بڑے چھوٹے بے شمار کشن دھرے رہتے تھے۔ یہاں پر جیلانی خاندان کے بڑے خوشی یا غمی کے مواقع پر اکٹھے ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔ ستارہ کی مہندی کے بعد آج یہ کانفرنس ہال دوبارہ آباد ہوا تھا۔

چائے وقہوے کے دوران نور محمد جیلانی صاحب نے اصل بات شروع کی۔

''میرے بچو! آج ہم لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں اس بارے میں میرا خیال ہے مجھے تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری بی بی جان نے میرا پیغام تو تم لوگوں تک پہلے سے پہنچا ہی دیا تھا۔''

وہ اپنے بچوں کے چہرے غور سے دیکھتے ہوئے بول رہے تھے کہ کس کے چہرے پر کیا تاثرات ہیں۔ باقی سب کے چہرے تو اطمینان اور خوشی سے دمک رہے تھے۔ ایک عمیس ہی کو وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پا رہے تھے۔ جس پر وہ پریشان ہونے کی بجائے مسکرا دیئے۔

''ہاں بھئی معاذ بیٹا! سب سے پہلے آپ بتایئے۔ آپ کو میرے خیال سے اتفاق ہے یا نہیں؟'' انہوں نے اپنے بڑے داماد کو سب سے پہلے عزت دیتے ہوئے بات ان سے شروع کی۔

''جی میاں جی...... جیسے آپ چاہیں۔'' انہوں نے پوری پوری سعادت مندی سے

جواب دیا۔

''جی میاں جی کیا...... بھئی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرو اگر تمہارے کچھ تحفظات ہیں تو ان کا بھی ذکر کرو۔ آخر کو بیٹی والے ہو۔ بیٹیاں ایسے ہی تو کسی کی جھولی میں نہیں ڈال دیتے۔ بے حد حساس معاملات ہوتے ہیں یہ۔'' وہ ان کی سعادت مندی پر خوش تو تھے مگر وہ یہ بھی ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے محض ان کی خوشی کی خاطر اپنے بچوں کی زندگیاں قربان کر دیں۔

''میاں جی! زید میرے لیے اپنے بچے کی طرح سے ہی ہے اور مجھے بے حد پسند بھی ہے۔'' معاذ جیلانی نے دل سے کہا۔ انہوں نے تو بہت پہلے سے یہ بات اپنے دل میں سوچ رکھی تھی کہ وہ اپنی عیون کا ہاتھ زید کے ہاتھ میں ہی دیں گے۔ انہیں زید کے اندر ایک بے حد ہمدرد اور محبت کرنے والا انسان دکھائی دیتا تھا اور پھر وہ طبیعت کا بے حد سادہ تھا۔

''سوچ لو اچھی طرح سے زید کی طبیعت بہت لاابالی سی ہے اور وہ پڑھائی میں بھی بس گزارے لائق ہی ہے۔'' عمیس میاں نے زید کے بارے میں اپنی رائے دینی ضروری سمجھی جس پر میاں جی کے ساتھ ساتھ سبھی کو اچھا نہ لگا۔ ستارہ کو اچھی خاصی تکلیف ہوئی اس کا دل زید کے لیے ایسے خیالات سن کر دکھی ہو گیا تھا۔

''گستاخی معاف...... ماموں جان! آپ کو زید کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہو سکتی ہے ورنہ زید کی عادتیں تو سب سے اچھی ہیں۔ وہ تو بے حد پیار کرنے والا ہے۔'' ستارہ نے بڑی تہذیب سے اپنے ماموں جان کی بات کا جواب دیا۔

''آپ بڑوں کو بات کرنے دیں۔ وہ بہتر جانتے ہیں۔'' احمد حسن نے اپنی بیوی کو صفائیاں دینے سے منع کر دیا۔

''ارے کہنے دو بیٹا...... یہاں سب کو رائے دینے کا حق ہے۔ اسی لیے تو ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ مشاورت کا مطلب بھی اک دوجے کو ایمانداری سے اچھا برا بتانا ہے۔'' طاہرہ بیگم نے اپنی نواسی کا اُترا ہوا منہ دیکھ کر فوراً بات کو سنبھالا۔

''اچھا تم کہو شاہانہ...... تمہارا کیا خیال ہے۔ تم بیٹی کی ماں ہو۔'' نور محمد صاحب نے بیٹی کو چپ چاپ پا کر اس سے بولنے کو کہا۔

''جی ابا جان...... مجھے بھی معاذ سے اتفاق ہے۔ ہمیں عیون کے لیے زید کے بارے میں ذرا بھی فکر نہیں۔ وہ دونوں یقیناً خوش رہیں گے۔'' شاہانہ بیگم تو اپنی بیٹی کے دل کی بات جانتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے دیئے انہوں نے زید کے نام پر جگمگاتے ہزار بار دیکھے تھے

اور زید کی لاپروائیوں اور لاابالی پن کے اندر بھی عیون کی طرف اک خاص کھچاؤ ان کی نظروں سے کبھی پوشیدہ نہ رہا تھا۔

''اور اسیس میاں تم کیا کہتے ہو؟ آخر کو تم بیٹے والے ہو۔ تمہارا حق اپنی جگہ پر زیادہ اور اہم ہے۔'' داماد اور بیٹی سے پوچھنے کے بعد میاں جی بیٹے اور بہو کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ابا جان! ہم ہوں یا ہمارے بچے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ہم پر آپ کا ہی حق ہے اور خاندانی فیصلوں کا سارا اختیار آپ کو حاصل ہے۔ جو آپ کہیں ہمارے لیے اس سے بہتر کیا ہوگا؟''

اسیس میاں نہایت محبت سے بولے وہ ایسے ہی جذبات سچ مچ اپنے والدین کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ انہیں اپنے والدین سے بے حد محبت تھی۔ وہ شروع سے اتنے ہی فرمانبردار تھے۔ نہ انہیں احمد اور ستارہ کے معاملے پر کچھ اعتراض تھا۔ نہ اب جواد اور زید کے مسئلوں پر۔

''معاف کیجیے گا بھائی جان! یہ بچے کے مستقبل اور عمر بھر کے معاملات ہیں۔'' عمیس جیلانی کو ان کی یہ فرمانبرداری جانے کیوں خوشامد دکھائی دیا کرتی تھی وہ پتہ نہیں کیوں ایسی وہمی طبیعت کے تھے۔ دوسروں کے جذبات پر شک معاملات پر شک۔ انہیں یہ وہم بھی یقین کی حد تک تھا کہ شاید نور محمد جیلانی نے اسیس کو ان سے زیادہ روپیہ اور جائیداد دی ہے۔ وہ اکثر اس کی ٹوہ میں لگے بھی رہتے تھے حالانکہ ترنم انہیں ہر طرح سے سمجھاتی تھیں کہ ایسا نہیں ہے۔

''ہمارے بچے ہمارے والدین کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں تو پھر فیصلے بھی یہی اچھے کر سکتے ہیں نا کہ ہم......'' اسیس نے مسکراتے ہوئے اپنے بھائی کو جواب دیا۔

''یعنی میں زید اور عیون کی بات پکی سمجھوں؟'' میاں جی نے پھر بھی اپنی تسلی کرنی ضروری سمجھی۔

''جی بے فکر ہو کر۔ اب یہ بچے اس نسبت میں بندھے سمجھیے۔'' معاذ جیلانی نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''اچھا شاہانہ بیٹی تم نے عیون کا عندیہ تو لے لیا تھا۔'' طاہرہ بیگم نے اپنی فکر دور کرنے کو پوچھا۔

''جی امی جان...... آپ بے فکر رہیے وہ اس فیصلے سے بے حد خوش ہے۔'' شاہانہ نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوری سچائی سے کہا۔

''شکر ہے رب کریم کا۔'' وہ آسودگی سے بولیں۔

''مبارک ہو میرے بچو۔ اللہ پاک اس رشتے سے راضی ہو اور بچوں کے نصیب اچھے کرے۔'' میاں جی نے خوش ہو کر مبارکباد اور دعا دی۔ جس پر ستارہ کا چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی بھاگ کر جائے اور عیون کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لے اور زید...... زید کو تو وہ خوب ستائے۔ کچھ دیر تک تو بتائے ہی نہ کہ اندر کیا فیصلہ ہوا۔ وہ دل ہی دل میں ایسا کر کے لطف اندوز ہونے لگی۔

''ہاں تو عمیس میاں اب آپ کی باری ہے دل کھول کر اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کریں۔'' نور محمد جیلانی صاحب نے عمیس کو اشارہ دیا کہ وہ زائرہ اور جواد کے رشتے پر کچھ کہیں۔

''ابا جان! میں تو ان باتوں کو فی الحال قبل از وقت ہی سمجھ رہا ہوں ابھی تو کسی کا بھی مستقبل واضح نہیں ہوا۔''

انہوں نے تو سیدھا سیدھا کہہ دیا حالانکہ ترنم بیگم انہیں کتنا سمجھا کر اور کیسے طوطے کی طرح رٹا کر لائی تھیں کہ جواد کے معاملے پر کچھ بھی سوچنے یا اٹکل ڈالنے کی ضرورت نہیں مگر عمیس میاں کب سیدھی بات کرنا جانتے تھے جو اب کرتے۔

''یعنی تم رشتوں کی بنیاد محبتوں پر نہیں رکھنا چاہتے بلکہ مادی وضع قطع ہی تمہارا معیارِ انتخاب ہے۔''

اب میاں صاحب بھی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے وہ عمیس کی طبیعت آج ذرا صاف کرنا چاہتے تھے۔

''تو چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے انداز سے ہی بات شروع کر لیتے ہیں۔'' وہ ذرا سا ٹھہرے ان کی طرف اپنی خشمگیں نگاہیں اٹھائیں اور پھر اپنی بات پوری رکھی۔

''جواد ایک انتہائی محنتی اور ذہین بچہ ہے سول انجینئرنگ میں فائنل ایئر کا طالب علم ہے۔ اب تک کے تعلیمی ریکارڈ کے مطابق ہمیشہ اول رہا ہے اسکالرشپ پر ملک کی بہترین یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔''

''بس کریں جیلانی صاحب آپ کیا بچے کے ساتھ بچہ بن رہے ہیں۔'' طاہرہ بیگم نے ماحول کو انتہائی سنجیدہ ہی ہوتا دیکھ کر انہیں ٹہوکا دیا۔

''بیگم آپ ہمیں بولنے دیں۔ ہم اس وقت اپنے پوتے کا رشتہ لے کر آئے ہیں اس کی خوبیاں تو گنوا لیں۔'' جیلانی صاحب نے بیوی کو بھی کچھ کہنے سے روک دیا۔

"ہاں تو میاں ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے بچے کو اللہ تعالیٰ نے بہترین اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مردانہ وجاہت سے بھی خوب نوازا ہے اور ہاں سب سے بڑی بات۔ ہمارے بچے کا خاندانی پس منظر بڑا بے داغ اور اعلیٰ ہے اور اس کی رگوں میں وہی خون ہے جو آپ کی رگوں میں ہے۔ اب اگر آپ کو مزید تسلی کرنی ہو تو اپنے گریبان میں جھانک لیجیے۔" انہوں نے آخری فقرات کو بہت دبا دبا کر ادا کیا۔ جس میں چھپا ہوا طنز عمیس میاں کے ماتھے پر پسینہ بن کر پھوٹ نکلا۔

"ابا جان! میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔" انہوں نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ٹشو پیپر سے اپنی پیشانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب سیدھا سیدھا جواب دو۔ تمہاری کیا مرضی ہے؟" ان کا موڈ کچھ اچھا نہ رہا تھا خفگی ان کے انداز سے نمایاں تھی۔

"ابا جان! ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو گیا۔ یہ تو بس ایسے ہی کہتے رہتے ہیں آپ ان کی عادت سے واقف تو ہیں۔" ترنم بیگم نے ماحول کو اچھا کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے میاں جی سے کہا۔

"بہو! ہم آپ سے خفا نہیں ہیں۔ ہم اپنے بیٹے کا جواب چاہتے ہیں۔" انہوں نے ترنم بیگم کو پیار سے جواب دیتے ہوئے عمیس میاں سے جواب طلب کیا۔

"مجھے...... مجھے جواد پر کب اعتراض ہے میں تو کہہ رہا تھا کہ زائرہ ابھی پڑھ رہی ہے وہ ذرا اپنی تعلیم مکمل کر لے۔" وہ بات کو بدلتے ہوئے بولے۔

"لڑکیوں کی اعلیٰ ڈگریوں سے زیادہ ضروری ہوتی ہے ان کی تربیت تاکہ وہ اگلے گھروں کو اپنی عقل مندی اور سلیقے سے چلا سکیں۔"

طاہرہ بیگم جو کافی دیر سے چپ تھیں انہوں نے باتوں میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! وہ اپنی گریجویشن مکمل کر لے تب شادی کر لیں گے۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔" تکلم بیگم نے ان کی پریشانی دور کرنے کو انہیں تسلی دی۔

"بھائی جان! وہ یونیورسٹی جانا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ کہ اسے ایم بی اے کراؤں گا۔" عمیس میاں نے ڈرتے ڈرتے اصل بات بتا ہی دی۔ وہ جانتے تھے ابا جان یونیورسٹی کے ذکر پر ناراض ہو جائیں گے مگر اس معاملے پر وہ ایسی بات چھپا بھی نہ سکتے تھے۔

"ارے تو پھر کیا ہوا یار! وہ شادی کے بعد یونیورسٹی جائے اور اپنا شوق ضرور پورا کرے

جواد اس کی مدد کرے گا۔ ہرگز اعتراض نہ کرے گا۔" انیس میاں نے بھائی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ جس پر میاں صاحب کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ دوبارہ آ گئی۔

"چلو اب تو ہو گئے تمہارے تحفظات دور، یا ابھی کچھ باقی ہے؟" وہ اپنے وہمی اور شکی بیٹے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ مبادا کوئی بال اس کے دل میں ابھی باقی نہ ہو جو کل کلاں کو آنکھوں میں چبھنے لگے۔

"ترنم! کیا تم نے زائرہ کو کھل کر پوچھ لیا تھا۔" تکلم بیگم کو زید کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی اس لیے وہ کچھ پریشان ہو کر بہن سے پوچھنے لگیں۔

"جی باجی! میں نے اسے پوچھ لیا تھا۔" ترنم بیگم باوجود کوشش کے اپنی آواز کی کپکپاہٹ چھپا نہ سکی تھیں کیونکہ وہ اس وقت صاف جھوٹ بول رہی تھیں انہیں تو مناسب موقع ہی نہ مل سکا تھا زائرہ سے بات کرنے کا۔ کیونکہ وہ جتنی بار بھی اس سے بات کرنے گئیں وہ انہیں مصروف ہی ملی۔ کبھی کمپیوٹر کے آگے بیٹھی اور کبھی اپنے موبائل پر آنکھیں ٹکائے انگلیوں سے ٹک ٹک کرتی اور آج...... آج جبکہ وہ پکا ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ اس سے لازمی بات کریں گی تو وہ اپنے ابا کے گلے میں بانہیں ڈال کر اجازت لے کر چھانگا مانگا چلی گئی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے ان بچوں کے لیے دعائے خیر کر لیتے ہیں اور میرا خیال ہے منگنی کی بجائے نکاح کی رسم اگلی جمعرات کو ادا کر دیں گے رخصتی کا پھر سوچیں گے۔ زائرہ اور جواد اپنے سالانہ امتحانات سے فارغ ہو لیں تو ان کی رخصتی کر دیں گے۔ زید اور عیون کو ابھی مزید وقت درکار ہوگا۔ بہرحال جو میرے رب رحمٰن کو منظور ہوگا خیر سے ہو جائے گا۔"

نور محمد جیلانی صاحب نے ان دو گھرانوں کو نئی نسل کے رشتوں میں باندھ کر ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب اور مضبوط کرنے کے اپنے اس خواب کو تعبیر پاتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

"شبانہ بیٹی! یوسف بیٹے! کچھ تم لوگ بھی کہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" طاہرہ بیگم نے انہیں دیکھ کر پیار سے پوچھا۔

"میں تو کہتی ہوں امی جان! یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔ ماشاء اللہ سے دو جوڑے کتنے پیارے لگیں گے۔"

شبانہ نے خوش دلی سے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا وہ واقعی بے حد خوش ہوئی۔ یوسف میاں بھی دل سے ان رشتوں پر راضی تھے۔

"ابا جان! میرے عادل کا بھی سوچئے گا۔" ساتھ ہی شبانہ نے اپنے بچوں کی طرف

بھی ان کی توجہ کروا دی۔

"تو کیا میں ان کی طرف سے غافل ہوں۔ پگلی! فکر نہ کر حج سے واپس آ کر میں عادل کے کان ہی پکڑنے والا ہوں۔" جیلانی صاحب نے پیار سے اپنی لاڈلی بیٹی کو تسلی دی۔

"جی ابا جان......" وہ خوش ہو کر مسکرا دی۔ پھر سب نے باری باری ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور ایک دوسرے سے گلے ملے۔ نور محمد جیلانی صاحب نے دعائے خیر کروائی۔ جس میں چاروں بچوں کے اچھے نصیبوں اور آپس میں پیار محبت سے نباہ کی دعا مانگی گئی۔ اس خاندان کے اتفاق و اتحاد، رزق میں برکت اور آپس میں سب کے دلوں میں اخلاص کے زندہ رہنے کی دعا بھی مانگی گئی۔ جس پر سب کے دلوں اور لبوں سے آمین اور ثم آمین نکلتا رہا۔



وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے زائرہ کے کالج گیٹ پر نظریں جمائے کھڑا تھا آج کالج کی لڑکیاں رنگین ملبوسات میں بنی سنوری آ رہی تھیں۔ کوئی گاڑیوں پر۔ کوئی رکشوں پر اور کوئی پیدل ہی آ رہی تھیں۔ کالج کے گیٹ پر بڑا رش تھا۔ ایسے میں پوری توجہ سے کسی ایک خاص چہرے کا انتظار بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ آج وہ اپنے دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا اور خاصا چھپ کر اسے چیک کر رہا تھا۔ اب تو اس پر نظر رکھنی اور بھی ضروری ہو گئی تھی۔ جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ دادا میاں جواد بھائی اور زائرہ کی نسبت طے کر رہے ہیں اس کے دل کا سکون اور آنکھوں کی نیند تو اور بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ کیا کرتا۔ ستارہ آپی کو ڈائری بھی دے آیا تھا لیکن انہوں نے بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ شاید انہوں نے ابھی تک وہ ڈائری پڑھی ہی نہ تھی۔ ورنہ وہ اس معاملے پر ترنم خالہ سے بات کرتیں۔ یا کم از کم زائرہ کو ہی سمجھاتیں۔ اسے آج بھی ڈر تھا کہ زائرہ ٹرپ کے بہانے پھر سے کہیں اور نہ چلی جائے۔

"مگر آج وہ ایسا نہ ہونے دے گا۔" وہ یہ تہیہ کیے کھڑا تھا جبھی وہ اپنی بیسٹ فرینڈ رامین کے ساتھ کالج گیٹ پر نظر آئی دونوں نے کالج گیٹ سے سر نکال کر اِدھر اُدھر جھانکا اور پھر واپس اندر چلی گئیں۔

"یہ...... یہ لڑکی سارے فساد کی جڑ ہے۔ اسی نے زائرہ کو خراب کیا ہے۔ میرے بس میں اگر ہو تو میں اسے شوٹ کر دوں۔" اس کے دل میں رامین کے لیے ایک دم سے نفرت بھر گئی۔ اسے ایسی حد سے زیادہ آزاد لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہ لگتی تھیں جیسی رامین تھی۔ شرم و حیا سے عاری۔

"خدا سمجھائے انہیں۔" اس نے بے زاری سے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے اس

کے حق میں دعا کی۔ دراصل وہ اس کے واہیات لباس کو دیکھ ہی نہ پا رہا تھا جو اس وقت اس نے پہن رکھا تھا۔

"پتہ نہیں یہ کالج کی پرنسپل ایسے لباس پہننے کی اجازت کیسے دے دیتی ہیں جب اساتذہ ہی اچھا بُرا نہ سمجھائیں گے اور پھر ہماری نوجوان نسل کا یہی حال ہو گا جو تعلیمی اداروں میں دکھائی دیتا ہے۔" وہ درس گاہوں کے تقدس کی اس قدر پامالی پر دکھی ہو گیا۔

"کاش...... کاش ہمارے بڑے سوچیں کہ انہیں کیا کرنا ہے؟" وہ دور کھڑا کڑھ رہا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ چست و مہین مغربی طرز کے لباس میں ملبوس ان لڑکیوں کو جو یقیناً اچھے گھرانوں کی عزتیں تھیں۔ مگر وہ حیران تھا کہ ان کے اچھے گھرانوں کو کیا ہو گیا جو ان کے والدین یا ان کے بھائی اپنے گھر کی بچیوں کے ایسے لباس پر غور نہیں کرتے کہ وہ آج کل ستر پوشی کی بجائے فیشن کی نمائش بن کر رہ گیا ہے۔ آدھی ننگی ٹانگیں، کھلے گریبان، بازوؤں سے آزاد تنگ و مہین قمیص۔ دوپٹے کی جگہ گلے میں جھولتے چیتھڑے یا رسیاں۔ شرم و حیاء کی میتوں پر کٹے پھٹے کفن۔ کیا ہو گیا تھا اس معاشرے کی پاکباز تہذیب کو؟

"ارے زید تم! اور یہاں......" بالکل اچانک ہی اس کے کندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ مار کے اس کے خیالات کو چکنا چور کر دیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اس کا کلاس فیلو بختیار تھا۔

"اوہ ہاں...... السلام علیکم...... کیسے ہو تم۔" وہ اس سے ملا کر گلے ملتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے ساتھ اس وقت پولیس یونیفارم میں ملبوس ایک بے حد شاندار پرسنالٹی والا کوئی اور بھی تھا جس کے کندھے پر لگے ہوئے سٹار بتا رہے تھے کہ وہ ڈی ایس پی ہے۔ ابھی وہ اسے حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا جبھی بختیار نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

"یہ میرے تایا زاد بھائی ہیں عبدالمالک پچھلے ہفتے ہی سیالکوٹ سے ٹرانسفر ہو کر یہاں جوائن کیا ہے۔"

"جی السلام علیکم...... آپ کیسے ہیں۔" وہ آگے بڑھ کر ان سے بھی گلے ملا۔

"بالکل ویسا ہی۔ جیسا جرائم زدہ ماحول میں اور زیادہ اضافہ ہونے پر لگ سکتا تھا میرا مطلب ہے یہ شہر جتنا بڑا ہے۔ اتنے ہی یہاں پر جرائم اور مسائل بھی زیادہ ہیں لہٰذا ڈیوٹی بھی سخت ہے۔" وہ بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"جی وہ تو ہے۔" اس سے مل کر زید کو اچھا لگا۔

"اچھا جی یہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں خیریت تو ہے۔" بختیار نے گرلز کالج کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"وہ......وہ...... میں اپنی کزن کو کالج ڈراپ کرنے آیا تھا آج ان کا کالج ٹرپ جانا تھا بس یونہی رک گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کالج کی بسیں نکل جائیں تو۔" اس سے جھوٹ نہ بولا گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اپنی تسلی کو یہاں کھڑا تھا تاکہ زائرہ کو اپنے سامنے کالج بس میں ہی جاتا دیکھ لے۔

"اچھی بات ہے۔ ذرا چیک اور کنٹرول رکھنا چاہیے۔ آج کل بڑا بُرا وقت چل رہا ہے۔" عبدالمالک نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے عمل کو سراہا۔

"یار! یہ جب سے موبائل فون اور انٹرنیٹ کی وبا پھیلی ہے ہمارا معاشرہ تعفن زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ان دجالی فتنوں نے تو ہماری نوجوان نسل کو بے حیائی اور بے راہ روی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔" وہ بڑے دکھ اور فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

"تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے گھروں کے اندر تک ان دونوں چیزوں کی موجودگی نے کتنا بڑا فساد مچا رکھا ہے۔ شرفاء کی بہنیں، بیٹیاں تک اس کی خباثتوں سے محفوظ نہیں رہیں۔ میرا تو آئے روز کا واسطہ ایسے گھناؤنے مسائل سے رہتا ہے۔"

وہ تفصیل سے بتا رہا تھا اور زید کو لگ رہا تھا کوئی گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل رہا ہو جو اس کی سماعتوں کو متاثر کرتا ہوا سیدھا اس کے دل پر پڑ رہا ہو۔

"جی...... جی جی...... آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ اندر ہی اندر کچا ہو رہا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے ان ڈی،ایس،پی صاحب کو اس کے گھر میں سلگنے والی اس آگ کا دھواں دکھائی دے گیا ہو۔

"اوہ سوری ینگ مین! آئی ایم لیٹ۔" عبدالمالک کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی تو وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

"اور ویسے بھی کالج کی ساری بسیں بھی اپنے روٹ پر نکل چکی ہیں۔" اس نے کالج گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ساری بسیں نکل گئیں۔" زید کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔ اسے تو ان کی باتوں میں یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟ لگتا ہے آپ کچھ بھول گئے تھے۔" عبدالمالک کی تفتیشی نظریں اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ چھپ نہ سکا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔ اب میں بھی چلوں گا مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔" وہ بھی اجازت مانگنے

لگا وہ ان کے سامنے زیادہ دیر کھڑا نہ ہونا چاہتا تھا عبدالمالک صاحب کی نظریں اسے مسلسل گھور رہی تھیں جن سے اب اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" وہ یقیناً چہرے پڑھنے کا ہنر رکھتا تھا اس کی کیفیت کو جان کر مسکرا دیا۔ اس نے آگے ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔

"اور ہاں...... یہ میرا کارڈ ہے۔ مسائل اور جرائم کے اس ماحول میں خدانخواستہ اگر کبھی کوئی پریشانی ہو تو اپنے بڑے بھائی کو یاد رکھنا۔" اس نے جاتے جاتے مڑ کر اپنا وزیٹنگ کارڈ جیب سے نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بہت ہی پیار سے بولا۔

"بڑا بھائی مطلب بڑا بھائی۔" اس نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنے الفاظ کو معنی دیئے۔

"جی شکریہ......" اس نے ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا اور کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

"گھر آیئے گا بختیار کے ساتھ۔ کچھ مہمان نوازی کا شرف بخشئے گا ہمیں بھی۔" وہ تہہ دل سے اسے گھر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اسے یہ شخص پہلی ہی ملاقات میں بہت اچھا اور اپنا اپنا سا لگا تھا۔

"ضرور......ضرور...... کسی روز پروگرام بنائیں گے۔" وہ بھی خوش دلی سے بولا۔

"خدا حافظ۔" بختیار نے بھی آگے بڑھ کر اس کے مصافحہ کیا اور اجازت لی۔

"خدا حافظ۔"

وہ بختیار اور عبدالمالک کو دوبارہ ملتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اور وہ اپنی گاڑی کی طرف۔



"رامین! آج مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے ساتھ وہ رکشے میں بیٹھ تو گئی تھی مگر اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔

"اوہ کم آن یار! تم ابھی تک ڈرپوک کی ڈرپوک ہی ہو۔" رامین نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری طرح اتنی بولڈ تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔" وہ اس کی بے فکری دیکھ کر ذرا طنز سے بولی۔

"تو بی بی کس نے کہا تھا محبت کرنے کو؟" وہ بھی ادھار رکھنے کی قائل نہ تھی جھٹ سے

بولی۔

"اپنے بس کی چیز ہوتی تو میں ہرگز نہ کرتی۔" وہ غمزدہ تھی۔

"اے مس...... خیر تو ہے؟" رامین نے بڑی فکرمندی سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا جہاں آج زردیاں چھا رہی تھیں مطلب وہ سچ مچ پریشان تھی۔

"رامین! یہ سب اچھا نہیں ہے غلط ہے۔"

"کیا...... کیا غلط ہے؟" اسے آج زائرہ کے انداز پر غصہ آ رہا تھا۔

"یہ اس طرح چھپ چھپ کر ملنا۔" وہ دبے دبے الفاظ میں کہہ رہی تھی کہ کہیں رکشے والا نہ سن لے مگر رامین کو ہرگز بھی اس کی پروا نہ تھی۔

"تو نہ ملو۔ اے بھائی ذرا رکشہ روکو۔" وہ تو ایک دم سے دھمکی پر اتر آئی۔

"رامین پلیز...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ اور بھی ہراساں ہوگئی کہ رامین بی بی کا جذباتی پن کہیں یہاں لبِ سڑک ہی کوئی تماشہ کھڑا نہ کر دے۔

"جی میڈم۔" رکشے والا بھی بڑا فرمانبردار تھا فٹ بریک مارتا ہوا پوچھنے لگا۔

"کیا یہیں اتریں گی؟"

"نہیں...... نہیں بھائی آپ چلیے۔ یہ تو بس ایسے ہی۔" زائرہ نے اپنے چہرے پر چادر کا کونہ اور سرکاتے ہوئے کہا۔ رامین کچھ نہ بولی وہ منہ بسور کے بیٹھ گئی تھی۔

"چلیں جی...... ہمارا کیا ہے۔ چلنے کو کہیں گی تو چل پڑیں گے رکنے کو کہیں گی تو رک جائیں گے۔" رکشے والا بیک ویو مرر میں اس پر نظریں جماتا ہوا عجیب انداز میں بولا۔ اسے بالکل اچھا نہ لگا مگر دل مسوس کر رہ گئی۔ کر بھی کیا سکتی تھی۔

"بس میں آج آخری بار جا رہی ہوں۔ دوٹوک بات کروں گی اس سے۔ بھیجتا ہے تو بھیجے اپنے گھر والوں کو ورنہ میں بھی نہیں ملوں گی دوبارہ۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑی آہستگی سے بڑبڑا رہی تھی۔ جسے رامین سن کر بھی نہ سننے کی ایکٹنگ کر رہی تھی اس کا منہ بدستور سوجا ہوا تھا۔

"بس بس یہیں روک دو۔" مطلوبہ مقام کو دیکھ کر اس نے پھر سے رکشے والے کو مخاطب کیا۔

"جی روک دیا یہ لیں۔" رکشے والا دانت نکالتا ہوا فری ہوتا ہوا بولا۔ وہ دونوں جلدی سے نیچے اتریں۔ رامین تو منہ پھیر کے کھڑی ہوگئی تھی زائرہ نے جلدی سے پرس میں سے سو کا نوٹ نکالا اور رکشے والے کی طرف بڑھا دیا جسے لیتے ہوئے اس نے بڑی ہی کمینگی سے اس

کے ہاتھ کو چھو لیا تھا۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا ایک تھپڑ کس کے اس کے گال پر رسید کر دے۔ مگر وہ کوئی بک بک کر کے یہاں لوگوں کی نظروں میں آنا نہ چاہتی تھی۔

"میڈم! چینج تو نہیں ہے میرے پاس۔" وہ بدستور خباثت سے اسے گھور رہا تھا۔

"رکھو اپنے پاس۔" وہ رامین کا ہاتھ کھینچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"دو ٹکے کا آدمی اور جرأت دیکھو اس کی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا سر پھاڑ دیتی۔" وہ سخت غصے میں تھی۔

"میڈم جی! دل تو دو ٹکے کے آدمی کا بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا تمہارے ان گاڑیوں والے بوائے فرینڈ کا ہوتا ہے۔"

اس نے شاید زائرہ کا جملہ سن لیا تھا اس لیے وہیں سے مخاطب کر کے بولا۔ جسے سن کر اس پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ زمین میں دھنسنے لگی۔

"اُف اتنی بے عزتی...... یہ...... یہ آدمی مجھے سمجھ کیا رہا ہے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں جیسی یہ مجھے سمجھ رہا ہے۔"

وہ دکھ اور بے بسی کے شعلوں میں گھر گئی۔ جی چاہا وہیں سے پلٹ جائے اور بھاگ کر اپنے گھر چلی جائے۔ دوبارہ کبھی باہر نہ نکلے۔ یا کم از کم رکشے میں تو کبھی بھی نہ بیٹھے۔ مگر محبت...... محبت اس کے قدم رکنے دے رہی تھی نہ پلٹنے۔ وہ خودبخود آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس گیٹ سے پھر اندر داخل ہوگئی جہاں سے وہ پچھلی بار بھی یہ کہتی ہوئی باہر نکلی تھی کہ اب کبھی دوبارہ یہاں نہ آؤں گی۔ مگر یہ دل کی لگی اس کے پیروں سے لپٹ چکی تھی۔



وہ کتنی دیر سے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبلوں کی درازیں الٹ پلٹ رہی تھی بار بار انہی جگہوں پر دوبارہ سے کچھ تلاش کرنے لگتی تھی جہاں وہ پہلے دیکھ چکی تھی۔ پھر پریشان ہو کر لحہ بھر کو بیٹھ جاتی۔ کچھ سوچتی اور پھر چیزیں اِدھر اُدھر کرنے لگتی۔ بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل...... اپنی رائٹنگ ٹیبل سب کی درازیں وہ اچھی طرح سے دیکھ چکی تھی اور اب اپنی وارڈ روب کھول کر اس میں ڈھونڈ رہی تھی۔

”کہاں گئی...... وہاں نہیں تو یہاں تو ہونی چاہیے تھی۔ اس روز جب زید میرے کمرے میں آیا تو میں یہیں پر تو تھی وارڈ روب سے احمد کے کپڑے نکال رہی تھی۔“ وہ کچھ یاد کرتی ہوئی خود سے کہہ رہی تھی۔

”اور جب وہ جا رہا تھا تو اس نے مجھے وہ ڈائری یہیں پر تو تھمائی تھی اور میں نے...... میں نے اسے سنبھال کر یہیں تو رکھا تھا۔“ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ روہانسی ہو گئی۔ مگر ڈائری تھی کہ کہیں پر بھی نہ مل رہی تھی۔ اس نے ہر جگہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی چیزیں تو کبھی بھی اپنی اس جگہ سے اِدھر اُدھر نہ ہوا کرتی تھیں جہاں وہ انہیں رکھا کرتی تھی۔ پھر یہ ڈائری کہاں گئی۔ وہ جیسے تھک ہار گئی۔

”کہیں احمد نے تو کہیں اور نہیں رکھ دی۔“ اسے یونہی ایک خیال سا آ گیا۔ مگر احمد نے کیوں ایسا کیا ہوگا۔ ان کے سامنے تو زید نے مجھے دی تھی۔ وہ میری چیزیں کیوں چھیڑیں گے۔ اس نے خود ہی اپنے خیال کو جھٹکا۔

”تو پھر زید...... ہاں زید نہ لے گیا ہو دوبارہ۔ میں نے بھی تو تین چار روز ہو گئے اسے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ زید کہہ رہا تھا میں فوراً وہ ڈائری پڑھوں۔ خدا جانے اس ڈائری میں کیا تھا۔“ وہ پریشان ہو کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا...... کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ احمد جو بظاہر تو کوئی بزنس میگزین پڑھ رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ ستارہ کی طرف ہی تھی۔

”وہ احمد! ایک ڈائری تھی سیاہ رنگ کی۔ آپ نے کہیں دیکھی ہے؟“

”سیاہ ڈائری؟“ اس نے میگزین سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر جما دیں۔

”جی......“ اسے ہلکی سی امید جاگی کہ شاید احمد نے وہ ڈائری کہیں دیکھی ہو۔

”نہیں۔“ احمد نے بڑا سپاٹ سا جواب دیا اور دوبارہ میگزین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”پتہ نہیں میری یادداشت خراب ہو گئی ہے کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔“ وہ خود سے کہہ رہی تھی۔

”ایسی کیا خاص ڈائری تھی جو تم اس طرح سے ہلکان ہو رہی ہو اسے ڈھونڈنے میں؟“ اس نے میگزین بند کر کے ایک طرف رکھا اور اس کا جائزہ غور سے لینے لگا۔

”خاص ہی ہو گی تبھی تو مجھے زید نے کہا تھا کہ بہت احتیاط سے رکھوں؟“ وہ اپنی پریشانی میں معصومیت سے کہے جا رہی تھی۔

”اور تم نے احتیاط سے کام نہیں لیا ہے نا؟“ وہ بظاہر تو نارمل سے انداز میں بات کر رہا تھا مگر اس کی آنکھیں رنگ بدل رہی تھیں۔

”اچھا تمہارے خیال میں اس ڈائری میں ایسا کیا ہوگا جو زید تمہیں لازمی پڑھانا چاہتا تھا۔“ وہ کچھ جاننے کی کوشش میں تھا۔

”میں تو ایسی لاپروا ہو گئی ہوں کہ میں نے تو اس روز کے بعد سوچا ہی نہیں کہ زید نے مجھے اسے پڑھنے کو کہا تھا۔ ٹھیک ہی کہتا ہے زید! میں واقعی اس کی طرف سے بہت لاپروا ہو گئی ہوں۔ اب اس کا خیال نہیں رکھتی۔“ وہ اپنے اسی انداز میں کہتی ہوئی خود کو کوس رہی تھی۔

”اچھا تو کیا پہلے تم اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ میرا مطلب ہے کتنا؟“ اس نے اس کا بیڈ پر دھرا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نرمی سے پوچھنے لگا۔

”احمد! مجھے زید بے حد عزیز ہے اور...... اور آپ نہیں جانتے وہ بظاہر کھلنڈرا اور لاپروا نظر آتا ہے مگر اندر سے بے حد حساس ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی زید کے بارے میں بتانے لگی۔

”لگتا ہے تم زید کو سب سے زیادہ سمجھتی ہو؟“

”آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اس گھر میں زید کو اگر کوئی سمجھتا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔“ وہ اپنی معصومیت سے بولی۔ جس پر احمد حسن کے چہرے پر کچھ لمحوں کو ناگواری کی چند اور لکیریں

گہری ہوگئیں۔ وہ اسے پیار سے دیکھتے دیکھتے گھورنے لگا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کے اٹھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

”اچھا مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا میں کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔“ اور ستارہ اٹھ کر پھر سے وہ ڈائری ڈھونڈنے لگی۔ جو اس کے کورے اور بے داغ کردار پر سیاہی ملنے والی تھی۔



وہ گیٹ سے داخل ہوئیں تو زائرہ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے سُست پڑنے لگے۔

”اب چلو بھی۔“ رامین نے اسے رکتے دیکھ کر اس کا ہاتھ کھینچا۔ جس پر وہ مرے مرے قدموں سے لیونگ روم میں داخل ہوگئی۔

”آیئے آیئے ویلکم۔“ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں کارنش بجاتا اور دانت نکالتا ہوا۔ وہ جو کہنے کو تو حسان کا دوست تھا مگر لگتا نہ تھا حسان کو بھی پتہ نہیں کیا تھا وہ اسی کے گھر پر ملنے کو ترجیح دیتا تھا کہتا تھا یہ سب سے محفوظ جگہ ہے جہاں ہم جتنی بھی دیر بیٹھے رہیں ہمیں نہ تو کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی ڈسٹرب کر سکتا ہے۔ یہاں تک اس کی بات درست تھی اور دل کو بھی لگتی تھی لیکن اس کا یہ دوست بہت پُراسرار اور عجیب سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیوں بڑی غلاظت نظر آتی تھی جیسے جیسے وہ...... زائرہ کو جھرجھری سی آ گئی۔

”کیسی ہو ڈیئر!“ وہ ہمیشہ کی طرح سے بے تکلف ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”جی...... جی میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے چادر کی بکل اپنے گرد اور بھی سخت کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا...... لگ تو نہیں رہی ہو۔ ہاں بھئی محبت ہے ہی ایسی پیاری جو دلوں کو اداس اور چہروں کو بے چین بنائے رکھتی ہے۔“ اس نے بڑی میلی سی نظر سے اسے سر سے پاؤں تک گھورا۔

”اوہ ہائے زارو۔“ اتنے میں حسان بھی آ گیا۔ اس نے آتے ہی زائرہ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا پھر اپنے دوست ریاض سے گلے ملا۔

”وہ میں ذرا ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔“ پھر اس نے زائرہ کی طرف معذرتی نظروں سے دیکھتے ہوئے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

”اچھا چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیوں وقت ضائع کرتے ہو ایسی فضول باتوں میں جاؤ اندر چلے جاؤ۔“ ریاض نے کچھ اس بُرے انداز سے کہا کہ زائرہ کے علاوہ رامین اور حسان

نے بھی اسے محسوس کیا۔ حسان نے تو فوراً اسے اپنے ساتھ لے کر اندر جانے میں ہی بہتری سمجھی وہ جانتا تھا زائرہ کو ریاض اچھا نہیں لگتا وہ اس کی ایسی باتوں اور بے باک نظروں پر پہلے ہی سے بہت تلملاتی تھی۔ اور وہی ہوا جس کا حسان کو ڈر تھا۔ اندر آتے ہی زائرہ نے اس کے ساتھ باقاعدہ جھگڑا شروع کر دیا۔

”تم...... تم مجھے یہاں آنے پر کیوں مجبور کرتے ہو اور آخر کب تک یہ سب چلتا رہے گا؟“

”سنو...... سنو میری عزیز...... میری پیاری! غصہ تو مت کرو۔ موڈ تو اچھا کرو۔“ وہ اس کے قریب آ کر اس کے ہاتھ پکڑنے لگا تو وہ بھی اس نے غصے سے چھڑوا لیے۔

”چھوڑو مت مجھے...... تم بہت بُرے ہو۔“ وہ بدستور غصے میں ہی تھی۔

”ٹک...... ٹک ٹک۔“ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی درواز کھل گیا۔ وہ ٹرے میں کولڈ ڈرنکس لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی خباثت لیے۔

”میں نے سوچا آج تو اندر بہت گرمی ہے اس لیے ٹھنڈا جلدی پہنچانا چاہیے۔“ وہ ذو معنی انداز میں کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ ایک لمحے کو زائرہ کے قریب رکا۔

”اتنا غصہ حُسن کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا۔“ اس نے ایک فقرہ اچھالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

”اس خبیث کا تو میں سر پھوڑ دوں گی کسی روز۔“ وہ ہوا میں مکہ لہراتی ہوئی غصے سے بولی۔

”بلکہ میں تو اب آؤں گی ہی نہیں۔ آج آخری بار آئی ہوں۔“ اب وہ اسے گھور رہی تھی۔ ناراضگی اور پریشانی سے۔

”اچھا...... اچھا ٹھیک ہے ہم آج کے بعد یہاں نہیں ملیں گے۔ کبھی بھی نہیں ملیں گے۔ سوری...... پلیز......“ وہ بڑے تحمل اور نرمی سے اس کا غصہ برداشت کرتے ہوئے معافی مانگ رہا تھا۔

وہ غصے سے منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔

”ارے بابا کہا ناں...... سوری۔“ اب اس نے اپنے کان پکڑ لیے اور رونے والی شکل بنا کر کھڑا ہوگیا۔

”وعدہ رہا۔ آج کے بعد ہم یہاں نہیں ملیں گے بلکہ کہیں بھی نہیں ملیں گے۔“ وہ اس کے منہ پھیر لینے پر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"جیسے تم کہو گی۔ ہم ویسے ہی کریں گے۔ پہلے تم بیٹھو تو...... موڈ تو ٹھیک کرو، پلیز......" اس نے بڑی محبت سے اسے تسلی دی اور ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا لیا۔

"تم جھوٹے ہو۔ غلط کہتے ہو۔ کبھی وعدہ پورا نہیں کرتے۔" اس نے بھی ذرا نرم آواز کرتے ہوئے کہا۔ اس کا غصہ کچھ کم ضرور ہوا تھا ختم نہیں۔

"اب سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہاری قسم۔" اس نے پیپسی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ اس کے بعد اگلے پانچ منٹ میں وہ اپنی میٹھی باتوں سے اس کا موڈ اچھا کر چکا تھا اس کے سوٹ کے رنگ کی تعریف کر کے۔ اس کے رنگ روپ کی تعریف کر کے اور اس کے انداز و ادا کی تعریف کر کے۔ وہ باتوں کا خوب ماہر تھا۔ اپنے دل کا حال کچھ اس انداز میں بیان کرتا تھا کہ زائرہ ہر بات پر پریشان اور ہر مشکل کا تصور بھول کر پھر سے اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ پھر وہ خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا خوش لباس بھی تھا اور دولت مند بھی اور سب سے بڑھ کر اپنے والدین کا اکلوتا بھی...... یعنی اس کی شخصیت میں کشش ہی کشش تھی۔

"حسان! میرے گھر والے میری نسبت طے کر رہے ہیں۔" اس نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جسے کہنے کے لیے وہ حسان سے ملنے آئی تھی۔

"کک...... کیا؟" حسان کو اس کی بات سنتے ہی کرنٹ لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مذاق کر رہی ہو ناں؟" پریشانی کے عالم میں اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں اور ایسا اسی ہفتے میں کسی بھی روز ہو جائے گا اور عین ممکن ہے دادا جان میرا نکاح ہی کر دیں۔" اس نے پوری تفصیل سے بتا دیا۔

"حسان پلیز! کچھ کرو۔ اپنے گھر والوں کو جلدی ہمارے گھر بھیجو ورنہ؟" بات کو ادھورا چھوڑ کر وہ خلاؤں میں دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی جسے چھپانے کے لیے ہی اس نے اپنی نگاہیں اوپر جما دی تھیں۔

"میرے گھر والے...... زائرہ تم جانتی ہو ناں۔ میری فیملی تو یہاں ہے ہی نہیں وہ تو کینیڈا میں ہیں۔ یہاں تو میں صرف تمہیں ملنے کے لیے آیا ہوا ہوں۔" اس نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

"تو انہیں معاملے کی نزاکت بتا کر بلا لو۔" وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

"کس معاملے کی نزاکت؟" وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

"کیا مطلب کس معاملے کی نزاکت؟ میرے اور تمہارے معاملے کی نزاکت اور کیا؟" زائرہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"اوہ...... ہاں...... ہاں میں کروں گا بات میں آج ہی امی کو فون کرتا ہوں۔" وہ اس کے مزاج کو بگڑتا دیکھ کر سنبھل گیا۔

"دیکھو حسان! میں آج کے بعد تمہیں ملنے نہیں آؤں گی۔" اس نے منہ دوسری طرف کیے کیے ہی کہا۔

"کیا کہا...... دیکھو ادھر...... دیکھو! میری طرف دیکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہو۔"

اس نے زبردستی اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟ بولو کیا میرے بغیر رہ سکتی ہو۔" وہ اسے جھنجھوڑنے والے انداز میں کندھوں سے ہلا ہلا کر پوچھ رہا تھا۔

"حسان! میں مجبور ہو جاؤں گی۔ تم میری بات کو سمجھو۔ سمجھ نہیں رہے ہو تم......" وہ اپنی آنکھوں سے چھلک جانے والے پانی کو روک نہ سکی۔

"مجھے تمہارا تو پتہ نہیں مگر میں...... میں مر جاؤں گا۔ اپنی جان لے لوں گا اگر تم نے ایسا کیا تو؟" وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بھینچتا ہوا بولا۔

"حسان پلیز......" اس نے گھبرا کر خود کو اس سے چھڑایا۔ کیونکہ اب بات ان دونوں کی باتوں سے ہٹ کر سینے لگنے تک آ گئی تھی اور یہ وہ قبل از نکاح قبول نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لاکھ آزاد خیال تھی۔ اس کی محبت میں گھر سے باہر تک بھی آ گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے بہت سی حدود کو اپنے اور اس کے درمیان قائم رکھا ہوا تھا۔

"اوہ سوری...... میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا اور بھول گیا کہ مجھے تم پر ابھی تک ایسا کوئی حق نہیں ہے۔" وہ شرمندگی سے منہ بناتا نظریں جھکاتا ہوا بولا۔

"تم ابھی تک مجھے غیر سمجھتی ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی جتنا کہ ایک دوست کو سمجھا جاتا ہے۔" وہ کچھ خفا لگ رہا تھا جسے اس وقت زائرہ نے نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھا۔

"تم میرے لیے کیا ہو؟ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں اس کے اظہار اور اقرار کے لیے ایسا کچھ ضروری نہیں سمجھتی۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ کچھ لمحے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ رہے خاموش اور پریشان...... پھر حسان نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''اتنا حق تو تم نے مجھے دیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ جس پر زائرہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھل گئی۔ دونوں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ حسان نے زائرہ کو تسلی دے دی تھی اور وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ آج ہی اپنی مما سے بات کرے گا۔ البتہ اس نے کچھ دنوں کی مہلت ضرور مانگی تھی اور کہا تھا کہ وہ چند روز تک اس معاملے کو کسی نہ کسی طرح ٹال دے پھر وہ اپنے گھر والوں کو لازم اسے باقاعدہ پر پوز کرنے بھیج دے گا۔



وہ گیٹ سے باہر نکلی تو زید سامنے ہی کھڑا تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس کا دل سینے سے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''تت......تت......تم......تم مجھے لینے کیوں آئے ہو۔ رحمت چاچا کدھر ہیں۔'' اسے کچھ اور نہ سوجھا تو ہمیشہ کی طرح اس پر گرم ہونے لگی۔

''آپ چلیں اور چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔'' وہ اس کی طرف بغیر دیکھے واپس مڑا اور تیز قدموں سے گاڑی کی طرف چل دیا۔ اس کا حلق میں اٹکا دل مارے پریشانی کے سکڑنے لگا۔ جس سے اس کا گلا خشک ہو کر تالو سے چپک گیا۔ وہ چپ چاپ چلی اور جا کر گاڑی میں پچھلی طرف بیٹھ گئی۔

زید گاڑی سے واپس اترا گھوم کر اس کی طرف آیا۔ گاڑی کا دروازہ غصے سے کھولا اور بولا۔

''اترو......''

''کک......کیوں؟'' وہ سچ مچ ڈر گئی۔

''ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا۔'' اس نے بھی احترام کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی روکھے انداز میں بدتمیزی سے کہا۔ وہ کچھ شرمندہ سی آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس نے غصے اور تیزی سے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے جسے اس نے بس ایک ہی بار چوری سے دیکھا تھا دوبارہ اس کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر سہم چکی تھی اس کی چھٹی حس پھڑک پھڑک کر کہہ رہی تھی کہ اس کا سارا بھید کھل چکا ہے۔ زید نے آج اس کی چوری پکڑ لی ہے اور اب گھر جاتے ہی وہ سب کو بتا دے گا۔

آنے والے طوفان کی آہٹ سے اس کا رواں رواں کانپنے لگا۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟'' آخر اس کا سوال لبوں پر آ ہی گیا۔

''کالج سے اور کہاں سے۔'' اس نے پھر بھی ہمت کر کے جھوٹ بول ہی دیا۔

''اپنے آپ سے پوچھو اور پھر صحیح جواب دو۔''

آج وہ گرج رہا تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔

''میں فضول باتوں پر نہیں سوچتی۔'' اس نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے لاپروائی سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''دیکھو! میں سب جانتا ہوں۔ مجھے بے وقوف نہ بناؤ اور جو تم کر رہی ہو اور فوراً ختم کر لو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ بھول جاؤ میں بھی کسی سے نہیں کہوں گا۔'' وہ اسے بدستور ڈھیٹ بنے دیکھ کر خود ہی نرم پڑ گیا اس کی ضدی فطرت سے واقف جو تھا۔ جانتا تھا وہ اپنے پروں پر پانی نہ پڑنے دے گی۔

''دیکھو! اب تمہارے ساتھ ساتھ کسی اور کی بھی زندگی اور عزت کا سوال ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا مگر وہ لاپرواہی باہر نظریں کیے خود کو مضبوط کر رہی تھی۔

''جواد بھائی تمہیں دل و جان سے پسند کرتے ہیں اور دادا جان! دادا جان کا پیغام بھی تم تک پہنچ چکا ہو گا۔ اس لیے پلیز۔ ان سب کا خیال کرو۔''

وہ پیار سے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ اپنے اسی انداز اور لہجے میں جو اس کا ازلی وفطری تھا۔

''کہہ چکے۔'' اس نے جیسے ہی خود کو نارمل کیا تنک کر بولی۔

''ہاں......اب تمہارا جواب چاہیے۔'' وہ ماحول درست کرنے کو مسکرا کر بولا۔

''امی کو میں نے اپنا جواب سنا دیا تھا۔ تمہیں بھی پتہ چل جائے گا۔'' اس نے سپاٹ سا جواب دیا ایک لمحے کو اسے گھورا اور پھر کہنے لگی۔

''بہتر ہو گا تم اپنے کام سے کام رکھو اور میری جاسوسی بند کرو۔ ایسا کرنے سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''تم اپنے ڈھب بدل دو میں جاسوسی بند کر دوں گا ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' اس کا دل پھر خوفزدہ ہوا۔

''ورنہ خاندان کی عزت پر تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اور کسی کی لے بھی سکتا ہوں۔''

اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا جس کے معنی زائرہ کو سمجھ آ رہے تھے اور انہیں وہ نظرانداز بھی نہ کر سکی تھی۔

''اوہ یہ ٹریفک جام......'' وہ باہر کی گاڑیوں کی لمبی قطار کو دیکھ کر الجھ گئی۔ وہ لوگ تو ابھی

ابھی رکے تھے مگر ان کے آگے اور پیچھے چند سیکنڈوں میں ہی گاڑیوں کی لمبی قطاریں جمع ہوگئی تھیں۔

"لگتا ہے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے آگے۔" زید نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال کر ایک نگاہ آگے تک ڈالی۔

"بس پھر تو گئے۔" زائرہ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور سر کو گاڑی کی پشت سے لگا دیا۔

"چلو اچھا ہے آج تم سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔" زید دوبارہ سے اسی موضوع کی طرف آ رہا تھا۔ اتنے میں کسی کے دکھائی دینے پر زید نے گاڑی کو شیشہ اتارا۔

"ارے سر آپ!" وہ بڑے جوش اور تپاک سے کہہ رہا تھا۔

"جناب! میں، اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا اللہ کی رضا۔ ہم آج صبح ملے اور اب پھر شام کو بھی مل رہے ہیں۔"

زید اسے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور مصافحہ کر کے بات کرنے لگا۔

"سر! یہ میری خالہ زاد بہن ہیں زائرہ...... اور زائرہ یہ میرے دوست بختیار کے کزن ہیں ڈی ایس پی پولیس ہیں عبدالمالک صاحب۔"

اس نے گاڑی میں بیٹھی زائرہ کی طرف جھکتے ہوئے کہا وہ دونوں کا تعارف کروا رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے بڑی تہذیب سے سلام کیا۔

"جی وعلیکم السلام۔" اسے بھی مسکرا کر جواب دینا پڑا۔

سلام کرنے کے بعد وہ دوبارہ زید کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر پڑے زید کے موبائل کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"واہ! بڑا اچھا سیٹ رکھا ہوا ہے۔" وہ اس کے سیٹ سے مرعوب ہو رہی تھی۔ یونہی دیکھتے دیکھتے وہ بے اختیاری میں اس کے مینو میں چلی گئی۔ پھر اس کا کیمرہ چیک کرنے لگی۔ اس کا ریڈیو، گیلری، ویب اور پھر میسج حالانکہ اس کی یہ حرکت غیر اخلاقی ہی تھی پھر بھی اس کا Out box inbox دیکھتی رہی۔ Write message میں گئی۔ اس کی انگلیاں زید کے موبائل کی خوب جانچ پڑتال کرتی رہیں۔ وہ وقت گزارنے اور اپنے ذہن میں آنے والے بُرے بُرے خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے شغلاً ایسا کر رہی تھی۔ یوں بھی زید کے موبائل میں اسے کوئی راز چھپا نظر نہ آیا تھا۔ وہ جلد ہی اس سے بور ہوگئی۔ اس نے موبائل کو واپس اس کی جگہ پر رکھا اور باہر سڑک پر رکی گاڑیوں کی قطاروں کو سرکتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے ہی منٹ میں زید بھی واپس پلٹ آیا تھا جو عبدالمالک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بہت

آگے تک چلا گیا تھا۔



"زائرہ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم جانتی ہو ناں میں تمہاری خاطر کینیڈا سے یہاں آیا ہوں۔"

رات کو وہ بستر پر لیٹی تو وہ اس کے حواسوں پر چھا گیا۔ اس کی وہ افسردہ اور پریشان صورت جو زائرہ کی بات سن کر ایسی ہوگئی تھی۔

"مجھے تمہارا تو پتہ نہیں مگر میں خود کو ضرور کچھ کر لوں گا۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو؟" وہ نم آنکھوں کے ساتھ کیسی سچائی سے کہہ رہا تھا۔

اس نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ "میں کیا کروں میں جانتی ہوں کہ تم مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہو مگر..... مگر میں اپنے گھر والوں کو کیسے بتاؤں؟" وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"پلیز زائرہ مجھے کچھ وقت دو۔ کچھ بھی کرو لیکن چند روز کے لیے اپنے گھر والوں کو روکو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مما سے بات کر کے انہیں یہاں بلا لوں گا۔"

اس کا معصوم چہرہ اور التجا کرتا لہجہ اس کے سامنے پھر آئینہ ہو گیا۔

"حسان! میں کیا کروں؟" وہ پور پور اس کی محبت میں گرفتار تھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ مارے پریشانی کے سسکنے لگی اب وہ اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔

"مجھے کسی نا کسی طرح سے اپنے گھر والوں کو روکنا ہی ہوگا؟ میں امی جان کو اعتماد میں لے کر سب بتا دیتی ہوں۔"

ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ اس نے اپنی ماں کے کمرے کی طرف قدم بھی بڑھائے۔

"پاگل ہوئی ہو۔ وہ کسی طور نہ مانیں گی۔ وہ اپنے بھانجے کی محبت میں اتنی گھری ہیں کہ اس کی جگہ ہرگز بھی کسی اور کو قبول نہ کریں گی۔ بلکہ وہ چار دن بعد ہونے والی تمہاری اور جواد کی منگنی کو کل ہی نکاح میں بدل دیں گی۔" وہ مایوس ہو کر وہیں ٹھہر گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ مجھے بہرحال 'حسان' کے سوا کسی اور کا نہیں بننا۔" اس نے اپنے دل کے کونے کونے میں جھانک کر اپنی اس محبت کا جائزہ نئے سرے سے لیا جو اب جنون میں بدل چکی تھی۔

"مجھے حسان کو وقت دینا ہی ہوگا۔ وہ وعدہ کر چکا ہے مجھ سے کہ وہ جلد ہی اپنی مما کو

لے آئے گا۔

''مجھے اس منگنی کو منسوخ کرانا ہی ہوگا اور کچھ اس طرح کرانا ہوگا کہ مجھ پر حرفِ الزام بھی نہ آئے اور گھر والے خود میرا رشتہ جواد کی بجائے حسان کے ساتھ کر دیں۔''

''تو بس پھر ٹھیک ہے جاؤ اور جا کر اپنے بابا جان کو بتا دو۔'' اس کے دل نے اسے بہت ٹھیک وقت پر مشورہ دیا۔

''بابا جان...... وہ تو میری بات پر فوراً یقین بھی کر لیں گے۔'' وہ اپنے دلی مشورے پر خود ہی خوش ہوگئی۔

''ہاں مگر سوچ لو ہنگامہ بہت ہوگا۔'' دماغ نے آنے والے وقت کی طرف سے خبردار کرنا چاہا۔

''تو ہونے دو۔'' وہ اپنے دل کی مان رہی تھی۔

''اور ان محبتوں کا کیا ہوگا؟ جو جیلانی خاندان کا طرۂ امتیاز اور وجہ افتخار ہے؟'' دماغ پھر بھی اس کی راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا۔

''تو کیا میں اپنی محبت کو خاندان کے وقار کے نام پر بھینٹ چڑھا دوں؟'' وہ اپنے دماغ کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

''تو کیا تم دو بھائیوں اور دو بہنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اک دوجے سے دور کر کے صرف حسان کا قرب حاصل کرنے کو ترجیح دو گی۔''

''ہاں دوں گی۔ یہ میرا حق ہے؟'' وہ بالآخر اپنا حق جتلانے لگی۔

''تو پھر اپنا وہ حق سیدھے سیدھے مانگو۔ سچ کہو۔ جھوٹ پر کوئی خوشی استوار نہیں ہوتی؟'' اس کا ذہن اس کی سوچ کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔

''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔'' اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالا۔

''تم تو ہٹو میرے راستے سے۔'' اس نے بڑی بے دردی سے اپنے دماغ کو کچلا اور اپنا موبائل اٹھا کر عمیس جیلانی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



آج عمیس جیلانی ضرورت سے کچھ زیادہ غصے میں تھے وہ اپنے کمرے سے میاں صاحب کے کمرے تک منہ سے جھاگ اڑاتے اور پھنکارتے ہوئے پہنچے تھے وہ اس قدر بلند آواز سے بولتے جا رہے تھے کہ ان کی آواز اپنے اپنے کمروں میں آرام کرتے اسیس اور تکلم کے ساتھ ساتھ احمد حسن اور ستارہ تک بھی پہنچ گئی وہ لوگ گھبرا کر کمروں سے باہر نکل آئے۔

''کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟''

''خیر تو ہے۔ کیا ہو گیا۔''

سب ایک دوجے کو پریشانی سے پوچھتے ہوئے عمیس کے پیچھے ہی میاں صاحب کے کمرے میں آ گئے۔

''کہاں ہے یہ ناہنجار...... بلائیں اسے۔'' وہ انتہائی غصے سے پھنکارتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''کون کہاں ہے؟ کیا ہو گیا۔'' طاہرہ بیگم اپنا بے طرح سے دھڑکتا ہوا دل سنبھالتیں تخت پوش سے بمشکل اٹھیں۔ وہ نماز عشاء کے بعد کے وظائف خاص پڑھ رہی تھیں۔ جبکہ نور محمد جیلانی اس وقت اپنے بستر میں نیم دراز کوئی سیاسی میگزین پڑھ رہے تھے۔ وہ بھی پریشان ہو کر میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''کیا ہو گیا عمیس میاں! کیوں چلا رہے ہو وہ بھی اس وقت؟'' انہوں نے سامنے لگے وال کلاک کی طرف وقت دیکھتے ہوئے پوچھا جہاں رات کے پونے گیارہ کا وقت ہو چکا تھا۔ اس وقت ''جیلانی ہاؤس'' کے مکین سونے کے لیے اپنے بستروں میں جا چکے ہوتے ہیں اور وہ طالب علم جن کے امتحانات وغیرہ نہ ہوں وہ تو سو بھی چکے ہوتے ہیں۔

''بلائیں اپنے اس لاڈلے کو جس کو آپ نے اپنے لاڈ اتنا بگاڑ دیا ہے کہ وہ اپنی آوارگی میں گھر کی عزت کا خیال بھی بھلا چکا ہے۔'' عمیس جیلانی بدستور چلا رہے تھے۔

''یا اللہ خیر...... کیا ہو گیا؟'' اب تو طاہرہ بیگم کے حواس بالکل ہی جاتے رہے اور انہوں نے عمیس کو کندھوں سے تھام لیا۔

''کچھ بھی بولتے چلے جاتے ہو غصے میں تحمل سے بات کرو۔''

''تحمل سے بات کروں۔ کیا میں اب بھی تحمل سے بات کروں۔ اس کا ہاتھ میرے گریبان تک آن پہنچا ہے اور آپ کہتی ہیں تحمل سے بات کروں۔'' وہ تو آج ماں کے ساتھ بھی بدلحاظی سے پیش آ رہے تھے۔

''عمیس! شاید تم اپنی ماں سے بات کر رہے ہو۔ آواز نیچی کرو۔'' میاں صاحب کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ بستر سے اتر کر ان کے قریب آ گئے اور انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔

''اب کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' باقی سب خاموشی سے دبکے کھڑے حیرانی اور پریشانی

سے سوچ رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

"آپ پہلے اس کو بلائیں۔" وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر بولے۔

"کس کو؟" میاں صاحب نے ایک اچٹتی سی نظر کمرے کے اطراف میں کھڑے اسیس، تکلم، احمد حسن اور ستارہ پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"اسی زید کو...... جس کو آپ معصوم فرشتہ سمجھتے تھے آج تک۔"

عمیس جیلانی نے بڑی ہی حقارت ونفرت سے زید کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"زید کو؟ یا اللہ خیر۔" زید کا نام سنتے ہی طاہرہ بیگم کے ساتھ ساتھ تکلم نے اپنا کلیجہ تھامتے ہوئے کہا۔

"ہاں زید کو...... بلائیں اسے فوراً......" عمیس جیلانی نے اپنی بھابی کے سامنے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا جسے دیکھ کر اسیس فوراً زید کو بلانے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"اچھا اب اپنے تیور درست کرو اور یہاں ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔" میاں صاحب نے اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھالیا۔

"جی دادا جان!" زید فوراً ہی بھاگا چلا آیا تھا۔

"یہاں بیٹھو۔" میاں صاحب نے اسے اپنی بائیں جانب بٹھالیا۔

"اب کہو عمیس تمہیں زید سے کیا شکایت ہے؟" انہوں نے بڑی نرمی سے بیٹے کو پوچھا تھا مگر وہ تو جیسے ضبط کی آخری حد پر ہی بیٹھے تھے فوراً پھٹ پڑے۔

"اس بے شرم...... بے غیرت سے پوچھیں اس نے میری بیٹی کو میلی نظر سے دیکھا تو دیکھا کیسے؟"

"عمیس! بس کرو۔ میں کب سے برداشت کر رہا ہوں تم ہو کہ کچھ بھی کہے جا رہے ہو۔ اب میں مزید برداشت نہیں کروں گا۔" اسیس جیلانی کا صبر بھی جواب دے گیا وہ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا گندا الزام برداشت نہ کر سکتے تھے۔

"میں بکواس نہیں کر رہا اتنی دیر سے بلکہ میرے پاس اس کی کمینگی کے سارے ثبوت موجود ہیں ورنہ تو آپ لوگ شاید کبھی میری بات کا یقین نہ کرتے۔ اس...... اس...... اس کے بھولے بھالے چہرے کے پیچھے کیسا سیاہ چہرہ ہے۔ کتنا مکروہ آپ خود دیکھ لیں۔ لیں دیکھیں۔ پڑھیں اس کے کرتوت۔"

عمیس میاں کے ہاتھ میں زائرہ کا موبائل کانپ رہا تھا جو انہوں نے اپنے ابا جان کی طرف بڑھا دیا۔

"کک...... کیا ہے اس میں......؟" نور محمد صاحب کا لہجہ اور ہاتھ دونوں ہی کسی "انہونی" کے خوف سے لرز رہے تھے۔

یہ پڑھیں اس کا "Message" جو اس نے کل ہی زائرہ کو Send کیا ہے۔

"زائرہ کو زید نے؟" ستارہ جو اتنی دیر سے خاموش کھڑی تھیں بے ساختہ اور بے یقینی سے بولی۔

"لائیں نانا جان! میں دیکھوں کیا ہے؟" وہ موبائل میں Save میسج Message پڑھنے کو آگے بڑھی۔

"تم رہنے دو۔ بڑے بات کر رہے ہیں ناں؟" احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

نور محمد صاحب نے نا چاہتے ہوئے بھی وہ پڑھ لیا جو وہ پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔

"ڈیئر زائرہ!

"تم جانتی ہو ناں میں تمہیں بچپن سے چاہتا ہوں اور میں تمہاری شادی کسی اور سے ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ اپنے بھائی سے بھی نہیں۔ خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ گھر والے تمہیں جواد بھائی سے منسوب نہیں کر سکتے۔ میں تو کہتا ہوں آؤ ہم گھر سے بھاگ چلیں۔ یاد رکھو اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں زبردستی اغوا کر کے لے جاؤں گا۔ اگر تم میری نہ ہوئیں تو کسی کی نہ ہو سکو گی تمہاری قسم میں سچ کہتا ہوں۔"

یہ پیغام پڑھنے کے بعد نور محمد جیلانی صاحب کی نظریں موبائل سکرین سے ہٹ کر زمین پر جو گڑیں پھر نہ اٹھیں۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ یہ کہتے ہوئے۔

"مجھے ابھی بھی یقین نہیں آتا کہ میرا زید ایسا گرا ہوا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں...... ہاں آپ کو کیوں یقین آئے گا۔ آپ کی آنکھوں پر تو اس کے پیار کی پٹی بندھی ہے جس نے آپ کو بصارت سے محروم کر دیا ہے۔" وہ کھل کر بدتمیزی کر رہا تھا۔

"عمیس! تمیز سے بات کرو۔" اسیس جیلانی غصے سے آگے بڑھے۔

"کاش آپ کی بھی کوئی بیٹی ہوتی اور کوئی اس کی عزت پر کیچڑ اچھالتا پھر میں پوچھتا صبر اور تمیز کیا ہوتی ہے؟ لیجیے آپ بھی پڑھیے۔" عمیس جیلانی نے موبائل فون ان کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ایسی بکواس پڑھنے اور اس پر یقین کرنے کی۔" انہوں نے فون کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اسی سے پوچھیے۔ جس نے یہ گھناؤنی حرکت کی ہے اور آج کوئی پہلی بار نہیں کی۔ اس کے کرتوت تو مجھے زائرہ اکثر بتاتی رہتی ہے۔"

"یہ...... یہ...... آستین کا سانپ ہے۔ گھر کی عزت پر جانے کب سے اپنی میلی نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ آج آخر اس نے ڈس ہی لیا۔"

وہ زید کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"چچا جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ سب غلط ہے۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ میں...... میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟"

زید نے زائرہ کا موبائل لے کر وہ انتہائی غلیظ قسم کا پیغام پڑھا تو اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ مارے شرم کے اسے اپنا آپ زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"بکو مت...... میں تمہیں بہت عرصے سے نوٹس کر رہا ہوں اور...... اور یہ پیغام تمہارے ہی موبائل نمبر سے آیا ہوا ہے بولو...... یہ تمہارا نمبر ہے کہ نہیں؟" عمیس میاں نے موبائل اس کی آنکھوں میں گھساتے ہوئے اس کا موبائل نمبر اسے دکھایا۔

"بولو...... یہ تمہارا نمبر نہیں ہے۔ جھٹلا دو اسے بھی؟"

"یہ...... یہ...... یہ نمبر تو میرا ہی ہے۔ مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ پیغام میں نے نہیں بھیجا۔" وہ رو دینے کو تھا۔

"ہونہہ...... ڈرامے بازی...... بند کرو یہ رونا دھونا۔"

انہوں نے بڑی حقارت سے زید کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ماموں جان! آپ اس کی بات تو سنیں۔ یہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کوئی غلط فہمی ہو۔" ستارہ معاملے کو اس قدر نازک ہوتا دیکھ کر آگے بڑھی۔

"ستارہ! تم اس کی وکالت مت کرنا۔ تم نے بھی اسے بہت سر چڑھایا ہوا ہے۔" عمیس جیلانی اسے بھی ڈانٹ کر بولے۔

احمد حسن نے وہ موبائل Message پڑھا اور موبائل اپنی ماں کی طرف بڑھا دیا یہ کہتے ہوئے کہ "لیں امی جان آپ بھی پڑھ لیں اور ابا جان آپ بھی......" پھر اس نے خشمگیں نگاہوں سے زید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"شرم سے ڈوب مرو جا کر کہیں۔"

"بھائی جان! آپ بھی...... آپ بھی مجھے ایسا سمجھ رہے ہیں کیا میں...... میں ایسا کر سکتا ہوں؟" وہ تڑپ کر بھائی کے سامنے آ گیا جو اس سے نگاہیں پھیر کے پیٹھ موڑ چکا تھا۔

"تم ایسا کر سکتے ہو...... ہاں تم...... جسے گھر کی بہنوں بیٹیوں کی عزت کا کچھ خیال نہیں۔ تم! جو انتہائی گرے ہوئے ہو۔ سچ کہہ رہے ہیں چچا جان۔" وہ بھی بالکل عمیس جیلانی کے ہی انداز میں گرجا تو سبھی دہل گئے، طاہرہ بیگم جو بالکل سن ہوئی بیٹھی تھیں جن کا دماغ ان باتوں کو ہرگز قبول نہ کر رہا تھا پریشان ہو کر چلا اٹھیں۔

"بند کرو یہ ساری خرافات، دماغ خراب ہو گیا ہے تم سب کا۔ بنا سوچے سمجھے بولے جا رہے ہو۔ میرا خون...... میری تربیت...... میری محبت اتنی گری ہوئی نہیں ہو سکتی۔" انہوں نے آگے بڑھ کر زید کو خود سے چمٹا لیا تھا۔

"بی بی جان! اس کا خون اور آپ کی تربیت کیا کرے گی۔ جب اس کی صحبت ہی بد ہے تو......" احمد حسن نے بڑے ہی طنز والے کٹیلے لہجے میں کہا۔

"احمد! آپ...... آپ تو ایسے مت کہیں۔" ستارہ پھر آگے بڑھی۔

"تم تو بالکل بھی مت بولنا آج۔" اس نے بڑے سپاٹ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر اسے ڈانٹ دیا۔

"لیکن کیوں نہ بولوں...... یہ کوئی جھوٹی بات ہے ایک گھناؤنا الزام ہے بہتان ہے میں زید کو جانتی ہوں۔ زید نے ایسا نہیں کیا۔ یہ کر ہی نہیں سکتا۔" وہ پھر بھی کہنے سے نہ باز آئی۔ وہ زید کے پیلے زرد چہرے پر کندہ سچ کو دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کہا ناں...... تم زید کی حمایت مت کرو اور میرا منہ مت کھلواؤ۔"

احمد حسن نے کمرے میں موجود سارے بڑوں کا لحاظ کیے بغیر بڑی بدتمیزی سے اسے ٹوکا۔

"کیا...... کیا جانتے ہیں آپ زید کے بارے میں؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی مگر اس وقت چپ رہنے کو تیار نہ تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی اس کے نانا جان اور بی بی جان تو اس صدمے سے نڈھال ہو کر رہ گئے تھے اور باقی دوسرے بھی مارے شرم اور پریشانی کے چپ تھے۔ تکلم تو باقاعدہ سسک رہی تھیں جبکہ انیس میاں پریشانی اور بے چینی سے خود پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھے۔ وہ دو قدم چلتے، رکتے، اپنے ہاتھوں کو مروڑتے۔ کبھی اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور کبھی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے قدم کبھی زید کی جانب اور کبھی عمیس میاں کی جانب اٹھتے۔ مگر وہ ان دونوں تک ہی نہ پہنچ رہے تھے۔

"تم لوگ اس وقت جاؤ یہاں سے۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ صبح بات کریں گے۔" زمین کو گھورتے ہوئے نور محمد صاحب بڑی شکستہ اور دلگیر آواز میں بولے۔

"ٹھیک ہے ابا جان! مگر ایک بات میری بھی سن لیجیے۔ میں اس معاملے میں کوئی نرم فیصلہ قبول نہ کروں گا۔ اب یا تو یہ اس گھر میں رہے گا یا میں؟" عمیس میاں نے حتمی اور سخت لہجے میں کہا۔

"اور ہاں اسے رکھیے اپنے پاس......غور سے دوبارہ دیکھ لیجیے گا کہ یہ کس نمبر سے Send ہوا ہے۔ پھر آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔" انہوں نے موبائل فون میاں صاحب کی گود میں ڈالا۔

"اور ہاں اسے یہ بھی پوچھیے گا کہ چھپ چھپ کر زائرہ کے پیچھے کالج کیوں جاتا تھا اور وقتاً فوقتاً اسے ڈراتا دھمکاتا کیوں تھا؟" انہوں نے جاتے جاتے رک کر ایک بڑی کاٹ دار نظر سے زید کو سر سے پاؤں تک گھورا اور پھر نفرت سے سر کو جھٹکتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

"تم سب بھی جاؤ۔" میاں صاحب نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"دادا جان! میرا یقین کریں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے میرے گھر کی عزت پر حرف آتا ہو۔" زید روتا ہوا ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"سچ کہتے ہیں چچا جان! اسے بہت ڈرامے بازی آتی ہے۔" احمد حسن نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بڑے طنز سے کہا اور بالکل اپنے چچا جان کی طرح سر کو جھٹکا دے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"زید تم بھی جاؤ...... میں اس وقت بہت تھک گیا ہوں۔ بلکہ میں تو ٹوٹ ہی گیا ہوں۔" نور محمد صاحب نے اپنے گھٹنوں پر جھکا ہوا اس کا سر ہٹا کر ایک طرف کیا اور اپنے قدموں کو ہولے ہولے گھسیٹتے ہوئے باتھ روم میں چلے گئے۔

"میرے اللہ! میرے گھر کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔" طاہرہ بیگم بھی چہرہ دوسری جانب گھما کر رونے لگیں۔

اسیس میاں نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور لرزتے لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کو چل دیئے اور اب وہ......وہ حیران و پریشان سا اپنے زمین میں دھنسے ہوئے دھڑ کو نکالتا اور سر پر گرے ہوئے آسمان کے بوجھ کو سنبھالتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہوگیا......اور......آخر کیوں ہوگیا۔



"احمد!" رات کا تیسرا پہر تھا۔ مگر وہ ہنوز جاگ رہی تھی۔ نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ مسلسل سسک رہی تھی۔

"احمد!" اس کی سسکی نے پھر سے اسے پکارا جو پیٹھ موڑے لیٹا ہوا تھا سویا وہ بھی نہ تھا بلکہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

"احمد!" اس بار اس نے اپنا ہاتھ اس کے گرد حائل کر کے اسے اپنی طرف موڑنا چاہا۔

"کیا ہے؟" جواباً اس نے بڑی بے رخی سے جواب دیتے ہوئے اس کا ہاتھ بھی خود پر سے ہٹا دیا۔

"احمد! آپ کس بات پر اتنے خفا ہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں کسی سے خفا نہیں۔" وہی سیدھا سپاٹ جواب۔

"تو پھر آپ کا رویہ اس قدر تکلیف دہ کیوں ہے۔ نہ صرف میرے ساتھ بلکہ سب گھر والوں کے ساتھ۔" وہ بڑے آرام اور محبت سے پوچھ رہی تھی۔

"تم زید کی طرف داری مت کرو۔" اس نے گویا شرط لگا دی۔

"احمد! وہ آپ کا بھائی ہے؟" ستارہ کو اس کی زید سے اس قدر مخالفت پر شدید حیرت اور رنج تھا۔

"اور تمہارا؟" وہ بھی اٹھ بیٹھا اور سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"کک......کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ اس کی آنکھوں کی تپش سے جل اٹھی۔

"بتاؤ ناں......وہ میرا بھائی تمہارا کیا ہے؟" اس کے برف جیسے لہجے میں انگارے ہی انگارے تھے۔

"احمد! آپ اور آپ کی ایسی سوچ؟" وہ اس کے انداز کا مطلب سمجھ کر تڑپ اٹھی۔

"میری سوچ کو اور مجھے گولی مارو۔ تم بتاؤ ناں زید تمہارا کیا ہے؟" اس نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے کریدا۔ ستارہ کو آج پہلی بار اس کے حسین چہرے کے پیچھے ایک پیلی زرد شکل نظر آئی۔ شک اور حسد کی بیماری نے جس کا سارا لہو، ساری بشاشت چاٹ لی تھی۔

"مجھے آپ کی حالت پر سخت افسوس ہے اور اپنی قسمت سے گلہ......اور سب سے بڑھ کر اپنی محبت پر پچھتاوا جو مجھے آپ کی یہ تصویر پہلے دکھائی نہ دی۔" وہ بستر سے اتر کر نیچے چلی آئی۔ ضبط غم سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کے روئے مگر وہ اس بے حس اور بے قدرے کے سامنے کمزور پڑنا نہ چاہتی تھی۔

''میرے ساتھ زیادہ جذباتی قسم کے ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔'' وہ بھی تیزی سے اٹھا اور اپنی الماری کی وہ دراز کھولنے لگا جو لاک رہتی تھی۔

''جانتا ہوں...... تمہارا اور زید کا رشتہ...... اور تمہاری وہ محبت جس کا ایک ہاتھ زید کے دل پر رہتا ہے تو دوسرا میرے دل پر۔'' وہ زہر اگلے جا رہا تھا جبکہ وہ مٹی کے بے جان بت کی طرح کرسی پر ڈھے چکی تھی۔

''لو یہ دیکھو...... اپنی اور زید کی محبت کے ثبوت...... اور میرے اعتماد کی قیمت۔'' اس نے وہ سیاہ ڈائری دراز سے نکال کر اس کے منہ پر دے ماری۔ وہی سیاہ ڈائری جو زید کئی روز پہلے اسے یہ کہہ کر دے گیا تھا کہ وہ اسے احتیاط سے سنبھال کر رکھے اور اکیلے میں پڑھے اور جسے وہ کہیں رکھ کر بھول گئی تھی شاید...... بلکہ نہیں۔ اسے تو یقیناً تب ہی احمد نے اٹھا لیا تھا بلکہ چرا لیا تھا اور اب...... اب وہ اسی ڈائری کو بنیاد بنا کر اس کے کردار پر سیاہی مل رہا تھا۔



جیلانی ہاؤس کی جگمگاہٹوں اور اس کے مکینوں کی خوشیوں کو واقعی کسی کی بُری نظر لگ گئی تھی۔ جہاں ہر وقت ہنسی کے ترنم پھوٹتے رہتے تھے وہاں کے در و دیوار سے وحشت چمٹ کر رہ گئی تھی۔ اسپس اور ممیس کے نہ صرف گھروں میں بلکہ ان دونوں کے دلوں میں بھی وسیع فاصلے حائل ہو چکے تھے۔ نور محمد اور طاہرہ بیگم اپنے بچوں کو یوں بکھرتا دیکھ کر بے حد پریشان تھے۔ بظاہر تو انہوں نے چپ تان رکھی تھی مگر اندر ہی اندر ہر لمحہ وہ کڑھتے رہتے تھے۔ اس رات کے ہنگامے کے بعد زید تو اگلی صبح ہی گھر سے چلا گیا تھا۔ کہاں؟ یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ نہ ہی کسی نے کچھ پوچھا نہ کسی سے تحقیق کیا۔ وہ چلا تو گیا تھا مگر پورے خاندان کے لبوں سے ہنسی بھی چھین کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ مجرم بنا دیا گیا تھا لیکن بہت سارے دل ابھی بھی اس کے بے گناہ ہونے کی شہادتیں دے رہے تھے۔ مثلاً تکلم بیگم کا دل جو ایک ماں کا دل تھا اور رو رو کہتا تھا۔ طاہرہ بیگم کا دل جن کی گود سے آج بھی زید کے باپ کے بچپن کی نرماہٹیں نہ گئی تھیں تو زید کے لمس کیسے چھٹتے؟

نور محمد جیلانی کا دل...... جو زید کے قدموں کی چاپ سن کر ہی ہمکنے لگتا تھا۔ ستارہ کا دل جس کی دھڑکنیں دن میں کئی بار اس کی خیر و سلامتی کے لیے دعا گو ہوا کرتی تھیں۔ جس کی زندگی میں اسی کی ذات سے ایک بھائی کی محبت اور اعتماد کا رنگ تھا اور ایک عیون کا دل...... بڑا نازک اور مغموم سا دل جو زید کے نام پر اس وقت سے دھڑک رہا تھا جب اسے محبت کے معنی بھی نہیں آتے تھے۔ جو زید کو ٹھیک معنوں میں سب سے زیادہ جاننے کی دعویدار تھی۔ وہ

ان میں عیون ہی تھی۔ جس کے دل میں اب بھی ذرہ برابر بال نہ تھا۔ ذرہ برابر وہم یا بُرا گمان نہ تھا۔ اس نے تو کردار کے لحاظ سے زید کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس کی زندگی میں بے شمار ایسے موقعے آئے تھے جب زید اس کے ساتھ بے تکلف ہو سکتا تھا۔ کوئی چھیڑ چھاڑ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے تو آج تک اپنے دل کی بات کو زباں پر آنے بھی نہ دیا تھا۔ وہ تو اپنی آنکھیں بھی عیون سے چرائے رکھتا تھا کہ مبادا وہ اس کی آنکھوں سے اس کے دل کا بھید نہ پا لے۔ بڑی شرم، بڑی عزت اور غیرت والا تھا وہ...... وہ ہرگز بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ زید کی نیت گھر کی لڑکیوں پر خراب رہتی تھی اور زائرہ...... زائرہ کے لیے زید...... نہیں ہرگز نہیں...... زید تو صرف مجھے چاہتا ہے ہمیشہ سے ہمیشہ تک۔

اس کے اندر سے بس یہی ایک آواز آ ئی تھی۔ سچی اور کھری آواز...... کچھ ایسا ہی عالم ستارہ کی سوچوں کا بھی تھا۔ وہ بھی، جانے کب سے اس سیاہ ڈائری کو ہاتھوں میں لیے پریشان تھی جس کی بناء پر احمد حسن نے اس کا اسکینڈل زید کے ساتھ بنا دیا تھا۔

''زید اور میں؟''

''میں اور زید؟ اُف میرے اللہ...... اتنا گندا الزام...... ایسی گھٹیا سوچ...... احمد حسن کی سوچ میرے بارے میں ایسی بھی ہوگی یہ تو کبھی میرے وہم و گمان مین بھی نہ تھا۔'' اس کے خیالات زخمی ہونے لگے۔ احمد اس کے دل کے جس اعلیٰ مقام پر مقیم تھا وہ مقام ہی زمیں بوس ہو گیا۔ دھڑ...... دھڑ...... دھڑ ڑڑ...... اس کے اعتماد، اس کے مان کی دیواریں ایک ایک کر کے گر گئیں۔

''کیا یہ وہی احمد حسن ہے جسے میں نے اپنے شعور کے پہلے قدم پر ہی اپنے ساتھی کے طور پر پسند کر لیا تھا جو مجھے سب سے اچھا...... سب سے جدا اور سب سے بہتر لگا تھا کیا یہ وہی احمد ہے؟'' اس کا دماغ سلگ سلگ کے دھواں ہو رہا تھا۔

اس نے وہ ڈائری کھولنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی اور اسے اٹھا کر اپنی الماری کی ایک دراز میں ڈال دیا۔ یہ ڈائری کس کی ہے؟ اس میں ایسا کیا ہے؟ جس نے احمد کے دل میں دراڑ ڈال دی ہے اسے یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔

زید کے جانے کے بعد زائرہ کے راستے سے سارے کانٹے صاف ہو چکے تھے۔ جواد کے ساتھ اس کا ہونے والا نکاح بھی خود بخود ساکت ہو چکا تھا نہ صرف ساکت بلکہ مستقبل میں بھی اب اس کے ہونے کے کوئی امکانات باقی نہ رہے تھے۔ لہٰذا اب وہ بے فکر ہو گئی تھی۔ اب زید گھر واپس آ بھی جاتا تب بھی اس گھر میں اٹھنے والی دیواریں نہ گرتیں۔ جیلانی ہاؤس

کا صحن اب کبھی ایک نہ ہوتا۔ وہ اپنے پلان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اب وہ پوری طرح سے آزاد تھی۔ حسان کے ساتھ اس کی شادی اب کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہ تھی۔ اس لیے اس نے حسان کو "جلدی" پر مجبور کرنا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی اس کے امتحانات شروع ہو رہے تھے اس لیے وہ فی الحال اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اسے پتہ تھا اگر اس کا رزلٹ ذرا بھی گڑبڑ آیا تو اس کے ابا جان اسے کبھی معاف نہ کریں گے کیونکہ عمیس جیلانی کے دماغ میں تو پہلے سے یہ کیڑا کلبلاتا رہتا تھا کہ ان کے بچے فیملی میں سب سے آگے ہوں۔ اب تو انہوں نے اس بات کو چیلنج ہی لے لیا تھا۔ اب تو انہوں نے زائرہ کو صاف لفظوں میں تنبیہہ کر دی تھی کہ وہ اسے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہی بنا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کے کاروبار کو سنبھالنے میں ان کا مضبوط بازو بنے۔ اسے یہ حساب وساب ذرہ برابر پسند نہ تھا مگر اب وہ کیا کرتی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔



زید کو گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور ان پندرہ دنوں میں طاہرہ بیگم بستر سے آ لگی تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر جو ہمیشہ ہائی رہتا تھا جسے مستقل ادویات سے کنٹرول رکھنا پڑتا تھا ایک دم سے لو (LOW) ہو گیا تھا اور لو بھی اتنا کہ جس نے انہیں لاغر بنا کر بستر پہ ڈال دیا تھا وہ ایک غنودگی کی سی کیفیت میں پڑی رہتی تھیں۔ ہر طرح کا علاج ہو رہا تھا مگر بلڈ پریشر تھا کہ بہتر ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ پورا گھر اس وجہ سے پریشان تھا اور سب سے زیادہ نور محمد جیلانی صاحب کا برا حال تھا اب بھی وہ ان کے سرہانے کرسی رکھے بیٹھے تھے۔

"اٹھو طاہرہ! یہ تھوڑا سا کارن فلیکس ہی کھا لو۔" وہ انہیں بڑی ہی محبت سے سہارا دے کر اٹھا رہے تھے۔ پاس ہی ستارہ ٹرے میں دودھ اور دلیہ لیے کھڑی تھی۔

"آں...... ہاں...... آہ...... آہ...... آہ......" طاہرہ بیگم نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔

"اٹھیں ناں نانو کچھ تو کھا لیں۔" ستارہ ٹرے ایک طرف رکھ کر ان کی طرف بڑھی اور ان کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر انہیں اٹھا کر ان کی پشت کو سہارا دینے کے لیے ان کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"تارہ! میری جان!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"نانو!" اس نے جواباً بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ دونوں کا درد مشترک تھا جس کی مسیحائی کا اظہار یہ بے ساختہ کا اظہار محبت ہی تھا۔

"نانو یہ تھوڑا سا کھا لیں۔ بس تھوڑا سا۔" وہ ان کے منہ مین دلیے کا چمچہ ڈالتے ہوئے

منت کر رہی تھی جسے کھانے پر وہ آمادہ نہ تھیں مگر ستارہ کی محبت میں زبردستی کھا رہی تھیں۔

نور محمد صاحب انہیں کھاتا ہوئے دیکھ کر کچھ مطمئن ہو گئے اور کرسی پر دوبارہ بیٹھ کر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگے۔

"بس...... اور نہیں۔" تیسرے چمچ کے بعد انہوں نے ستارہ کا ہاتھ روک دیا۔

"نہیں...... نہیں اور بس...... بس دو چمچ اور......" وہ بھی ضد کر رہی تھی۔ لاڈ اور پیار کی ضد۔

"نہیں کھایا جاتا...... میرا جی برا ہو رہا ہے۔" وہ کھانے کو تیار نہ تھیں۔

"کچھ نہیں ہو رہا...... آپ کو کھانا پڑے گا۔ کھائیں گی نہیں تو ٹھیک کیسے ہوں گی۔ چلیں شاباش منہ کھولیں۔" وہ انہیں پیار سے ڈانٹ رہی تھی۔

"تارہ! مجھے قے ہو جائے گی۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

"نہیں ہوتی...... بس آپ اپنے جی سے یہ وہم نکال دیں۔" اس نے زبردستی چمچہ ان کے منہ میں ڈال دیا۔

"دیکھا ہے آپ کی حالت کیا ہو گئی ہے نہ کھانے سے؟" وہ ان کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے بہت پیار سے بولی۔

"میرا دل نہیں کرتا۔" وہ بے بسی سے بولیں۔

"اپنے دل کو سمجھاؤ طاہرہ! اس طرح بھلا کب تک چلے گا؟ کھانا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے ورنہ بلڈ پریشر کیسے نارمل ہو گا؟" نور محمد جیلانی بھی انہیں سمجھانے لگے۔

"میاں صاحب! آپ بھی مجھے ہی ڈانٹ رہے ہیں؟" طاہرہ بیگم بچوں کی طرح خفا ہو گئیں۔

"میں ڈانٹ نہیں رہا طاہرہ! تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم جو دل چھوٹا کر کے پڑ گئی ہو۔ ہمت ہار کے لیٹ گئی ہو اس طرح تو میں بھی تنہا اور پریشان ہو جاؤں گا۔" وہ ان کے قریب کرسی کو گھسیٹتے ہوئے بولے۔

"میں کیا کروں جیلانی صاحب!" وہ رو دینے کو تھیں۔

"ہمت کرو...... ہمت...... اور اٹھ کر بیٹھو۔" انہوں نے بڑی نرمی سے طاہرہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں حوصلہ دیا۔

"آپ کو تو پتہ ہے ناں...... زید! زید!" ان کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے سب پتہ ہے۔ سب پتہ ہے کہ زید کیا ہے کیسا ہے؟" وہ ان کی آنکھوں سے بہہ

جانے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے پونچھتے ہوئے بولے۔

''وہ کہاں چلا گیا؟ کیوں چلا گیا؟'' طاہرہ بیگم کے دل کو لگا روگ عیاں ہو کر سوال بن ہی گیا۔

''آجائے گا وہ...... جلد آجائے گا تم خود کو سنبھالو۔'' وہ انہیں تسلیاں دینے لگے۔

''آپ کو پتہ چلا وہ کہاں ہے؟ بتایئے ناں؟'' وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں...... ہاں وہ خیر سے ہے۔''

''نہیں آپ مجھے بہلا رہے ہیں؟'' انہیں پھر بھی یقین نہ آرہا تھا۔

''مجھ پر بھروسہ کرو بیگم!'' وہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر یقین دلا رہے تھے۔ جس پر بھروسہ کر کے وہ واقعی چپ ہو گئیں۔

''طاہرہ! اس وقت ہمارے بچوں کو ہماری بہت ضرورت ہے۔ ہمیں خود کو مضبوط رکھنا ہو گا تاکہ انہیں حوصلہ دے سکیں۔ ہمارے گھر کی دیواروں میں پانی پڑ رہا ہے اس سے پہلے کہ یہ پانی ان دیواروں کی بنیادوں کو کمزور کرے۔ ہمیں اس کا تدارک کرنا ہو گا اور تم جانتی ہو ناں؟ میں تن تنہا یہ سب نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے سب سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے۔ طاہرہ بیگم! خود کو حوصلہ دے کر اٹھاؤ ورنہ میں تنہا ہو جاؤں گا۔ کمزور پڑ جاؤں گا۔''

ستارہ دیکھ رہی تھی اس کے بے حد پیارے نانا جان بھی اس وقت بڑے کمزور اور بیمار نظر آنے لگے تھے۔

''نانا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں نانو'' ستارہ نے ان کے کندھوں کو ہولے ہولے دباتے ہوئے کہا۔

''نانو! سب لوگ بہت پریشان ہیں۔ سارے گھر میں خاموشی اور ویرانی ہے۔ کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا۔''

''اور تم...... تم میری بچی! کیا تم پریشان نہیں ہو؟'' وہ بڑی کمزوری اور نقاہت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پوچھ رہی تھیں۔

''میں...... میں بھی پریشان ہوں نانو...... مجھے بھی آپ کی ضرورت ہے؟'' اس نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ جو واقعی بے حد پریشان تھی اور خود کو تنہا اور بے بس پا رہی تھی۔

''میری بچی! میری جان!'' انہوں نے اپنا کانپتا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

''میاں صاحب! میرے آشیانے کو کس کی نظر لگ گئی؟'' طاہرہ بیگم گلوگیر لہجے میں

بولیں۔

''کسی دشمن کی بُری نظر لگ گئی ہے بیگم! مگر ہم خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ بس تم اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو۔ اس کی مدد طلب کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے پھر سے ان کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھائی۔

''جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہم سے کسی بات پر خفا ہو گئے ہیں تبھی ہم پر اچانک یہ افتاد آن پڑی ہے۔'' انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا آسرا نظر آنے لگا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اٹھو ہمت کرو اور اللہ سے دعا مانگ کر اپنے خاندان کی شیرازہ بندی میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ میرا آشیانہ اتنا کمزور نہیں کہ آزمائش کی ایک تند ہوا سے بکھرنے لگے۔ نہ ہی میں ایسا ہونے دوں گا۔''

انہوں نے طاہرہ بیگم کی کمر کے گرد اپنے بازو حائل کر کے انہیں بستر سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

''بیگم! میں صرف عمر رسیدہ ہوا ہوں لاغر نہیں جو تمہارا سہارا نہ بن سکوں۔ میرے ساتھ قدم ملا کر چلو۔ ہم آج بھی اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے زمانے سے لڑ سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' طاہرہ بیگم ان کے اور ستارہ کے سہارے سے اٹھ کر بستر سے نیچے اتر آئیں۔ وہ اپنے قدموں پر ابھی خود نہیں چل سکتی تھیں پندرہ دن کی مسلسل بیماری، صدمے اور الجھی ہوئی سوچوں نے انہیں واقعی کمزور کر دیا تھا۔

''ستارہ اپنی بڑی ماں کو باتھ روم لے جاؤ اور وضو کرا دو۔ نماز عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' انہوں نے سامنے لگے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہو! مجھے بھی دیر ہو گئی میں بھی جلدی سے نماز پڑھ لوں۔ آج تو جماعت بھی نکل گئی۔'' وہ جماعت کے نکل جانے پر بے حد نادم تھے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ جبکہ ستارہ اپنی نانو کو وضو کرانے لگی۔



ستارہ اور احمد حسن کے بیچ ایک دیوار جو کھنچ آئی تھی وہ دن بدن اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ خاموشی جو دونوں طرف جم چکی تھی وہ دونوں کے بیچ خلیج بنتی جا رہی تھی۔ بے شمار اَن کہے اور اَن سنے الفاظ تھے جو پتھر ہو ہو کے ان کے دلوں پر بوجھ بن رہے تھے۔ ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پر وہ دو اجنبیوں کی طرح ہو گئے تھے۔ حالانکہ دونوں ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ستارہ اسی طرح سے احمد کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کے آفس جانے کی

تیاری سے لے کر اس کے واپس آنے تک وہ اسی کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ رسمی سی بول چال بھی دونوں کے درمیان ہوتی تھی۔ مگر وہ باتیں وہ مسکراہٹیں اور وہ نظروں کی گدگداہٹیں جو زندگی میں محبت کی علامت تھیں۔ جن کی حرارت سے خوشی ان کے دلوں میں دھڑک رہی تھی۔ وہ سب برف ہو گئی تھیں۔

کبھی احمد سوچتا تھا...... کیا ستارہ ویسی ہو سکتی ہے جیسی میں سوچ رہا ہوں۔ کبھی وہ اپنی اس سوچ کو جھٹک دیتا اور خود کو ملامت کرنے لگتا۔ مگر اگلے ہی لمحے زید کے لیے پیدا ہو جانے والی ڈھیر ساری بُری سوچیں اور خیالات اسے گھیر لیتے۔ تب اس کا دل و دماغ دونوں سلگنے لگتے اور وہ سوچتا۔ ستارہ بُری نہ بھی سہی مگر زید کی بُرائی تو ثابت ہو چکی ہے وہ تو ایسا ہی تھا۔ پھر اسے زید اور ستارہ کے بیچ تبادلہ پانے والے ذو معنی جملہ یاد آنے لگتے۔ جو اکثر زید کی کسی شرارت سے شروع ہوتے اور پھر ان دونوں کے بیچ کی بے تکلف دوستی۔ وہ اپنے جلتے ہوئے دماغ کے ساتھ جھلا کر سوچتا سب ممکن ہے سب ممکن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ستارہ کیا اس کی خاطر مجھ سے خفا رہتی۔ وہ بھی اتنے دن اور اتنی زیادہ؟ وہ اس کے یوں اب تک کھنچے کھنچے رہنے پر بھی بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ اُدھر وہ رات کو جب اس کی طرف سے کروٹ بدل کر دوسری طرف چہرہ کر کے لیٹتی تو اس کی ہر وقت آنسوؤں سے بھری رہنے والی آنکھیں جھرنے بن جاتیں۔ اسے احمد کی محبت کی وہ شدتیں یاد آنے لگتیں جو اسے ایک پل کو قرار نہ لینے دیتیں۔ کیسے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے بہانے بہانے سے اپنے کمرے میں بلا لایا کرتا تھا۔

"کیا ہے احمد؟" وہ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر نظریں چراتی ہوئی کہتی تھی۔

"بہت کچھ ہے سب کچھ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ کر وارفتگی سے کہتا۔

"بہت کچھ کیا؟" وہ اس کے دھڑ، دھڑ کرتے دل سے اور بھی گھبرا جاتی۔

"یہی کہ تم...... تم؟" وہ اسے ستانے کو جان بوجھ کر ادھوری بات کرتا۔

"میں کیا؟" وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھتی مگر وہاں ان آنکھوں میں دنیا جہان کی شرارت اور جذبات کی شدت دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔

"تم بہت خوبصورت ہو۔" وہ اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا۔

"مجھے بہت کام ہے۔ جانے دیں۔" اس کے اتنے قرب سے تو اس کی جان بھی پگھلنے لگتی۔

"باقی سارے کاموں کو بھاڑ میں جھونک دو۔ صرف یہاں بیٹھو میرے پاس۔" وہ اسے

کندھوں سے تھام کے بٹھا لیتا۔

"ستارہ! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میں گھر میں ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہو۔" وہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دیتا۔

"بھلا یہ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ تم میرے سامنے ہو کر بھی مجھ سے غافل ہو۔" وہ خود غرضی کی حد تک اسے اپنا بنائے رکھنے پر مُصر رہتا تھا۔

"مگر گھر میں اور لوگ بھی ہیں اور کام بھی۔" وہ بالکل ہلکا سا احتجاج کرتی۔

"سب کو میری غیر موجودگی میں نمٹا لیا کرو۔" وہ بڑی ہی محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیتا اور پھر اسے کافی دیر تک ہلنے نہ دیتا اور اک جذبے کے عالم میں دیکھتا رہتا اسی طرح رات کو جب وہ لوگ سونے کے لیے لیٹتے تو وہ اپنا بازو اس کے سر کے نیچے رکھ دیتا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمائے رکھتا اسی طرح سے باتیں کرتا رہتا۔ دیکھتا رہتا۔

"احمد! آپ کا بازو تھک گیا ہوگا۔" کچھ دیر کے بعد وہ اس کا ہاتھ اپنے سر کے نیچے سے نکالنا چاہتی۔ اسے واقعی اس کی تھکن کا احساس ہوتا تھا۔

"بھلا کوئی پھولوں کے وجود کو بھی بوجھ سمجھ سکتا ہے۔" وہ پیار سے اس کا سر پھر اپنے بازو پر رکھ لیتا۔ تب وہ اس کی اتنی زیادہ محبت پر نازاں ہو جاتی۔

"احمد! آپ بہت اچھے ہیں۔"

"بس اچھا......" وہ شرارت سے پوچھتا تو وہ شرم سے اپنی نگاہیں جھکا لیتی۔

"ارے...... رے یہ ظلم تو مت کرو۔ ان آئینوں پر چلمن مت گرایا کرو۔ مجھے اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا۔" وہ اس کی پلکوں کو ہولے سے چھو کر جذباتی انداز میں کہتا۔

"پتہ ہے میں نے کتنا ہجر کاٹا ہے؟ کتنا دور رہا ہوں اس چہرے سے ان آنکھوں سے اور اس جان سے مار دینے والی خوشبو سے۔"

وہ اسے خود سے قریب کرتے ہوئے ایک لمبی سی سانس اپنے اندر بھرتے ہوئے کہتا تب وہ اس کے پہلو میں خود کو کتنا محفوظ اور مغرور تصور کرتی تھی اور اب وہ اپنی گھٹی گھٹی سی سسکیوں کو دبانے کے لیے اپنا چہرہ تکیے کے نیچے دبا لیتی۔

❖......O......❖

رات کے دو بج رہے تھے اور زائرہ کے کمرے سے ابھی تک روشنی آ رہی تھی۔ یقیناً وہ جاگ رہی تھی۔ "پڑھ رہی ہوگی؟ اس کے امتحانات جو ہو رہے ہیں۔" کوریڈور سے گزرتی ہوئی ترنم بیگم نے سوچا۔ "مگر یہ سرگوشیاں؟"

کچھ ہلکی ہلکی سی آوازوں نے ان کے جاتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔

''وہ باتیں کر رہی ہے۔ رات کے اس پہر؟'' ممتا کے فکر مند احساس نے انہیں متجسس کر دیا اور نا چاہتے ہوئے بھی اس کے کمرے کے باہر جا کھڑی ہوئیں۔

''ہوں...... ہوں...... ہاں ہاں...... ہی ہی...... ہی ہی...... ہی ہی......'' بڑی راز داری اور آہستگی سے وہ کسی بات کا جواب دیتی اور پھر ہنس دیتی۔

ایسی ہنسی جس کے بہت سارے معنی تھے۔ ایک غیر شادی شدہ جوان لڑکی رات کے تیسرے پہر یوں سرگوشیاں کر کر کے ہنستی ہو تو یہ بات اس کے قدموں کے بہک جانے کی بُری خبر ہوا کرتی ہے تو اس کے والدین کی بدنصیبی کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ترنم بیگم کی چھٹی حس جو بہت پہلے سے بڑے بے کل تھی ایک دم بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ وہ تو پیاس محسوس ہونے پر پانی پینے اٹھی تھیں مگر وائے قسمت کہ آج ان کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پانی کا جگ موجود نہ تھا اس لیے وہ کچن میں پانی لینے جا رہی تھیں مگر زائرہ کے کمرے سے آتی روشنی اور سرگوشیاں ان کے قدموں کی زنجیر بن گئیں۔ ان سے زیادہ صبر نہ ہوا انہوں نے کمرے کا دروازہ بجا ہی دیا۔

''ٹھک...... ٹھک......'' اندر سے آتی ہنسی گھگھیانے لگی۔

''کک...... کک...... کون؟'' آواز میں ایسا خوف تھا جو ایک ایسے چور کی چوری پکڑے جانے پر اس پر چھا جایا کرتا ہے۔ جو گھر کا بھیدی ہو۔ جس کا ارادہ اپنے ہی گھر میں نقب لگانے کا ہو۔

''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک۔'' ترنم بیگم کا ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ زور سے دروازے پر پڑا۔

''کون ہے اس وقت؟'' اندر کی آواز بدستور خوفزدہ تھی۔

''دروازہ کھولو زائرہ! میں ہوں۔'' ترنم بیگم نے اپنے غصے پر قابو پا کر نرمی سے اور دھیمی آواز میں کہا وہ تیز بول کر گھر کے باقی افراد کو جگانا نہ چاہتی تھیں۔

''امی جان! آپ اور اس وقت؟'' زائرہ دروازے کے دونوں پٹ کھولے کھڑی تھی۔

''ہاں میں اس وقت۔'' وہ اسے ایک طرف کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں ان کی نظریں اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

''کیا ہوا امی! خیریت تو ہے۔ آپ کس کو تلاش کر رہی ہیں۔'' زائرہ اب کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی اس نے اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا جو اسے خود پر تھا۔

''تم کیا کر رہی تھیں اس وقت؟ تمہارے کمرے کی بتی کیوں روشن ہے اب تک؟''

ترنم بیگم کی آواز مدھم ہونے کے باوجود تیکھی اور نوکدار تھی۔ جس پر زائرہ کو اپنا پہلو بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنا انداز بھی بدلنا پڑا۔

''ممی جان! میرے پیپرز ہو رہے ہیں آج کل تو ظاہر ہے میں پڑھ رہی تھی اور کیا کروں گی رات کے سوا دو بجے تک۔'' اس نے وقت دیکھتے ہوئے بڑے لاڈ و ادا سے جواب دیا۔

''مگر تمہاری سٹڈی ٹیبل پر نہ تو کوئی کتاب ہے نہ نوٹس؟'' وہ بھی خالص تفتیشی انداز اپنائے ہوئے تھیں جس پر وہ کچھ سٹپٹا گئی۔

''میں نے ابھی کتابیں بند کی ہیں میں بس اب بستر میں لیٹنے ہی جا رہی تھی۔'' اس نے پھر بہانہ بنایا۔

''مگر تم تو کسی سے باتیں کر رہی تھیں؟'' وہ صاف صاف پوچھنے لگیں۔

''میں...... میں...... باتیں...... کس سے کروں گی باتیں۔ وہ بھی اس وقت؟'' زائرہ کے حواس اس لمحے تو باختہ ہی ہو گئے جب اس نے اپنی ماں کے منہ سے یہ سنا تو۔

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ تم اس وقت کس سے فون پر باتیں کر رہی تھیں؟'' وہ زائرہ کے بستر پہ پڑے ہوئے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''اچھا...... وہ...... وہ میں...... میں...... میں رامین سے کچھ سٹڈی ڈسکشن کر رہی تھی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے بات بنالی۔

''دیکھو زائرہ! مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ سچ سچ بتا دو تم آج کل کن چکروں میں ہو؟'' وہ اسے اپنے ساتھ لے کر قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں ماں ہوں تمہاری...... مجھ سے کچھ بھی مت چھپاؤ۔'' وہ بڑے پیار سے پوچھنے لگیں۔

''کیا بتا دوں امی جان؟'' وہ بالکل انجان بن گئی۔

''تم جانتی ہو کہ تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔

''زائرہ! ماں سے راز رکھنے والی بیٹیاں بڑے دکھ اٹھاتی ہیں۔ نہ صرف خود دکھی ہوتی ہیں بلکہ اپنی ماؤں کو بھی روگی بنا دیتی ہیں۔''

زائرہ دیکھ رہی تھی اس کی ماں کی آنکھوں میں کوئی دکھ ابھی سے لہریں لینے لگا تھا وہ ان

کے کنارے بھیگتے دیکھ کر لمحہ بھر کو خود بھی پانی ہوگئی۔

''زائرہ! مجھے بتادو حقیقت کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سچ نہیں ہے سچ کیا ہے۔ مجھے بتادے میری بیٹی۔''

ان کا مہینے بھر سے جلتا ہوا دل بھرے ہوئے پھپھولے کی طرح پھوٹ پڑا۔

''میری پیاری امی جان! آپ کو کوئی وہم ہو رہا ہے میں سچ مچ رامین سے ہی بات کر رہی تھی۔ اچھا ٹھہریں میں آپ کی بات رامین سے کرواتی ہوں۔'' اس نے بڑی محبت سے ماں کے ہاتھوں کو تھام کر ان پر بوسہ دیا اور موبائل اٹھا کر رامین کو فون کرنے لگی۔

''اچھا رہنے دو۔ رہنے دو۔ مت کرواسے فون وہ کیا سوچے گی کہ میں۔'' وہ اپنی عزت کا خیال کر کے اسے روکنے لگیں۔

''وہ کچھ بھی نہیں سوچے گی اور اگر سوچتی ہے تو سوچا کرے۔ آپ کا وہم تو دور ہوگا ورنہ آپ خواہ مخواہ مجھ پر جانے کیا کیا شک کرتی رہیں گی۔'' وہ زبردستی نمبر ملانے پر مُصر ہوگئی۔

''بس کرو...... کہا ناں رہنے دو۔'' آخر کار ترنم بیگم نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

''میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں...... مجھے اور نہ ستاؤ۔'' وہ دکھی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''امی...... امی جان! آپ کیوں پریشان رہتی ہیں۔ کیوں اتنی ٹینشن لیتی ہیں۔ بھول جائیں جو ہوا۔'' وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے بولی۔

''کیا بھول جاؤں؟'' انہوں نے اس کی بانہیں ذرا سختی سے پکڑ کر خود سے الگ کر دیں ان کی آنکھوں میں مچلتے سوالات کو دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''بھول جاؤں میری بہن مجھ سے جدا کر دی گئی۔ بھول جاؤں دو بھائیوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیا گیا اور بھول جاؤں اس گھر کے بزرگوں کو اپنے بچوں سے دور کر دیا گیا اور...... اور بھول جاؤں کہ کس طرح سے ہنستے کھیلتے آشیانے کو آگ لگا دی گئی۔ بولو کیسے بھول جاؤں اور کیوں؟'' وہ اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ رہی تھیں۔ جیسے وہی اس سارے کیے دھرے کی وجہ ہو۔

''امی جان پلیز......'' اس نے انہیں اس قدر جذباتی ہوتا دیکھ کر خود کو ان سے چھڑایا اور منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔

''بہر حال زائرہ! جو ہوا وہ ہونا نہیں چاہیے تھا اور جس نے کیا وہ خود بھی کبھی خوش نہ

رہے گا۔ کہ محبتوں کی قدر نہ کرنے والے۔ رشتوں کو نعمت جان کر ان کا شکر ادا نہ کرنے والے۔ خوشی کو نہیں پا سکتے۔ ''خوشی'' جو صرف اللہ کی رحمت سے ملتی ہے۔'' کہتے کہتے وہ رو پڑیں۔

''ابھی بھی وقت ہے زائرہ محبتوں کی قدر کرنا سیکھ لو۔ روٹھے ہوؤں کو منانا ناممکن نہیں ہوتا۔'' وہ اس کی طرف منت کرنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''رشتے ریشم کی طرح ہوتے ہیں۔ الجھ جائیں تو سلجھ سکتے ہیں لیکن اگر ان میں گرہیں زیادہ سخت ہو جائیں تو پھر یہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ رشتے ٹوٹنے نہیں چاہئیں۔''

''زائرہ!'' انہوں نے کمرے سے جاتے جاتے رُک کر اس پر ایک ساجت کرتی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گئیں۔

''اوہ شٹ......'' زائرہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا موبائل غصے سے بیڈ پر مارا۔

''میں کیا کروں...... کیا کروں؟'' اپنا گھومتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھر وہ خود بھی بیڈ پر گر گئی۔



ادھر شاہانہ کے گھر عجیب صورتِ حال ہو چکی تھی۔ وہ میاں بیوی جو کبھی اک دوجے کے ساتھ بلند آواز میں بولے تک نہ تھے ان دونوں کے بیچ ہر لمحہ برہمی رہنے لگی۔ اس واقعے کے بعد معاذ میاں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ عیون اپنی بہن کے اکلوتے بیٹے موسیٰ کو دیں گے جو دمام میں انجینئر تھا جبکہ شاہانہ اس بات کے لیے ہرگز بھی تیار نہ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ غلط ہے۔ وہ غلط ہے۔ معاذ کی بہن دو چار روز میں دمام سے پہنچنے والی تھیں اس لیے یہ معاملہ اب اچھا خاصا جھگڑا بن چکا تھا۔

''دیکھو شاہانہ! اب بس کرو اپنے بھتیجے کی حمایت کرنی اور اپنا موڈ ٹھیک کرو تا کہ آپا کے آنے سے پہلے پہلے گھر کا ماحول بہتر ہو۔'' وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے اور میرے گھر کا ماحول بھی۔'' انہوں نے ہینگر سے کوٹ اتار کر میاں کو دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ منہ کیوں بسورے رکھتی ہو ہر لحظہ۔'' انہوں نے شاہانہ بیگم کے تنے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''میرا منہ ہے ہی ایسا۔'' وہ اسی طرح سے بولیں اور بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

"پہلے تو ایسا نہ تھا؟" معاذ ذرا ماحول بدلنے کو شرارت سے بولے۔

"آپ نے غور سے کبھی دیکھا ہی نہ ہوگا۔ ورنہ ایسا ہی تھا۔" وہ کمر پھیرے پھیرے اپنا کام کرتی رہیں۔

"اچھا دکھاؤ تو...... ذرا اب غور سے دیکھ لوں۔" معاذ نے انہیں بازو سے تھام کے اپنی طرف کرلیا اور ان کے چہرے کو واقعی غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے غور اور سنجیدگی سے کہ شاہانہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"کیا ہے...... چھوڑیں مجھے...... اور دفتر جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے کھسیا کر اپنا بازو چھڑایا۔

"ہاں واقعی دیر ہو گئی۔" معاذ نے سامنے میز پر ٹک ٹک کرتے ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر جانے لگے۔ مگر دو قدم کے بعد ہی پلٹے۔

"ویسے میں نے غور کیا ہے تمہارا چہرہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا رہا کہ بے حد خوب صورت اور فریش ہے۔ شاید واقعی پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا۔" انہوں نے اتنی پکی سی صورت بنا رکھی کہ شاہانہ کا رہا سہا غصہ بھی جاتا رہا اور وہ دل سے مسکرا دیں۔

"شاباش...... اب اچھی لگ رہی ہو اور اسی اچھے پن میں آپا کے آنے کی تیاریاں کرو اور ہاں عیون کو ان دو چار دنوں میں سمجھاؤ تو اچھا ہے۔" انہوں نے بڑے ہی سلیقے سے اپنی بات کہہ دی۔ جسے سن کر شاہانہ کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ پھر سے سکڑ گئی۔ وہ خاموشی سے الماری کے پٹ کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا کر پھر کام کرنے لگیں۔ معاذ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کی ہر بات مانتے اور ان کی ہر خواہش کا احترام کیا کرتے تھے۔ زید کو بھی انہوں نے عیون کے لیے اپنے دل سے پسند کیا تھا۔ وہ زید کو خاندان کے سب لڑکوں پر فوقیت دیا کرتے تھے اور جب بھی کوئی یہ کہتا کہ زید ابھی تک بڑا کھلنڈرا ہے۔ سنجیدگی سے نہیں پڑھتا۔ تو وہ اس کی حمایت لیتے ہوئے کہتے۔

"کچھ لوگ دنیا میں صرف کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آتے بلکہ ان سے تو قدرت نے بہت سے اور کام لینے ہوتے ہیں۔ وہ کام جو کسی کسی کے حصے میں آتے ہیں۔" اور اب وہ خود ہی کہہ رہے تھے کہ "میں ہی بے وقوف تھا جو اس سچ مچ کے کھلنڈرے لڑکے کے بارے میں خوش فہم تھا۔" مگر شاہانہ کا دل اب بھی اپنے اس کھلنڈرے بھتیجے کے لیے خوش فہم ہی تھا۔ وہ اب بھی یہی کہہ رہی تھیں۔

"زید لاپرواہ ہو سکتا ہے نالائق بھی مگر وہ بد کردار نہیں ہو سکتا۔" جس پر رات ہی معاذ اور

ان کے درمیان اچھی خاصی بحث ہو چکی تھی۔

"زید کے دل میں عیون نہیں زائرہ ہے شانی! تم کیوں نہیں سمجھتی ہو۔" معاذ اپنی پیاری بیوی کو سمجھا رہے تھے۔

"میں یہ نہیں مانتی نہ کبھی مان سکتی ہوں۔" وہ نہ ماننے پر بضد تھیں۔

"کمال ہے تم ثبوت ملنے کے باوجود انکاری ہو؟" معاذ زچ ہو کر بولے۔

"میں اس موبائل کو سوائے ایک دجالی فتنے کے کچھ نہیں سمجھتی۔ خدا غارت کرے اس کو عذاب بن گیا ہے یہ تو۔" وہ "موبائل" کے استعمال پر ہمیشہ سے خفا رہتی تھیں کہتی تھیں یہ آج کا سب سے بڑا فتنہ ہے جو مسلمانوں کی اولادیں برباد کرنے کے لیے فرنگیوں نے بھیجا ہے۔

"یہ ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔ اس کے فوائد اس کے نقصانات سے بڑھ کر ہیں۔ اس نے دنیا کو ایک گلوبل ویلیج بنایا ہی نہیں ثابت بھی کر دیا ہے۔" معاذ پہلے شاہانہ کو اس کے خلاف بولتے دیکھ کر سمجھایا کرتے تھے مگر اب زیادہ بحث نہ کر رہے تھے۔

"اگر تمہارے بھتیجے جیسے نالائقوں نے اس کا غلط استعمال شروع کر دیا ہے تو یہ چیز غلط ہو گئی ہے ناں؟" وہ چونکہ زائرہ کے موبائل پر زید کا بھیجا ہوا SMS خود پڑھ چکے تھے اس لیے ان کا دل زید کے لیے حقیقت میں برا ہو چکا تھا۔

انہوں نے شاہانہ کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اب وہ کسی صورت بھی اپنی بیٹی کا رشتہ اس لڑکے کو نہیں دیں گے جس نے خاندان بھر کی عزت کو مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ تو اس بات پر ہی تلملاتے رہتے تھے کہ زید نے اگر زائرہ ہی سے شادی کرنی تھی تو گھر والوں سے کہہ دیتا۔ یہ اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر اس کی غلیظ دھمکیاں کہ میں اٹھا کر لے جاؤں گا یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا۔ "بدتمیز! خود غرض! آوارہ۔" وہ بھی اسے غصے میں وہی گالیاں دے رہے تھے جو اکثر عمیس میاں دیا کرتے تھے۔

"معاذ! آپ کچھ تو صبر کریں۔ اتنی جلدی کیا ہے آپ کو؟" معاذ کو اس قدر بدگمان اور برہم دیکھ کر شاہانہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"صبر کس لیے؟ نہ آج نہ کل...... اب اس کا فضول ذکر میرے گھر میں ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا میں اس قصے کو ہی تمام کر دوں گا۔" وہ حتمی انداز میں بولے۔ اس کے بعد شاہانہ انہیں مزید سمجھا نہ سکیں اور چپ چاپ کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔

"زید۔" ایک سرد آہ ان کے لہو کو منجمد کرتی ہوئی ان کے لبوں سے نکلی۔

"پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ مگر جو بھی ہے اس نے جیلانی خاندان

کے اتفاق اور محبت میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔" وہ بے حد دکھی ہو گئیں۔ بے حد دکھی۔

❖......O......❖

آج کل وہ اپنے دوست بختیار کا روم میٹ (Room mate) تھا اور اس کے ساتھ کالج کے ہاسٹل میں رہ رہا تھا۔ اس نے بختیار کو یہی بتایا تھا کہ چونکہ وہ گھر پر رہ کر سنجیدگی سے پڑھ نہیں سکتا اسی لیے دادا جان نے اسے زبردستی اور جان بوجھ کر ہاسٹل بھیجا ہے۔

"اچھی بات ہے...... بہت مزہ آئے گا اور دونوں مل کر امتحانات کی اچھی تیاری کر لیں گے۔" بختیار تو یہ بات سن کر بہت ہی خوش ہو گیا تھا اسی لیے اس نے زید کو اپنے ساتھ بڑی سہولت سے ٹھہرا لیا تھا۔ اب وہ کالج سے ہاسٹل اور ہاسٹل سے کالج جاتا اور دکھاوے کی خاطر دن رات کتابوں میں بھی منہ دیئے رکھتا لیکن پڑھتا تو ایک لفظ بھی نہ تھا۔ بلکہ یوں کہہ لیں اس سے پڑھا ہی نہ جاتا تھا اس کے دماغ میں تو اپنے گھر والوں خصوصاً اپنے چچا عمیس کی شک اور نفرت سے بھری آوازیں ہتھوڑے برساتی رہتیں اور نظروں کے سامنے وہ تکلیف دہ منظر گھومتا رہتا جب ہر ایک نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ باوجود ہزار کوشش کے اس سانحے کو بھلا نہیں پا رہا تھا جس نے اسے مجرم بنا کر اپنے ہی گھر سے نکلوا دیا تھا۔ حالانکہ اسے کسی نے بھی گھر سے نکلنے کو نہیں کہا مگر اس وقت کی صورتِ حال اتنی گھمبیر ہو چکی تھی کہ اس کا وہاں ٹھہرنا بھی ممکن نہ رہا تھا لہٰذا اس نے چند گھنٹوں میں ہی اپنا پیارا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر جس کے در و دیوار سے اسے سچ مچ عشق تھا۔ جس کی کیاریوں کی مٹی تک اسے بے حد عزیز تھی۔ کیسا دیوانہ وار پیار تھا اسے اپنے گھر سے کہ وہ مالی بابا کو گملوں کی مٹی بدلتے دیکھتا تو اداس ہو کر کہتا۔

"بابا! اس مٹی کو گملوں سے نہ نکالا کرو۔" تب مالی بابا اسے دیکھ کر پیار سے مسکراتا اور کہتا۔

"اگر میں اس کی مٹی نہ بدلوں گا تو پھر نئے پودے کیسے پھلیں پھولیں گے؟"

"اچھا تو پھر اس مٹی کو ان کی مٹی میں ہی ملا دینا۔ کہیں باہر نہ پھینکنا۔" وہ اداسی سے کہتا۔

"ٹھیک ہے زید میاں...... جیسی آپ کی مرضی۔" مالی بابا ہنس کر کہتا۔

مگر اب وہ خود...... خود اسے حالات نے کس طرح سے ایک موسمی پودے کی طرح اس مٹی سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا تھا۔ وقت نے اس کے خلاف کیسی ساز باز کر لی تھی اسے کتنا بے کار اور بودا ثابت کر کے اس کی مٹی سے نکال دیا ہے۔ کیسے؟ وہ پھر سے حالات کے تانے

بانے بننے لگتا۔ مگر اس کی سوچیں پھر اسی ایک "کیوں" کے مقام پر آ کر الجھ جاتیں۔ آپس میں یوں گتھم گتھا ہو جاتیں کہ "گرہیں" بن جاتیں۔

"کیوں...... آخر کیوں؟ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟

اس لیے کہ میں اچھا کرنا چاہتا تھا؟

اس لیے کہ میں نے سچ کو اپنے گھر کی عزت کا بھرم سمجھ کر چھپا لیا تھا؟

اس لیے کہ میں اس عزت کا پاسدار بن رہا تھا؟"

اس کا دماغ سلگنے لگتا۔

"میں...... میں جا کر دادا جان کو سب بتا دوں گا اور عمیس چچا کو بھی...... جنہوں نے مجھے آوارہ...... بدکردار...... اور...... اور گھر کی عزت پر بُری نظر رکھنے والا کہا ہے۔ بتاؤں گا انہیں کہ اصل میں بُرا کون ہے؟"

وہ پانی بھرے چھالے کی طرح ابلنے لگتا جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے پھٹنے کو تیار کھڑا ہو۔

"بتا کر اپنے آپ کو ثابت کرو گے۔ اپنی نیکی اور پارسائی کا چرچا کر کے بتاؤ گے؟"

کوئی اس کا دل چٹکی میں لے کر کھینچتا۔

"کیا فائدہ؟ چیخ چیخ کر دوسروں کو اعتبار دلانے کا...... شور مچا کر...... قسمیں کھا کر اپنی گواہیاں خود دینے کا؟" اس کی خودداری اسے آگے نہ بڑھنے دیتی۔

"میرے خدایا!" وہ غم کی شدت سے پھٹتے ہوئے کلیجے کو تھام کے بیٹھ جاتا۔

"میں کیا کروں؟

تُو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔

میں تیرا ہی پیدا کردہ...... تجھ پر ایمان لانے والا تیرا ایک بندہ...... میں نے ایسا کیا کر دیا تھا کہ تُو نے مجھے یوں ذلت کے گڑھے میں اچانک ہی دھکیل دیا؟"

آج تو وہ بے حد رنجیدہ تھا۔ آج تنہائی، دکھ اور اداسی اسے مارے دے رہی آج اس کی ستارہ آپی کی سالگرہ تھی۔

ستارہ! جو اس کی ذات کے لیے ایک پورا آسمان تھی۔ چاندنی سے بھرا جگمگ جگمگ کرتا آسمان۔ جو اس کا زادِ راہ تھا۔ اس کی چھت تھا۔ جس سے اسے واقعی بہت محبت تھی۔ محبت جس کے حقیقی معنی دنیا والوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے۔ بلکہ دنیا والے تو اپنے اپنے ذہن کی اختراع سے اسے جانچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اس کے "معانی" کی توہین کرتے ہیں۔ جیسا اس کے معاملے میں ہوا تھا۔ وہ پھر اپنے گھومتے ہوئے سر کو پکڑ کے

بیٹھ گیا۔

"میں...... میں خود پر لگے ایسے گھناؤنے اور گندے الزامات کو کیسے برداشت کروں؟"

وہ ضبط کے باوجود رو رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے بے بس بچے کی طرح جو زمانے کی بھیڑ میں اپنوں سے بچھڑ گیا تھا۔

"میں...... میں کیسے ثابت کروں۔ کیسے بتاؤں دادا جان کو...... اپنی پیاری بی بی جان کو اپنی ماں کو...... اور...... اور عمیس چچا کو...... اور...... اور...... احمد بھائی...... جن کی آنکھوں میں میرے لیے اتنا شک اتنی بدگمانی بھری ہوئی تھی کہ وہاں نفرت کے سوا کچھ اور رہا ہی نہ تھا۔" وہ اپنے بڑے بھائی احمد حسن کے الفاظ یاد آ جانے پر پھر سے تڑپ اٹھا۔

"میرے اللہ! تُو نے مجھے آسمان سے زمین بوس کر دیا۔ کیا میں تیرا بندہ نہ تھا؟ اور...... کیا تجھے میری ذات...... میرا وجود نظر نہیں آتا؟" وہ اتنا دکھی ہوا کہ اپنے رب سے گلہ کر بیٹھا۔

"اتنے لوگوں میں مَیں اپنے اللہ کو کہاں نظر آتا ہوں گا کہ وہ مجھ سی ناچیز کو......" اس کی شکوہ کرتی سوچ بھی اس کے گلے میں پھنسے صبر کے نمکین گولوں کے سامنے ادھوری رہ گئی۔

"یا اللہ...... میرے اللہ!" وہ اپنی شہ رگ میں اک عجب سی ہلچل کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لہو میں گردش کرنے والے باغی خیالات پر جیسے کسی نے کمند ڈال دی تھی۔ اب وہ اپنے بچپن کے خیالات کی آہٹیں محسوس کر رہا تھا۔ نرم و گداز آہٹیں۔ جب وہ اسی طرح آسمان پر نظریں گاڑے کھڑا تھا ٹکٹکی باندھے تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"بی بی جان! آپ کہتی ہیں اللہ تعالیٰ آسمانوں میں رہتے ہیں۔ دور اتنی دور...... تو وہ ہمیں اتنی دور سے کیسے دیکھ لیتے ہیں؟ کیا میں بھی انہیں نظر آتا ہوں؟" سوال میں تجسس، معصومیت اور حیرت کا عجیب امتزاج تھا۔

(تب بی بی جان اتنی بوڑھی نہ تھیں اور وہ خود جوان نہ تھا۔)

"میرا بھولا بچہ! میری جان!" طاہرہ بیگم نے اسے گود میں اٹھا کر اس کے گالوں پر بوسہ کیا۔

"اللہ تجھے اتنے بے شمار لوگوں میں دیکھ رہا ہے اور تیری اتنی معصوم باتوں پر اسے تجھ پر پیار آ رہا ہوگا۔"

"مگر کیسے بی بی جان؟ میں اللہ کو کیسے نظر آتا ہوں گا۔" اس کے لہجے کی حیرت اس کی روشن آنکھوں میں بھی چھلکی نظر آ رہی تھی۔

"اچھا آؤ میں تمہیں سمجھاؤں۔" طاہرہ بیگم اسے گود میں اٹھائے اٹھائے اندر لے

آئیں جہاں ستارہ اپنی سکول کی کاپیوں پر جھکی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔

"ستارہ! تم اِدھر آؤ۔" انہوں نے ستارہ کو بھی اپنے قریب بلا لیا تھا اور وہ فٹ آ کر اپنی نانو کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"دیکھو اپنی ہتھیلی آگے کرو۔" طاہرہ بیگم نے زید کی ہتھیلی کھولتے ہوئے اپنی تسبیحوں والی چھوٹی سی ٹوکری میں سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں موجود گندم کے کچھ دانے نکال کر اس کی ہتھیلی پر پھیلا دیئے۔ جنہیں وہ اور ستارہ بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ (طاہرہ بیگم نے وہ اناج کے دانے اپنی وظائف کی تسبیحات کی گنتی کے لیے رکھے ہوئے تھے)

"یہ کیا ہے نانو؟" ستارہ بھی تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

"بتاتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا زید! اب تم ان اناج کے دانوں کو غور سے دیکھو۔" زید واقعی انہیں غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا تمہیں یہ سارے دانے نظر آ رہے ہیں؟" وہ زید سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی بی بی جان!" وہ بدستور ان دانوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"کیا ایک ایک دانہ دکھائی دے رہا ہے الگ الگ۔" وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

"جی نانو! یہ تو مجھے نظر آ رہے ہیں۔" اب ستارہ بھی معصومیت سے بولی۔

"بس تم یہ سمجھو کہ یہ اناج کے دانے ہم لوگ ہیں بلکہ ساری مخلوقات جو بھی اس زمین پر ہے وہ اناج کے ان دانوں کی طرح ہے جو اللہ پاک کی ہتھیلی پر موجود ہے اور اللہ تعالیٰ جو کہ سب سے بڑے ہیں۔ وہ باآسانی ان سب کو دیکھ رہے ہیں۔" طاہرہ بیگم نے بڑے ہی خوب صورت انداز سے ان دونوں بچوں کو سمجھایا۔

"اور ان دانوں میں کوئی میں ہوں...... کوئی ستارہ ہے اور کوئی زید۔" انہوں نے اپنی بات کی مزید تشریح کرتے ہوئے ایک ایک دانے پر انگلی رکھ کے انہیں سمجھایا۔ وہ دیکھ رہی تھیں اپنے اپنے نام کا دانہ ان دونوں بچوں کو اپنا اپنا وجود ہی لگ رہا تھا اور اپنی یوں شناخت ہو جانے پر دونوں کے چہروں پر بڑی ہی الوہی سی خوشی دمکنے لگی تھی۔

"اللہ اپنے ہر بندے کو دیکھ رہا ہے۔ بلکہ سمندر کے اندر موجود سیپ کے اندر رہنے والے ایک معمولی کیڑے کو بھی...... کیونکہ وہی تو ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ تو پھر ہم اس کی آنکھوں سے اوجھل کیسے ہو سکتے ہیں؟"

وہ ان دونوں کو اپنی گود میں دائیں بائیں بٹھاتے ہوئے بڑے پیار سے بولیں۔ تب

ستارہ کے ساتھ ساتھ زید نے بھی خود کو اللہ کی ہتھیلی پر کھڑا پایا تھا۔ تب یہ احساس اس کے لاشعور میں بس گیا تھا۔ یوں کہ وہ اپنی اسی جگہ پر کھڑے کھڑے جوان ہو گیا تھا اور خود کو اللہ کی نظروں میں فوکس پاتا تھا اور اسی احساس نے اسے کبھی غلط کرنے نہیں دیا تھا۔

''میرا اللہ...... میرا مالک! مجھے پیدا کرنے والا۔ ہر لحظہ دیکھنے والا اور میرا ہر لمحہ خیال رکھنے والا۔''

اس کے لمحہ بھر کو ڈگمگاتے قدم پھر سے اللہ کی ہتھیلی پر جم گئے اور اس کے تواتر سے بہتے آنسوؤں کا قطرہ قطرہ اس کی حمد و ثناء کرنے لگا۔

''میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری ساری حالتوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ میرا ہے میں تنہا نہیں ہوں۔ نہ ہی وہ مجھے تنہا اور غمزدہ رہنے دے گا۔'' اس کے اداس اور ویران دل کو اک ڈھارس بندھ گئی۔

''وہ میرا راستہ اپنی رحمت اور محبت سے زندگی کی طرف پھر سے نکالے گا۔'' اس نے اپنے آنسوؤں کو ہتھیلیوں میں جذب کیا۔ وہ ان آنسوؤں کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے وجود کی مٹی کا نم تھے۔ جن کی بدولت اس کے دل میں اپنوں کی محبتوں کے پھول کھلتے تھے۔

بی بی جان اور ستارہ اور گھر کا اک اک فرد جو اسے شدت سے یاد آ رہا تھا ان کی یادوں کو اپنی آغوش میں بھر کے وہ آج رات دوبارہ سے سکون کی گہری نیند سو گیا۔

❖......O......❖

آج وہ اپنا آخری پرچہ دے کر فارغ ہوئی تھی۔ اس کے سارے پرچے بہت اچھے ہو گئے تھے اس لیے وہ بڑی پُرسکون اور خوش بھی تھی۔ آج وہ پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد خوب جی بھر کے سوئی تھی شاید اس لیے بھی وہ اس وقت خود کو خاصا ہشاش بشاش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے چائے کا ایک بڑا مگ بنایا اور ساتھ میں اپنی پسند کے سالٹی بسکٹ لے کر اپنے کمپیوٹر کے سامنے آ گئی۔

''اوہ...... تھینک گاڈ کہ امتحانات کی ٹینشن سے تو جان چھوٹی۔'' وہ کمپیوٹر کو آن کر کے سیدھی اپنے میل بکس پر آ گئی۔ جسے جلدی چیک کرنے کے Message حسان اسے پچھلے تین چار روز سے مسلسل دے رہا تھا۔

اس کا میل بکس حسان کی بے شمار میلز سے بھرا پڑا تھا۔

''اوہ حسان! تم بھی ناں؟'' اتنی میلز دیکھ کر اسے اپنے محبوب کی محبت پر پیار آ گیا۔ جو

اس کے خیال میں اسے دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے ان میلز کو کھولنے لگی۔ جہاں حسان کی بے چینیاں اور بے تابیاں بکھری پڑی تھیں۔

I Miss You اور I Love You۔

کے بڑے ہی دل گداز بے شمار کارڈز تھے جو اس نے زائرہ کو دن میں کئی کئی بار Send کیے تھے۔ یعنی وہ اسے اپنے جذبات کی شدتیں مختلف مگر بڑے خوبصورت انداز میں بھیجتا رہا تھا۔

''اُف حسان! لگتا ہے تم دیوانے ہو گئے ہو۔'' اس کا مسرتوں سے بھرا دل دھڑک دھڑک کے اسے اس کے ''خاص'' بلکہ بے حد ''خاص'' ہونے کا احساس دلا رہا تھا اور یہ احساس بھی کہ حسان ہی وہ شخص ہے جو اس کے بغیر مر جائے گا اور وہی وہ ایک ہے جس کی خاطر اسے بھی زندہ رہنا ہو گا اور یقیناً یہ میں اور حسان ہی تو ہیں جن کے لیے ''بنے ہیں اک دوجے کے لیے'' کی ضرب المثل بنی ہو گی۔

وہ خوش ہوتے ہوتے خوش فہمیوں کی انتہا کو چھونے لگی۔

''حسان! میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ تمہارے بنا جینے کا تصور نہیں کر سکتی "I really love u too" اس نے حسان کی ساری میلز کا جواب ایک ہی میل میں لکھ دیا ایک خوبصورت سا گریٹنگ کارڈ منتخب کیا اور اس پر اپنا دل نقش کر ڈالا ساتھ ہی رات کو چیٹنگ کا وقت قریب پڑے موبائل پر ٹائپ کیا اور حسان کو Send کر دیا۔

❖......O......❖

رات کا ایک بج رہا تھا اور وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں اور آنکھوں میں بجلیاں اور گالوں پر لالیاں دوڑ رہی تھیں۔ فرطِ جذبات سے پھڑپھڑاتے لب کبھی کھلتے اور کبھی بند ہوتے کبھی مسکرا دیتے۔ ٹھیک اسی طرح دوسری جانب حسان بھی موجود تھا۔ دونوں کے سامنے Monitor کی سکرین ایک دوسرے کا چہرہ بنی ہوئی تھی دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے حالِ دل کہہ رہے تھے۔

''اب نہیں رہا جاتا۔ بس کر دو آ جاؤ یار!'' وہ بے چینی سے ملنے کی درخواست کر رہا تھا۔

''ابھی حالات بہتر ہوئے ہیں ٹھیک نہیں۔ لہٰذا ابھی نہیں آ سکتی۔'' اس نے مجبوری بتائی۔

''لگتا ہے تم ملنا ہی نہیں چاہتیں؟'' اس نے منہ بسورا۔

"تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ میرا حالِ دل جانتے ہو۔" اس نے اعتماد سے اپنا دفاع کیا۔

"اے خوب صورت! جانتی ہو ناں میں بڑا سر پھرا ہوں؟" اس نے اکڑ دکھائی۔

"تو کیا ہوا میں خوب صورت ہوں۔" وہ نخرے میں تھی۔

"زائرہ پلیز...... ایک بار تو ملنے آ جاؤ۔" اب اس کی طرف منت تھی۔

"کہاں؟" وہ تھوڑا سا پسیجی۔

"وہیں...... اور کہاں؟" اس نے جواب دیا۔

"نہ...... نہ...... نہ بابا...... وہاں نہیں...... وہ بڑی عجیب اور خوفناک جگہ ہے۔" اسے وہاں کا پُراسرار ماحول یاد کر کے جھرجھری سی آ گئی۔

"کیا مطلب...... وہاں کیا بھوت رہتے ہیں؟" وہ شرارت سے بولا۔

"تو اور کیا...... وہ ریاض نامی بھوت اسے بھول گئے کیا؟" وہ اسے اس کے خبیث صورت اس دوست کے بارے میں یاد کروا رہی تھی۔ جس کے گھر پر وہ کئی بار مل چکے تھے۔ وہاں کے سارے مکین ہی بہت عجیب سے تھے۔ ریاض کی ماں بیگم اے ڈی (احمد دین) اور ریاض کی بیوی صبا۔ جن کے ساتھ رامین کی بہت دوستی تھی۔ وہ ریاض اور اس کے گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

"ریاض میرا بہت مخلص دوست ہے تم خواہ مخواہ وہم کرتی ہو؟" وہ اسے سمجھانے لگا۔

"پھر بھی میں وہاں نہیں آؤں گی؟" وہ اس پر راضی نہ ہو رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر تم بتاؤ کہاں ملو گی؟" اس نے زیادہ بحث نہ کی۔

"کسی تفریح گاہ میں...... یا پھر لونگ ڈرائیو پر......" اس نے آپشنز دیں۔

"لونگ ڈرائیو ٹھیک ہے۔" وہ بھی راضی ہو گیا۔

"کل کس وقت اور کہاں سے پک کروں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"صبح گیارہ بجے رامین کے گھر کے باہر۔" اس نے کچھ سوچ کر بتایا۔

"رامین کے گھر کے باہر؟ کیا وہ بھی ساتھ آئے گی؟" حسان کو فکر پڑ گئی۔

"تو اس کے بغیر مجھے کون آنے دے گا؟" اس نے پھر وجہ بتائی۔

"کباب میں ہڈی...... پتہ نہیں تم مجھ پر کب بھروسہ کرو گی؟" اس کے منہ کا ذائقہ کرکرا ہو گیا۔ وہ خفا ہو گیا۔ جسے زائرہ نے بڑی مشکل سے منایا۔ آخر کار اسے ماننا پڑا کہ اس بار وہ اس کے ساتھ اکیلی ہی ڈرائیو پر جائے گی۔ جس پر وہ بے حد خوش ہو گیا۔ اس کے لیے رات کی صبح کرنی مشکل ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے زائرہ کو خدا حافظ کہنے دیا ورنہ تو وہ ساری

رات ہی چیٹنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن زائرہ کو واقعی نیند آ رہی تھی اس لیے وہ آف لائن ہو گئی۔ محبوب سے ملاقات کا شوق اسے بھی اتاؤلا کر رہا تھا آخر وہ پورے اڑھائی ماہ کے بعد مل رہے تھے۔



تکلم بیگم کو پچھلے چار پانچ روز سے بخار تھا۔ یہ بات ترنم کو پتہ چلی تو وہ پریشانی اور بے چینی سے بے حال ہو گئیں۔ انہیں ایک پل سکون نہ آ رہا تھا۔ وہ پورے گھر میں پیر جلی بلی کی طرح اِدھر سے اُدھر بولائی پھر رہی تھیں۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اس دیوار کے اُس پار جا پہنچتیں۔

"آپا کو بخار ہے۔ وہ بیمار ہیں اور میں انہیں دیکھنے بھی نہیں جا سکتی۔" وہ بے حد دلگیر ہوئی بیٹھی تھیں۔

"امی جان! آپ روئیں مت میں آپ کی بات کرا دیتی ہوں تائی خالہ سے۔" ردا اپنی ماں کو بڑی محبت سے تسلیاں دے رہی تھی۔

"بات کرنے سے کیا ہو گا؟ جب تک میں ان کا چہرہ نہ دیکھ لوں گی مجھے بھلا کہاں قرار آئے گا۔"

وہ اپنے آنسو صاف کرتی ہوئیں بڑی حسرت سے کہہ رہی تھیں۔

"تو آپ جا کر انہیں دیکھ آیئے گا ناں؟" وہ اپنی ماں کو حوصلہ دلا رہی تھی۔

"یہ اتنا آسان کب رہا۔ تمہارے ابا جان اور تمہاری بہن نے چند قدموں کی اس راہ میں اتنے کانٹے بو دیئے ہیں کہ اسے پاٹ کے جانا ممکن نہیں۔" وہ پانی بھری آنکھوں سے صحن میں اٹھی اس بلند دیوار کو دیکھنے لگیں جس نے ایک ہی خاندان کو دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی تلوار کی طرح جیسی آ گڑی تھی وہ دیوار جیلانی ہاؤس کے سینے پر۔

"کتنا برا ہو گیا۔ کتنا برا۔" وہ تڑپ کے اٹھیں اور آہیں بھرتیں باہر صحن میں جا کھڑی ہوئیں۔

"امی جان! آئیں تائی خالہ سے بات کر لیں میں نے نمبر ملا دیا ہے۔" ردا ٹیلی فون نمبر ملا کر ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"آپا......" وہ بے تابی سے پلٹیں۔

"السلام علیکم آپا!" ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" تکلم بیگم کی کمزور آواز کانپ رہی تھی جو بخار کی حدت سے زیادہ

جذبات کے تلاطم کی زد میں تھی۔

''آپا کیا ہو گیا آپ کو؟'' وہ ریسیور کے ساتھ یوں ہونٹ چپکائے کھڑی تھیں جیسے بہن کی پیشانی ہو۔ بخار سے جلتی پیشانی۔ جس پر وہ اپنے لبوں کی گدازی سے مسیحائی کر رہی ہوں۔ دوسری جانب تکلم بیگم کی آنکھوں میں بھرا نمک ان کے حلق میں گرنا شروع ہو گیا تھا۔

''آپا! کیسی ہیں؟'' ترنم بیگم کی آواز میں جدائی اور مجبوری کی ایک داستان تھی جو ان کا حالِ دل بن کے بیان کر رہی تھی۔

''تم کیسی ہو؟'' دوسری جانب خود سے زیادہ ان کی فکر تھی۔

''میں تو ٹھیک ہوں آپا! پر آپ کا بخار۔''

''بخار...... ہاں معمولی سا بخار ہے اُتر جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اپنا خیال رکھو۔'' وہ بڑی ہونے کا فرض ادا کر رہی تھیں۔

''گھر میں سب کیسے ہیں؟'' وہ ایک ایک کا نام لے کر پوچھنا چاہتی تھیں مگر ضبطِ غم الفاظ کو برف کیے دے رہا تھا۔

''سب ٹھیک ہیں۔'' تکلم بیگم نے انہیں تسلی دینے کو کہا حالانکہ اُدھر کوئی بھی ٹھیک نہ تھا۔ وہ کیسے کہتیں کہ بی بی جان بستر سے لگی پڑی ہیں۔ میاں صاحب کے لبوں کی ہنسی اور بھوک مر گئی ہے۔ ستارہ کی آنکھوں کی لَو تھرتھراتی رہتی ہے اور...... اور اسیس میاں ابھی سے کندھے جھکا کر چلنے لگے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے اور باقی دو گھر میں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

''آ...... آ...... پا......'' ترنم بیگم نے ان کے خاموش لبوں سے سب کا حال سن ہی لیا۔ ان کا رواں رواں اس درد کی شدت سے لرزنے لگا جو اس وقت ان کے دل میں لہریں لے رہا تھا۔

''بچیاں کیسی ہیں؟ رمیض کیسا ہے اور...... اور عمیس۔'' تکلم بیگم نے رُک رُک کر پوچھا۔ شاید ان میں یہ پوچھنے اور اس کا جواب جاننے کی سکت بھی نہ تھی۔

''سب ٹھیک ہیں۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔'' بالکل انہی جیسا جواب دیا گیا۔

''میں آجاؤں؟'' ترنم نے بڑی بے بسی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''نا...... نا...... مت آنا...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ تم عمیس کی ناراضگی کیوں مول لیتی ہو۔'' وہ جو اس کی صورت دیکھنے کو ترس رہی تھیں اپنے جی پر پتھر رکھ کے بولیں۔

''عمیس کا تو دماغ چل گیا ہے۔'' انہوں نے شوہر پر آیا ہوا غصہ نکالا۔

''بُری بات تنو...... وہ تمہارے شوہر ہیں۔'' انہوں نے بہن کو اس طرح بدتمیزی سے شوہر کا نام لیتے ہوئے سن کر پیار سے ڈانٹا۔

''کیا بُری بات آپا...... اور جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ بُرا نہیں ہے۔'' ان کا غصہ ان کے غم کا اظہار تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے بہن کو تسلی دی۔

''کیسے...... کیسے ٹھیک ہو گا اب یہ سب؟ اور کب ٹھیک ہو گا؟'' وہ رو پڑیں۔

''ترنم...... ترنم...... تنو......'' بہن کی بھیگتی ہوئی آواز ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے کرنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو۔ کیوں رو رہی ہو۔ کیا تمہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہا؟'' وہ خود اپنی آنکھوں کو بمشکل کنارے بنائے ہوئے تھیں جن میں ان کی پوری ذات ڈول رہی تھی۔

''اللہ پر بھروسہ ہی تو ہے۔ ورنہ اس موئی دیوار نے تو مار ہی دیا تھا۔'' وہ دروازے سے نظر آتی صحن کی اس قاتلہ کو دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ سب دیواریں گر جائیں گی۔ حوصلہ رکھو۔'' انہوں نے گویا خود کو بھی تسلی دی۔ امید دلائی۔

''اچھا میں آپ کے لیے سوپ بنا کر رکھتی ہوں آپ رحمت بی بی سے کہیں چپکے سے آ کر لے جائے۔'' ترنم بیگم نے بڑی چاہت سے کہا وہ جانتی تھیں آپا کو ان کے ہاتھ کا بنا سوپ بے حد پسند تھا۔

''سوپ...... اچھا...... اچھا......'' انہوں نے بہن کا دل رکھنے کو ہامی بھر لی ورنہ وہ چاہتی تھیں کہ ترنم ابھی ذرا محتاط ہی رہے۔ کہیں عمیس زیادہ ناراض نہ ہو جائے ویسے بھی عمیس میاں نے تو حد کر دی تھی۔ وہ عمیس جیلانی کے انتہائی تکلیف دہ رویوں سے پہلے ہی بہت دکھی تھیں جنہوں نے بچوں کے ذرا سے معاملے پر پورے خاندان پر مختلف الزامات دھر دیئے تھے۔ سب کو ہی چھوڑ دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ زید تو فوراً ہی گھر چھوڑ گیا تھا۔

''زید!'' ان کی سانسوں سے بے اختیار سرد آہیں نکلنے لگیں اور آنکھوں کے کنارے ٹوٹنے لگے۔

''اچھا تنو! اپنا خیال رکھنا۔ بچوں کو پیار کرنا۔'' انہوں نے ضبط کے نمکین گولے نگلتے ہوئے کہا۔ وہ نمکین گولے جو ان کے لہو میں زہر بن کر گھل رہے تھے۔

''اچھا آپا! میں سوپ بناتی ہوں۔ آپ رحمت بی بی کو بھیجئے۔'' ترنم بیگم کی حالت بھی

بہن سے جدا نہ تھی۔ انہوں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

"ردا!" وہ اپنے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی ردا کے وجود کے ساتھ لپٹ گئیں اور دیوار کے دونوں طرف ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔



زید کے امتحانات بھی ختم ہو چکے تھے۔ وہ اب فارغ تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے۔ بختیار سے کیا کہے کہ گھر کیوں نہیں جا رہا؟ بہت سے سوالات نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ بوجھل دماغ کے ساتھ وہ گھبرا کے ہاسٹل سے نکلا آج کل اس کے پاس بختیار کی موٹر سائیکل تھی۔ سخت سردی تھی دھند کی دبیز چادر نے فضا کو ڈھانپ رکھا تھا بالکل اسی طرح سے جس طرح سے اس کے دل و دماغ دھواں دھواں تھے۔ آج وہ اچھی خاصی موٹی جیکٹ پہنے ہونے کے باوجود سردی محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ سردیوں کا یہ موسم اور یہ کہر آلود فضا تو اسے بے حد پسند تھی ایسے میں وہ گھر پر ٹک کر ہرگز نہ بیٹھتا تھا اور موٹر سائیکل چلا کر یونہی سڑکیں ناپا کرتا تھا وہ باہر نکلنے لگتا تو اس کی امی جان اس سے باقاعدہ الجھ پڑتی تھیں۔

"پاگل ہو اتنی ٹھنڈ میں گھر سے باہر جا رہے ہو؟" وہ اسے یوں مزے سے باہر جاتا دیکھ کر ڈانٹتیں۔

"اوہ مائی سویٹ ہارٹ! اتنا خوب صورت موسم بھلا کمروں میں بند ہو کر برباد کرنے کے لیے ہوتا ہے؟" وہ انہیں کندھوں سے تھام کے پیار سے ان کی آنکھوں میں جھانک کر الٹا سوال کر دیتا۔

"نہیں تم جیسے خبطیوں کی آوارہ گردی کے لیے ہوتا ہے ایسا موسم۔" وہ اس کے کان کو پیار سے مروڑ کے کہتیں۔

"تو پھر جانے دیں ناں امی جان!" وہ لاڈ سے اجازت مانگتا۔

"میری طرف سے تو اجازت ہے بس ذرا بی بی جان کو بتا کر چلے جاؤ۔" وہ جان بوجھ کر اسے سپریم کورٹ کی طرف دھکیل دیتیں۔ جہاں سے وہ اپنے دادا جان کی سفارش لگوا کر اجازت تو لے ہی لیتا مگر ساتھ میں بی بی جان کی بہت ساری شرائط ہوتیں۔

"لیدر کی جیکٹ پہنو۔ موٹی جرابیں پہن کر جوگرز پہنو۔ اونی ٹوپی کانوں تک اوڑھو۔ دستانے پہنو اور سنو۔" وہ اسے سارے ہتھیاروں سے لیس کر کے بھی بس نہ کرتیں۔

"اب کیا ہے بی بی جان؟" وہ منہ بسور کے انہیں دیکھنے لگتا۔

"گاڑی لے جاؤ میرے بچے...... یہ موٹر سائیکل بھی بھلا کوئی سردی کی سواری ہے۔" وہ بڑے ہی پیار سے بڑی ہی اچھی صلاح دیتیں۔

"گاڑی میں بیٹھ کر بھلا کبھی سردی کا لطف آتا ہے۔" وہ اس خوشی، اس لطف کا اظہار ہی نہ کر سکتا تھا جو اسے اپنے انداز میں سردی منا کر آتا تھا۔

"جانے دو طاہرہ! نوجوان بچہ ہے۔ زندگی کے موسموں میں ذائقہ اسی عمر میں تو محسوس ہوتا ہے۔" نور محمد جیلانی دادی پوتے کی بحث میں دخل اندازی کر کے بھی زید ہی کا دفاع کرتے۔

"آپ ہی نے بگاڑا ہے اسے۔" وہ مصنوعی خفگی سے میاں صاحب کو گھور کے کہتیں۔

"کیا کروں مجبوری ہے۔" وہ ڈرنے کے انداز میں ایکٹنگ کرتے ہوئے بیوی کے سامنے نگاہیں جھکا کر کہتے۔

"کیا...... کیا مجبوری ہے آپ کی؟" وہ پریشان ہو کر پوچھتیں کہ مبادا زید بدتمیزی کے ساتھ زبردستی تو انہیں آگے نہیں کر دیتا۔ (وہ زمانے کی خراب ہوا سے خوفزدہ ہو کر سوچتیں)

"محبت جو ہوئی...... دل کا معاملہ جو ٹھہرا۔" وہ زید کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اتنی محبت سے کہتے کہ طاہرہ بیگم کو بے اختیار ان دادا پوتے دونوں پر پیار آ جاتا۔

"اتنی محبت نہ کیا کریں اسے باقی بچے بُرا مناتے ہیں۔" وہ یونہی انہیں منع کرتیں حالانکہ ان کا تو اپنا دل اسی میں اٹکا رہتا تھا۔

"ہم تو ان سب کے ساتھ بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ ایسا فرق محسوس کرتے ہیں۔" اُلٹا وہ بچوں کے ایسے خیالات پر بُرا منا جاتے۔

"پھر بھی آپ ذرا خیال رکھا کریں۔" وہ دبے دبے لفظوں میں تنبیہ کرتی رہتیں۔

"اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔" وہ بھی لاپروائی سے جواب دے کر پوتے کے سر پر اونی ٹوپی درست کرنے لگتے۔

"میرے جگر جیسا کوئی اور ہو بھی تو۔" وہ ہولے سے زید کان میں سرگوشی کرتے۔

"اور میرے دادا جان جیسا بھی۔" وہ سیدھا ان کے گال پر بوسہ لیتے ہوئے بآنگِ دہل کہتا اور دادی کے گالوں کو پیار سے اپنی انگلی سے چھوتا ہوا باہر نکل جاتا۔

"زید...... زید......" اسے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتا پا کر جانے کہاں سے ستارہ بھی آن ٹپکتی۔

"لو جی...... پرنسپل صاحبہ آ گئیں۔" وہ وہیں رک جاتا۔

"یہ تو لے کر جاؤ۔" وہ ہیلمٹ لیے کھڑی ہوتی۔

"لائیے یہ بھی دے دیجیے۔" وہ اپنا سر اس کے سامنے کر دیتا جس پر وہ ہیلمٹ پہنا دیتی۔

"لگتا ہے میں سردی کو انجوائے کرنے نہیں بلکہ اس کے خلاف لڑنے جا رہا ہوں۔" وہ اتنی پابندیوں پر منہ بنا کر کہتا۔

"محبتوں کا بھی بھلا کوئی بوجھ ہوتا ہے جو تم یوں گھبرا جاتے ہو۔" وہ اس کا منہ بنا دیکھ کر مسکرا کر کہتی۔

"نہیں ہوتا...... مگر خدا کا واسطہ صرف سردیوں کے چند دنوں میں محبتوں کی اتنی گرمی مجھے نہ دیا کریں۔" وہ ہیلمٹ کا شیشہ اٹھا کر اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہتا۔ جہاں اس کے دودھیے رنگ میں سرخیاں گھل رہی ہوتی تھیں اور اس کی ننھی منی سی ستواں ناک ٹھنڈ سے لال ہو رہی ہوتی تھی۔

"ناشکری نہیں کرتے ورنہ نعمتیں چھن جاتی ہیں اور سب سے پہلے انسان کے نصیب کی جس نعمت کو نظر لگتی ہے۔ وہ محبت ہی ہے۔" وہ اپنے انداز میں اسے سمجھاتی۔

"اچھا بیوٹی فل! جیسے تمہارا حکم۔" وہ اس کی ناک کو اپنی چٹکی میں لے کر ذرا سا دباتا۔

وہ ستارہ کے ساتھ زیادہ محبت جتاتا تو بے تکلف ہو کر اسے "تم" کہہ جاتا اور اسی طرح سے اس کی ناک دبا دیتا۔ جس پر جیلانی ہاؤس کے بے حد ادب احترام اور رکھ رکھاؤ کے ماحول میں رہنے والے کچھ لوگ بُرا بھی مناتے تھے۔ جن میں عمیس چچا اور زائرہ سرفہرست تھے۔

یونیورسٹی کے لال پھولوں سے لدے ہوئے قد آور درختوں کی بانہوں میں دور تک چلے جانے والے راستے پر اس نے ایک دم سے موٹر سائیکل روک دی۔ کیوں؟ کیونکہ آج اس کی محبتوں کو واقعی کسی کی نظر لگ چکی تھی۔ آج اس کا دل کسی کالے جادوگر کی چٹکی میں تھا اور اس کے بے حد فیورٹ ونٹر سیزن کی ساری کہر اس کی آنکھوں میں گھس آئی تھی۔ آج اسے واقعی ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج وہ پہلی بار محبت کی نعمتوں کی گرم چادر اوڑھے بغیر گھر سے باہر نکلا تھا۔ وہ چادر جو اس کے چاہنے والوں کی دعاؤں سے بُنی ہوئی تھی۔ آج وہ اسی جگہ سے پلٹ پڑا۔ آج اسے دھند کے اس پار جانے کا شوق نہیں رہا تھا بلکہ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ جانے وہاں کیا ہو؟ شاید پھر کوئی دھوکہ...... الزام یا بہتان۔

"زائرہ! کاش میں بدلہ لینے کا اختیار رکھتا تو...... تو میں تمہیں عمر بھر کے لیے اذیت کی اس صلیب پر لٹکا دیتا۔ جس پر تم نے مجھے بے خطا ہی چڑھا دیا ہے۔" اس نے ضبط اور غصے کی

شدت سے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور موٹر سائیکل کی سپیڈ حد سے زیادہ بڑھا دی۔

❖......O......❖

ایک سیاہ کرولا اسی دھند کو چیرتی ہوئی راوی روڈ پر شہر کی حدود سے باہر آ چکی تھی جس کے اندر دو چاہنے والوں کی بار بار ملتی نگاہوں کی تپش کے علاوہ ہیٹر کی گرمی بھی خوب تھی۔ کار چلانے والے کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر جبکہ دوسرا اپنے ساتھ بیٹھی اس حسین لڑکی کے ہاتھ پر تھا۔ جو اس کی محبوبہ تھی۔ اس کا دل تھی۔ اس کی جان تھی اڑھائی ماہ کی جدائی نے ان دونوں کو ہی بہت تڑپایا تھا اور اب ان کی حالتیں یہ تھیں کہ دونوں کے لبوں پر مہریں تھیں البتہ آنکھیں زبان تھیں اور آنکھیں ہی اعضاء ہاتھ اور پیر، یہاں تک کہ دونوں کے دل بھی آنکھوں میں دھڑک رہے تھے گاڑی کے زبردست اسٹیریو سسٹم پر عاطف اسلم کا نیا گانا بج رہا تھا۔

مل کے بھی ہم نہ ملیں
تم سے نہ جانے کیوں

بہت سارے لمحے بے زبان ہی گزر گئے۔ صرف چھوتے، سرسراتے ہوئے۔

"اب نہیں رہا جاتا۔" جذبات سے بے قابو ہو کر حسان کو کہنا پڑا۔

"چلو کہیں بھاگ چلتے ہیں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"کہیں دور...... بہت دور...... جہاں ہمیں کسی کا ڈر نہ ہو۔" اب اس کے ہاتھ کی گرفت زائرہ کے ہاتھ پر ذرا سخت تھی اور وہ سنجیدہ بھی تھا۔

"مجھے الٹی پٹیاں مت پڑھاؤ بلکہ اپنی مما کو میرے گھر بھیجو۔" وہ اپنی ہمیشہ والی ڈیمانڈ دہرانے لگی۔

"اور اگر آج میں تم سے کہوں کہ مما نے انکار کر دیا ہے۔ وہ پاکستان نہیں آ رہیں بلکہ مجھے واپس کینیڈا بلا رہی ہیں تو۔" اب وہ پوری طرح سے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا جس پر زائرہ نے بے چینی سے پہلو بدل کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیا...... کیا کہا تم نے؟" وہ پھر بھی اپنے کانوں پر بھروسہ نہ کر رہی تھی۔

وہ شاید اس کے اس ردِعمل کی توقع پہلے سے کر رہا تھا اس لیے اس نے گاڑی کو ایک طرف روک لیا۔

"دیکھو زارو! بات سنو مما نہیں آ سکتیں۔ انہوں نے واقعی انکار کر دیا ہے۔" اب وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام چکا تھا اور بڑی محبت بڑی ملائمت سے انہیں چھو رہا تھا۔ جیسے اس کا غصہ ٹھنڈا کر رہا ہو۔

"مگر کیوں؟" وہ بے بسی سے اسے پوچھ رہی تھی۔

"وہ نہیں مان رہیں زارو!" آج وہ سچ بولنے کا سوچ کر ہی آیا تھا۔

"تو...... پھر...... پھر کیا ہوگا۔" اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

"دیکھو! سنو ایک بات تو صاف ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ تم میری ہی بنو گی۔ بھلے سارا زمانہ میرا دشمن ہو جائے۔" وہ بہت اعتماد سے کہہ رہا تھا۔

"اب تم کہو کہ تمہیں کیا منظور ہے؟ کیا تمہارا ساتھ مجھے نصیب رہے گا؟" اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے بڑے جذباتی انداز میں پوچھا۔

"میں...... میں کیا کر سکتی ہوں۔ حسان میں تو مر جاؤں گی تمہارے بغیر اور کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ اس کی آنکھوں سے اپنی پانی بھری آنکھوں کو چھڑاتی ہوئی بولی۔

"یعنی تم چاہتی ہو کہ میں زندہ نہ رہوں۔" وہ اسے جذباتی طور پر بلیک میل کر رہا تھا۔

زائرہ جیلانی کا سارا غصہ ساری سمجھ اور ساری چالاکیاں ہوا ہو گئی تھیں یہ سن کر کہ حسان کے گھر سے اب کوئی اسے پرپوز کرنے نہ آئے گا۔

"تبھی تو کہہ رہا ہوں کہ اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے۔" وہ اسے دوبارہ اسی بات پر لا رہا تھا جسے سنتے ہی وہ ہمیشہ بدک جایا کرتی تھی۔

"کون سا راستہ؟" وہ جان کر بھی انجان بن رہی تھی۔

"یہی کہ یا تو ہمیشہ کے لیے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ جائیں یا پھر کورٹ میرج کر لیں اور پھر اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کریں۔ اب تم بتاؤ کیا کہتی ہو؟" اس نے اپنے طور پر سارا پلان دینے کے بعد فیصلے کی ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی تھی کہ وہ جس راہ کا بھی انتخاب کر لے۔

"یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔" اس کی جھجک بدستور قائم تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے دونوں ایک ساتھ خودکشی کر لیتے ہیں۔ ایسے گھٹ گھٹ کر جینے کا کیا فائدہ؟" اس نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑ کر گاڑی دوبارہ سٹارٹ کر دی۔

"ساتھ جی نہیں سکتے تو کیا ہوا؟ ساتھ مر تو سکتے ہیں۔" اس کے چہرے پر یکبارگی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ کرختگی بھی آ گئی۔ جیسے وہ فیصلہ لے چکا ہو۔

"حسان پلیز......" اسے گاڑی کو خطرناک طریقے سے موڑتے ہوئے دیکھ کر وہ ڈر گئی۔

"کیا مرنے سے ڈرتی ہو؟" وہ طنزیہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں موت تو برحق ہے اس سے میں نہیں ڈرتی۔" وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو صاف کر کے دوبارہ اسی اعتماد سے بول رہی تھی جو اس کی شخصیت کا خاصا تھی۔

"زندگی جب تک ہے اسے مرضی سے جینا ہمارا حق ہے۔" اب وہ اسے حوصلہ دلا رہی تھی۔ جس پر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو۔ ان دونوں راستوں میں سے زیادہ بہتر کون سا ہے مجھے ذرا دیکھنے دو۔"

گویا اس نے ایک طرح سے اس کے دکھائے ہوئے بغاوت کے راستے پر قدم رکھنے کی ہامی بھر ہی لی تھی۔

"I Love you" حسان کی آنکھوں میں دوبارہ جھلملاہٹیں ہونے لگیں۔

"I Love you too" اس نے لبوں کی بجائے اس کی آنکھوں سے جواب دیا۔

جس پر خوش ہو کر حسان نے کیسٹ پلیئر دوبارہ آن کر دیا اور دوبارہ سے اس کے ہاتھ کو تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔



ابھی وہ شہر کی طرف پلٹے ہی تھے۔ جب ایک ہارن بجاتی ہوئی پولیس جیپ ان کی گاڑی کو پیچھے سے کاٹتی ہوئی برابر آئی اور پھر اس نے سامنے آ کر سیاہ کرولا کو رکنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا...... کیا ہو گیا حسان؟" زائرہ کا تو مارے خوف کے برا حال ہو گیا۔

"کچھ نہیں...... کیا ہوگا۔ تم بس کول رہنا اور اگر یہ لوگ کچھ پوچھیں تو کہنا تم میری بیوی ہو۔" وہ خود بھی بہت گھبرا گیا تھا مگر زائرہ کو خود پر قابو رکھنے کا کہہ رہا تھا۔

"اے مسٹر! ذرا باہر تشریف لے آئیے۔" ایک کانسٹیبل نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز اتنا تیکھا اتنا کٹیلا تھا کہ فرنٹ سیٹ پر ساتھ بیٹھی زائرہ کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا گئی۔ اس نے جلدی سے چادر کے کونے سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔

"اے مس! آپ بھی ذرا باہر تشریف لے آئیے۔" دوسری جانب ایک اور کانسٹیبل اس کے سر پر کھڑا تھا جس کے ہونٹوں پر بڑی کاٹ دار مسکراہٹ تھی۔

"میں...... میں۔" وہ سہم کر اور بھی سمٹ گئی۔

"دیکھیں آپ کو جو بھی بات کرنی ہے مجھ سے کریں۔ میری مسز کو تنگ مت کریں۔" حسان غصے میں آ کر اس کانسٹیبل کی طرف بڑھا جو زائرہ کو نیچے اترنے کے لیے اب بڑی بدتمیزی سے کہہ رہا تھا۔

"مسز!" پہلے کانسٹیبل نے حسان کو سر سے پاؤں تک طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے دہرایا۔

"ہاں...... ہاں مسز...... آپ کو کیا پرابلم ہے۔" وہ تو گویا لڑنے کو تیار کھڑا تھا۔ جبکہ اندر تھر تھر کانپتی زائرہ نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں کہ اب سچ مچ یہاں پر لڑائی ہو کر رہے گی۔

"کیا بات ہے۔ بحث کیوں ہو رہی ہے۔" جیپ میں سے اُتر کر ایک شاندار پرسنالٹی والا شخص ادھر ہی آتے ہوئے بولا۔ وہ یقیناً ڈی ایس پی تھا۔ جسے دیکھ کر اگرچہ حسان کے مزید اوسان خطا ہو گئے تھے مگر خود پر مصنوعی اعتماد کا خول چڑھا کر وہ خود اس کی طرف بڑھا۔

"السلام علیکم سر!" اس نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا۔

"وعلیکم السلام!"

"Who r u young man! what is the matter?"

ڈی، ایس، پی نے نہایت گرم جوشی سے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"سر! یہ لوگ خواہ مخواہ ہمیں تنگ کر رہے ہیں؟" حسان کا اعتماد اس کا اخلاق اور ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ دیکھ کر اور بڑھ گیا۔

"تمہارے ساتھ کون ہے؟" وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"میرے ساتھ؟" وہ ذرا ٹھہرا جیسے ایک لمحے کو اس نے کچھ سوچا ہو۔ پھر ذرا بے تکلفی سے بولا۔

"میری منگیتر ہے سر!" اس نے دوسرا جھوٹ بولا۔

"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری مسز ہے۔" پہلے والا کانسٹیبل تیزی سے بولا۔

"مسز...... میں نے کب کہا۔ میں نے تو منگیتر ہی کہا۔" وہ کندھے اچکاتا ہوا اسے لاپروائی سے جھٹلا گیا۔

"بکومت...... تم نے مسز ہی کہا تھا۔ جھوٹ بولتا ہے۔" دوسرا کانسٹیبل بھی پہلے والے کی تائید کرنے آگیا۔

"دیکھو ینگ مین! سچ کہو۔ میں سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہوں۔" اب ڈی، ایس، پی کے انداز میں بھی کچھ سختی تھی۔

"Sir Beleave me میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے اپنا انداز اور بھی نرمی والا کر کے اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا مان لیا آپ سچ کہہ رہے ہیں تو پھر آپ اس وقت رُک کے کیوں نہیں جب وہاں ناکے کے قریب آپ کو رکنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔" ڈی، ایس، پی نے بھی بڑی شائستگی سے اسے پوچھا اور اپنے ہاتھ کا بوجھ اس کے کندھے پر ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

"جج...... جی...... جی...... وہ میں نے شاید دیکھا نہیں تھا۔" اب وہ ہکلانے لگا شاید وہ اپنے کندھے پر ایک پولیس افسر کے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر چکا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

"ہو سکتا ہے یہ بھی آپ سچ فرما رہے ہوں۔" ڈی ایس پی کے ہاتھ کا بوجھ اب حسان کے کندھے کو ایک طرف جھکا رہا تھا۔

"لیکن کیا آپ اسی طرح سچ سچ یہ بتائیں گے کہ آپ اور آپ کی منگیتر اس وقت کہاں سے آرہے ہیں یا پھر یہ کہ...... کہاں جا رہے ہیں؟" وہ رُک رُک کر بڑی معنی خیز نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک ٹٹولتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"وہ...... وہ...... ہم بس ایسے ہی ذرا لانگ ڈرائیو پر گئے تھے۔" اس نے پہلی بار آدھا سچ بولا۔

"ل...... و...... ن گ...... ڈرائیو...... واہ کیا بات ہے؟" اب ڈی ایس پی نے اس کے کندھے سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔

"کیا خیال ہے آپ ایک اور ڈرائیو انجوائے کریں گے ہمارے ساتھ۔ بس یہ ذرا قریبی تھانے تک۔"

اب اس نے اتنے سپاٹ انداز میں کہا کہ حسان کی گھگھی بندھ گئی۔

"Sir! Sir! پلیز...... سنیں تو۔" وہ اس کے پیچھے لپکا۔

"ضرور سنیں گے مگر تھانے چل کر۔" وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھتا ہوا مسکرا کر لاپر سے بولا۔

تب حسان کو ایک اور ہی ترکیب سوجھی وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف پلٹا۔

"زائرہ! زائرہ! باہر آؤ۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔

"مم...... مم...... میں...... لیکن کیوں؟" ڈری سہمی زائرہ کی آواز بھی بمشکل نکل رہی تھی

"آؤ ناں...... اور آ کر ذرا تم ڈی ایس پی سے بات کرو۔" اس نے زائرہ کا ہاتھ کر اسے باہر نکال ہی لیا۔

"میں کیا کہوں؟" وہ تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"اسے اپنا تعارف کراؤ۔ بتاؤ کہ تم کس کی بہن ہو۔ ورنہ وہ ہمیں تھانے لے جائے گا۔"

حسان نے دھیمی مگر سخت آواز میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے بھئی...... چلو بیٹھو اندر اور چلو ہمارے ساتھ بھی ڈرائیو پر۔ تم نے سنا نہیں ڈی ایس پی صاحب نے کیا کہا ہے۔''

وہی پہلے والا کانسٹیبل ان کے قریب آ کر بولا۔ وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کو آیا تھا تاکہ وہ پھر سے نہ بھاگ سکیں۔

''مجھے ڈی ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔'' زائرہ نے خود کو ذرا سنبھالتے ہوئے کہا۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ اگر وہ تھانے چلے گئے تو کیا ہوگا۔

''اچھ...... ا...... آ...... اب تم نے کیا کہنا ہے صاحب کو۔'' کانسٹیبل نے خالص اپنے پیٹی بھائیوں کے سے خبیثانہ انداز میں اپنی نظریں پوری کی پوری اس کے چہرے پر گاڑھتے ہوئے کہا۔

''Sir- Sir'' اتنے میں زائرہ خود جیپ کی طرف بڑھ گئی۔

لڑکی کو جیپ کی طرف آتے دیکھ کر وہ پولیس افسر خود جیپ سے باہر آ گیا کہ بہرحال وہ خواتین کی عزت واحترام کا قائل تھا۔ اسے تو یہی افسوس تھا کہ آج کی خواتین نے خود کو جانے کیوں تماشہ بنا لیا ہے۔

''Sir پلیز ہمیں جانے دیں۔'' اعتماد ظاہر کرنے کے باوجود اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

''کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ آپ لوگ جب گھر سے باہر یوں سیر سپاٹوں کو نکلتی ہیں تو یہ بات بھول جاتی ہیں کہ آپ کے والدین کی عزت پر کیسا حرف آئے گا۔''

وہ اپنے اس غصے پر پورا پورا قابو پانے کی کوشش کر کے اسے سمجھا رہا تھا جو اس وقت اسے اس لڑکی پر آ رہا تھا۔

''جی...... حسان میرا منگیتر ہے اور ہم گھر والوں کی اجازت سے آئے تھے۔'' اس نے پھر بھی جھوٹ بولا۔

''کس ہے...... کمال ہے آپ پر اور آپ کے والدین کی آزاد خیالی پر جو خود ہی اپنی جوان بیٹیوں کو بے حیائی کی راہ دکھائیں اور جب بات حد سے گزر جاتی ہے تو پھر ہمارے پاس چلے آتے ہیں کہ اب ہماری عزتیں بچائیں۔'' وہ غصے میں جل کر بولا۔

''Sorry Sir'' وہ اس کا غصہ دیکھ کر ڈرتے ڈرتے پھر بولی۔

''شبیر حسین جانے دو انہیں جب عزت والوں کو اپنی عزتوں کی فکر نہیں تو ہمیں کیا؟''

اس نے اپنے کانسٹیبل کو آواز دی اور خود جیپ میں جا بیٹھا۔ زائرہ بھی بجلی کی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے مخالف جانے کے لیے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئیں تو جہاں ڈی، ایس، پی کی آنکھیں حیرت اور پریشانی سے زائرہ کے چہرے پر رک گئیں وہیں زائرہ بھی اپنی چوری پکڑی جانے پر غیرت سے زمین میں گڑ گئی۔



لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ملکہ ترنم نور جہاں کی دل گداز آواز میں وہ یہ غزل کوئی تیسری بار ریوائنڈ کر کے سن رہا تھا۔ آج اس کی طبیعت کچھ مکدر سی تھی اسی لیے وہ آفس بھی نہیں گیا تھا ستارہ نے یہ اسے کوئی تیسرا مگ کافی کا لا کر دیا تھا۔ جو اس کے سامنے پڑا پڑا پھر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر بازو رکھے ہوئے اسی طرح سُست سُست سا لیٹا ہوا تھا۔

''احمد! کافی پی لیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' ستارہ نے پھر اسے بڑی محبت سے کہا۔

''ہوں...... اچھا۔'' اس نے پھر وہی مبہم سی ''ہوں'' کہی۔

''کیا بہت خراب ہے طبیعت؟'' اب وہ اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''نہیں...... ایسے ہی۔'' وہی سپاٹ اور کورا سا جواب۔

ستارہ کا دل بہت خراب ہو رہا تھا اس کے اس اذیت ناک سرد رویے سے اب تو اسے اپنی توہین محسوس ہونے لگی تھی۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے ناراضگی کی۔

''کوئی وجہ بھی تو ہو اس قدر بدگمانی کی۔''

وہ اپنی بھر آنے والی آنکھوں کو دوسری طرف منہ پھیر کے صاف کرنے لگی۔

ہونٹوں کی مجال کیا جو کر لیا یہ سوال
پر دل کو میں سمجھاؤں کس طرح
کر کر میں ہارا ہر جتن   تیری تڑپ تیری ہی لگن
پردہ یہ جب ہٹ جائے گا   امبر کو دھرتی سے ملاؤں گا

''احمد!'' وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ احمد سے کھل کر بات کرے گی۔ آخر اس کا قصور کیا ہے اور...... اور احمد نے سوچا کیا ہے؟ اس طرح...... اس طرح بھلا وہ کب تک رہیں گے۔ ایک ہی جگہ ایک دوجے کے سامنے ایک ہی

بستر پر اجنبیت اور دوریوں کی لکیریں بھلا کب تک کھنچی رہیں گی ان دونوں کے بیچ؟

''احمد!'' اسے چپ پا کر ستارہ نے پھر پکارا۔

''ہوں۔'' اس نے دیکھے بغیر جواب دیا۔

''مجھ سے بات کریں احمد!'' اس نے ہمت کر کے اس کی آنکھوں پر سے بازو ہٹا دیا۔

''کیا بات کروں؟'' اس نے اپنی سرخ بے خواب آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ رت جگوں کے درد سے اٹی...... تھکی ماندی آنکھیں...... جو اس کے رات رات بھر جاگتے رہنے کی گواہ تھیں۔ جنہیں دیکھ کر ستارہ کا دل مزید دکھ گیا۔

''احمد! چپ مت رہیں۔ دیکھیں جو بھی آپ کے دل میں ہے مجھ سے کہیں۔ مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔ پر یوں چپ نہ رہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے ہولے ہولے دباتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ اس کے دل پر جمی کائیوں کو ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی جن کے نیچے اس کا پیار سسک رہا تھا گھٹے گھٹے سانس لے رہا تھا۔ وہ اس پیار کو مرنے نہ دینا چاہتی تھی۔ کہ اس کے ہونے سے ہی وہ زندہ تھی۔

''مجھے تم سے نہ کچھ پوچھنا ہے نہ کہنا ہے۔'' وہ بے رُخی سے اپنا ہاتھ چھڑاتا ہوا رخ پھیرنے لگا۔

''کیوں...... کیوں نہیں کہنا سننا پتہ ہے آپ کو آپ نے مجھ سے کتنے دنوں سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی؟'' وہ اس کے روکھے انداز کو نظر انداز کر کے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی۔

''تمہیں بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ الٹا اس سے گلہ کرنے لگا۔

''مجھے بے حد فرق پڑتا ہے۔ نہ پڑتا تو میں بھی آپ کی طرح بے رُخی سے رہ لیتی۔'' وہ دھیمی سی مسکراتی ہوئی اس کے کچھ اور قریب ہو گئی۔

''ہونہہ......'' وہ بھی طنز سے مسکرایا۔

''احمد! کیا آپ نہیں جانتے کہ مجھے آپ سے کس قدر محبت ہے اور میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔'' اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اپنی آنکھوں سے لگا لیے جو محبت کی شدت سے نم ہو رہی تھیں۔ اس لمحے احمد کا دل بدگمانی کی اس موٹی کائی کے نیچے تڑپ کے دھڑکا جو ان اڑھائی تین مہینوں میں خاصی پھیل چکی تھی۔ مگر فوراً ہی اس پر احمد جیسے چھوٹے دل والے شکی مرد کی مصنوعی اَنا اور مردانگی دوبارہ غالب آ گئی۔

''ہونہہ محبت...... ایک عورت کی محبت؟'' اس نے بڑے عجیب انداز میں اس کی محبت کا

مذاق اُڑایا۔ تب ستارہ کا دل تو چاہا کہ وہ اس بے قدرے سے مزید بات نہ کرے اپنا حالِ دل نہ کہے۔ مگر وہ عورت تھی اور ایک عورت کی محبت پر حرفِ غلط اٹھ رہا تھا جس کی تشریح کو درست کرنا اس وقت اس کا فرض تھا۔

''عورت اور محبت...... الگ الگ تو نہیں ہیں۔ عورت کا تو خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھتا ہے۔ عورت کے تو معنی ہی محبت ہیں۔ اس کا ہر روپ محبت کی تشریح ہے۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی۔''

''اور محبوبہ...... یعنی گرل فرینڈ۔'' احمد نے اس کی بات کو درمیان سے اچک کر بڑے طنز سے کہا۔ اب وہ بات بات پر طنز کرنے لگا تھا۔

''ہاں محبوبہ بھی...... بلکہ محبوبہ تو وہ ہر رشتے میں ہے۔ ماں ہے تو بچوں کی...... بہن ہے تو بھائیوں کی...... بیٹی ہے تو باپ کی...... ماں کی...... اور بیوی ہے تو اپنے شوہر کی۔ آپ لوگ صرف اسی ایک ''رنگ'' کو کیوں دیکھتے ہیں جو آپ لوگوں کی ذہنی غلاظت سے گدلا چکا ہے۔''

اب وہ بڑی سنجیدگی سے عورت کی ذات کا دفاع کر رہی تھی۔

''محبوبہ فنکارہ بھی ہوتی ہے جو بے چارے مرد کو عمر بھر بے وقوف بنائے رکھتی ہے۔'' اس کے خیالات پھر بھی نہ بدل رہے تھے۔

''افسوس ہے احمد! مجھے سخت افسوس ہے۔ آپ کے خیالات پر اور اس سے زیادہ آپ کے رویوں پر...... اور یقیناً اس سے بھی زیادہ افسوس مجھے اپنے ان جذبات پر ہے جو میں نے اپنے شعور کے پہلے قدم سے لے کر آج تک آپ ہی کے لیے اپنے دل میں محسوس کیے اور انہیں باقاعدہ سنبھال سنبھال کے رکھا۔ ان کی بڑی محبت اور احتیاط سے پرورش کی۔'' اس نے احمد کے ہاتھ چھوڑ دیئے جنہیں وہ بڑی محبت سے تھامے بیٹھی تھی۔

''محبت میرا وصف ضرور ہے احمد! مگر میری کمزوری نہیں کہ میں ایک ایسے شخص کے سامنے اپنے اخلاص کی قسمیں کھاتی زندگی گزار دوں۔ جو مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔''

''شک کی نظر سے نہ دیکھوں تو پھر کیا کروں میری آنکھوں نے خود کئی بار دیکھا ہے اور...... اور وہ ڈائری...... اظہارِ محبت کے لچر انداز سے بھری ہوئی۔ وہ بھی تو اس نے میری آنکھوں کے سامنے ہی تمہیں دی تھی ناں۔ جسے تم مجھ سے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔'' وہ پھر اسی قصے کو لے بیٹھا۔ جسے بنیاد بنا کر وہ پہلے دو بار اس کے دل کو تار تار کر چکا تھا۔

''بس کریں احمد! پلیز بس کریں۔'' وہ اب غصے سے زیادہ غم کی شدت سے گزر رہی تھی۔

"کیوں...... سچ کڑوا ہوتا ہے ناں؟" وہ اس وقت ایک روایتی شوہر نظر آ رہا تھا۔ محبت کی صفت سے محروم اور جبر کی انتہا سے لبریز...... شک سے تہہ در تہہ ترتیب یافتہ۔

"سچ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھتے ہیں۔" وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتی ہوئی ضبط کی تصویر بنی جا رہی تھی۔ اس لیے کہ مبادا اس کے لبوں سے اپنے محبوب کے لیے کوئی ایسی سخت بات نہ نکل جائے جو گستاخی کے زمرے میں آتی ہو۔ یہ بھی تو اس کی محبت ہی تھی۔ ورنہ...... ورنہ...... وہ بھی تو اپنے حق کا اختیار رکھتی تھی۔

"اور...... یہ رہی...... وہ ڈائری...... جس کو میں نے نظر بھر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ ضرورت پڑی ہی نہیں کہ مجھے خود پر بھروسہ ہے اپنے عورت ہونے پر فخر ہے اور...... میں محبت کا مطلب ہوں...... محبت جو عورت کی کتاب زندگی کا عنوان ہے مجھے اب آپ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی قسمیں کھانے کی۔ میں اپنی گواہ ہوں۔"

اس نے وہ ڈائری اپنی الماری سے نکال کر احمر کے سامنے ڈال دی۔

"احمر! آپ نے جلد ہی مجھے سمجھا دیا اچھا کیا۔" وہ تکیہ اٹھا کر اندر اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ آج پہلی بار اس نے ایسا کیا تھا۔ غصے میں آ کر نہیں بلکہ ہوش میں آ کر۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ ایسے بستر پر نہیں سو سکتی جس کے ریشم میں شک اور بے اعتمادی کے کانٹے چھپے ہوں۔



"طاہرہ بیگم! اٹھیں ذرا تیار ہو جائیں۔" نور محمد جیلانی آج "ستارہ گھی مل" سے لوٹے تو آتے ہی کہنے لگے۔ آج وہ بہت دنوں کے بعد "مل" گئے تھے اور اب آئے تھے تو کچھ الجھے الجھے سے تھے۔

"جی کہاں چلنا ہے۔ خیر تو ہے۔" وہ جو پنجسورہ لیے تخت پوش پر بیٹھی تھیں اسے بند کر کے بڑی عقیدت سے چوم کر غلاف میں بند کر کے اٹھیں اور ان کے قریب آ کر پوچھنے لگیں۔

"کہاں چلنا ہے؟" وہ ان کا پریشان چہرہ دیکھ کر خود بھی پریشان ہو اٹھیں۔

"کیا ہوا میاں صاحب...... کچھ تو بتایئے۔" وہ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ اب ان کے گھٹنوں کو ایسا مسلسل درد رہنے لگا تھا کہ وہ کھڑی رہ ہی نہ سکتی تھیں۔ اب تو وہ چلتی بھی کندھے جھکا کر...... بہت ہولے ہولے تھیں ان کے سینے میں رہنے والا درد انہیں سیدھا ہی کب ہونے دیتا تھا۔ اب تو ان کے ہر عضو میں ایک درد تھا اولاد کی نا اتفاقی کا درد جو ان کے کمزور جسم کے ریشے ریشے تک سرایت کر رہا تھا۔ لہو کے سرطان کی طرح۔

"آپ چلیں تو سہی۔ آج عمیس میاں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

نور صاحب نے بلا کسی تمہید کے انہیں بتا دیا۔ ویسے بھی آج کل ہر روز ایک نئی بات ہو جاتی نیا سانحہ پیش آ جاتا تھا۔ اس لیے کوئی کسی سے کچھ بھی نہ چھپا سکتا تھا۔

"میں نے کیا تیار ہونا ہے۔ بس یہ ذرا چادر اوڑھ لوں۔" انہوں نے بھی مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور الماری سے اپنی سفید چادر نکال کر اوڑھ لی۔

"چلیں۔" میاں صاحب نے ان کا ہاتھ تھاما اور انہیں لے کر دیوار کے اس پار جانے کے لیے چل دیئے جس کا دوسرا دروازہ اب اس گھر میں کھلتا تھا بلکہ اس گھر کو پار کر کے گلی میں دوسرا دروازہ اب اس گھر میں کھلتا تھا جو کبھی اس جیلانی ہاؤس کا حصہ تھا۔ کس طرح ایک دیوار...... محض ایک دیوار نے پورے گھر کی شکل بدل دی تھی۔ اسے کاٹ کے دو علیحدہ گھر بنا دیا تھا۔

برآمدے میں آ کر جیلانی صاحب نے اس دیوار کو اپنی بھری آنکھوں سے دیکھا جو آتے جاتے ان کی آنکھوں میں تنکا بن کر رڑکنے لگتی تھی۔

"امی! امی جان! امی جان! کدھر ہیں آپ؟" رمیض نے جیسے ہی اپنے دادا جان کو اور بی بی جان کو دیکھا وہ خوشی سے ماں کو آوازیں دینے لگا۔ وہ اس وقت باہر لان کی دھوپ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا۔ کیا بات ہے؟" بیٹے کی آوازیں سن کر ترنم بیگم جو اندر الماری کھولے کھڑی کچھ تلاش کر رہی تھیں فوراً ہی باہر کو لپکیں۔

"ارے! ابا جان آپ۔" سامنے ہی نور محمد جیلانی اور بی بی جان کو دیکھ کر خوشی سے گنگ ہی ہو گئیں۔

"ہاں بیٹی ہم......" انہوں نے بڑی ہی محبت سے بہو کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بی بی جان!" اب وہ بی بی سے لپٹ گئیں جو خود اس وقت اس قدر جذباتی ہو رہی تھیں کہ ان سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

"میری جان......" انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا کر ترنم کو ان میں سمیٹ کر اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

"بی بی جان!" ترنم باقاعدہ سسک رہی تھیں۔

"ردا آپی! ردا آپی! زائرہ آپی۔" رمیض اتنا خوش تھا کہ وہ جھٹ اپنی بہنوں کو بلانے

چلا آیا تھا۔

"کیا بات ہے مٹھو!" ردا جو فائن آرٹس کی طالبہ تھی اور اس وقت کوئی تھیم پینٹنگ کرنے کا سوچ رہی تھی اٹھ کر بھائی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ البتہ لحاف میں دبکی پڑی زائرہ نے بھائی کی آواز سننے کے باوجود کوئی نوٹس نہ لیا۔

"دادا جان اور بی بی جان آئے ہیں۔" اس نے خوشی سے بہن کو لپٹتے ہوئے بتایا۔

"دادو! سچ کہو۔" اسے یقین نہ آرہا تھا۔

"آؤ...... آؤ آکر دیکھ لو۔ ملو خود آکر۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جہاں اس کے دادا جان اور بی بی جان کے بیچ میں بیٹھیں اس کی امی جان رو رہی تھیں۔

"عمیس کو سمجھائیں ابا جان! عمیس کو سمجھائیں۔" ان کے منہ سے بار بار یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو۔ بس کرو۔ مت روؤ۔ آج میں اسی نالائق سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ ان کے سر پر تھپکیاں دیتے انہیں حوصلہ دے رہے تھے۔ دروازے پر ذرا دیر کو رُکی ردا تقریباً بھاگتی ہوئی آئی اور ان دونوں کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"دادو! بی بی جان!" وہ باری باری ان دونوں کے ہاتھ پکڑتی کبھی انہیں آنکھوں سے لگاتی اور کبھی ہونٹوں سے۔

"میری شہزادی...... میری گڑیا...... میری جان۔" طاہرہ بیگم نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کھڑی ہو کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

زائرہ جو لحاف میں دبکی پڑی تھی۔ دادا، دادی کی آمد کا سن کر اور بھی دبک گئی۔ ایک تو ویسے ہی ان کا سامنا نہ کر سکتی تھی۔ دوسرا اب اس کا جی اک نئی چوری پر بھی کھٹکا ہوا تھا۔ آج کل تو وہ ذرا سی آواز پر چونک جاتی تھی۔ اس کا دل ہر وقت اس کے کانوں میں دھڑکتا رہتا تھا اور یہ خوف اس کی رگوں میں لہو بن کر گردش کرتا رہتا تھا کہ۔

"کہیں اس نے کسی کو بتا تو نہیں دیا؟
کہیں وہ خود تو ان کے گھر نہیں آگیا؟
کہیں وہ زید کو تو نہیں لے آیا؟"

اور اب پورے تین مہینوں کے بعد دادا، دادی کا یوں اچانک آجانا۔ وہ لحاف میں ہونے کے باوجود کانپنے لگی۔ اس کے کانوں میں پڑا دل اتنے زور زور سے دھڑکنے لگا کہ اس

کی سماعتیں کانوں سے نکل کر گھر کے در و دیوار سے لگ گئیں۔ شاید وہ کن سوئیاں لینے کے لیے بھی ان دیواروں سے چپک گئی تھیں۔ اپنے بارے میں کچھ سننے سے خوفزدہ تھیں اس لیے یہ راہِ فرار ان کی مجبوری بھی تھی۔ وہ لحاف میں برف ہوئی پڑی تھی اور باہر وقت میں زمانے کی گرمی تھی۔

"زائرہ آپی! اٹھیں امی جان آپ کو بلا رہی ہیں۔" ردا نے آکر اس کے اوپر سے لحاف کھینچ لیا۔

"کک...... کک کیا ہوا؟" وہ خوف سے زرد پڑ گئی۔ اس وقت ردا کا چہرہ دوسری جانب تھا ورنہ وہ اس کی حالت دیکھ کر ضرور سمجھ جاتی کہ اس وقت وہ سوائے ایک خالی اور بے جان وجود کے اور کچھ نہ تھی۔

"آپ جلدی سے باہر آجائیں۔ دادا جان آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس کی رہی سہی ہمت بھی چھین کر وہ تو واپس چلی گئی لیکن اس کے لیے اپنا آپ ہلانا مشکل ہوگیا تھا۔

وہ اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی جب باہر آئی تو اس کی امی جان ڈائننگ کی بڑی سی میز کو چائے کے لوازمات سے آخر تک بھر چکی تھی اور ان کی خوشی اور جوش کا اندازہ ان کے چہرے سے ہو رہا تھا جو شکر کے سات رنگوں سے مزین ہو کر قوسِ قزح بنا ہوا تھا۔

"یہ لیں ناں ابا جان! یہ لیں پلیز۔ یہ چکھیں بی بی جان! یہ کباب میں نے خود بنائے ہیں اور یہ حلیم بھی لیں۔" وہ جو مہمان نوازی کے ہنر سے ہمیشہ کی آشنا تھیں۔ مگر اب جو مہمان تھے۔ وہ تو ان کے مالک تھے۔ مختار تھے۔ مہمان داری کے جز وقتی نہیں بلکہ زندگی کے ساتھ میں کل وقتی حقدار تھے۔ عمیس جیلانی ان کے ساتھ بیٹھے چپ چاپ چائے پی رہے تھے۔ جب اس نے جا کر ہولے سے کہا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔" نور محمد جیلانی نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور پیار سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اسی طرح طاہرہ بیگم نے بھی اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔ رسمی حال چال اور امتحانات کا پوچھ کر دادا جان پھر سے عمیس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"عمیس! بس میں نے کہہ دیا میرے جیتے جی یہ نہیں ہوگا۔ تم اپنے ذہن کو ایسی فضول سوچوں سے پاک کرو جو تمہیں ویسے ہی بیکار مشورے دیتی رہتی ہیں۔"

"ابا میاں! میں یہ سب بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ مجھے اسی میں بہتری لگتی ہے۔" وہ سر جھکا کر نیچی آواز میں ہی جواب دے رہے تھے مگر ان کے انداز میں سعادت مندی ہرگز نہ

تھی۔

''دیکھو تم نے اب تک جو کیا۔ میں نے برداشت کیا مگر اب یہ بات نا قابلِ برداشت نہیں بلکہ نا قابلِ قبول بھی ہے۔''

''مگر یار! کچھ تو عقل کرو۔ وہ اسلم جو آج انصاری بنا بیٹھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے اس کے آباء کیا تھے۔'' وہ اسلم انصاری کا ماضی اسے یاد دلا رہے تھے جسے یاد تو تھا مگر اس کی اہمیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔

''چھوڑیں ابا میاں وہ ان کے آباء تھے۔'' عمیس جیلانی نے اس موضوع سے دامن بچانا چاہا۔

''کیسے چھوڑوں میری بچی کے مستقبل کا معاملہ ہے کیا میں اسے میراثیوں میں صرف اس لیے بیاہ دوں کہ اب وہ دولت مند اور تعلیم یافتہ ہو چکے ہیں۔'' نور محمد صاحب کی آواز میں گھن گرج بھی شامل تھی۔ وہ بھی زیادہ سختی سے کہنے لگے۔

''مگر اس میں حرج کیا ہے؟'' عمیس جیلانی کے پاس اپنی ہر بات کے دفاع میں کئی سوال اور کئی جواب ہوتے تھے۔ انہیں چونکہ عادت تھی اس لیے وہ خود سے زیادہ کسی کو قابلِ اعتبار سمجھتے بھی نہ تھے۔

''ہم لوگ اپنی برادری سے باہر رشتے نہیں کرتے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟'' وہ بھی ان کے باپ تھے۔ اپنی منوانے کا حق بھی رکھتے تھے اس لیے دلیلیں دے کر وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ عمیس کے ساتھ ہمیشہ اپنے حق کے بل پر ہی بات کرتے تھے۔

''ہونہہ خاندان...... برادری...... ہمارے خاندانی بیٹوں میں جتنے سرخاب کے پر لگے ہیں آپ نے دیکھ ہی لیے ہیں۔'' وہ بدتمیزی بھی نیچی آواز میں کر رہے تھے۔

''زائرہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ اس پر ہمارا بھی حق ہے۔'' انہوں نے بات ختم کرنی چاہی۔

''بے شک آپ کا بھی حق ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنی اس بیٹی کی زندگی کا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیں۔ ردا اور رمیض کے معاملات میں مَیں نہ بولوں گا۔'' وہ دوسرے انداز میں اپنی ضد کے اٹل ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔

''میری زندگی کا فیصلہ۔ کون سا فیصلہ اب ابو کیا سوچ رہے ہیں۔'' زائرہ کے دیواروں سے چپکے کان بھی اُڑ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے۔ وہ حیرت و پریشانی سے کبھی اپنے دادا اور کبھی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کے لیے آپس میں بحث کر رہے تھے۔ جس پر عمیس سر جھکا

کر بیٹھے رہے کچھ نہ بولے۔

''میں نے کہہ دیا کہ اب میں ایسی کوئی بات نہیں سنوں...... اور ہاں تمہیں اگر شکایت ہے تو انیس اور اس کی اولاد سے ہے اور وہ بھی تم نے......''

''ابا جان بہتر ہوگا ہم ان کا ذکر نہ کریں۔'' عمیس میاں نے باپ کو بات پوری کرنے سے روک دیا جس پر طاہرہ بیگم کے ساتھ ساتھ ترنم نے بھی دکھ و بے چینی سے پہلو بدلا۔

''اچھا...... اچھا...... خیر...... لیکن زائرہ کے لیے خاندان میں اور بچے ہیں۔ اپنی شبانہ کے سالار اور عادل ہیں اور...... اور...... شاہانہ کا معید بھی تو ہے۔'' انہوں نے بیٹے کے سخت اور سپاٹ رویے کو نظر انداز کر کے پھر بھی مشورہ دیا۔

''ابا جان! میں؟'' اس پر بھی عمیس نے زبان کھولنے کی کوشش کی جسے میاں صاحب نے سختی سے ڈانٹ کر روک دیا۔

''کہا ناں...... اب تم کوئی سوال نہیں کرو گے۔ وقت آنے پر ہم خود دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ کمال ہے حد ہوگئی۔ اولاد نہ ہوئی سچ مچ کی آزمائش ہوگئی ہو۔ کیا اسی دن کے لیے ہم نے اپنے شب و روز محبت کی بھٹی میں جھونکے تھے۔''

وہ ناراضگی سے بولے۔ پھر اگلے چند منٹوں کے دوران کسی نے بھی کوئی بات نہ کی سب خاموشی سے اپنی اپنی پرچ پیالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے جیسے چائے پینے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''ابا جان کھانا کھا کر جایئے گا۔ میں ابھی بنا لیتی ہوں۔ جانے کے لیے اٹھے دیکھ کر ترنم آگے بڑھیں اور انہیں روکنے لگیں۔

''کھانے کی گنجائش کہاں اب اتنی لوازمات سے پُر چائے کے بعد۔'' انہوں نے ترنم بیگم کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دادا جان مت جایئے۔ رک جایئے پلیز۔'' ردا اور رمیض نے ان کے دائیں بائیں ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے روکا۔

''پھر آئیں گے بلکہ ایسا کرو تم دونوں چلو میرے ساتھ کل اتوار ہی تو ہے آج ہمارے ساتھ رہو۔ صبح آ جانا۔'' طاہرہ بیگم نے دونوں بچوں کو بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''بی بی جان! ہم......'' ان دونوں نے اتنی حسرت سے کہا کہ طاہرہ بیگم کے جی پر گویا پتھر سا لگا اس پر انہوں نے عمیس جیلانی کو ایسی شکایتی نظروں سے دیکھا کہ وہ ان نظروں سے نظریں چرا گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہریں اور جلدی ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں۔

تھی۔

"دیکھو تم نے اب تک جو کیا۔ میں نے برداشت کیا مگر اب یہ بات ناقابلِ برداشت ہی نہیں بلکہ ناقابلِ قبول بھی ہے۔"

"مگر یار! کچھ تو عقل کرو۔ وہ اسلم جو آج انصاری بنا بیٹھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے اس کے آباء کیا تھے۔" وہ اسلم انصاری کا ماضی اسے یاد دلا رہے تھے جسے یاد تو تھا مگر اس کی اہمیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔

"چھوڑیں ابا میاں وہ ان کے آباء تھے۔" عمیس جیلانی نے اس موضوع سے دامن بچانا چاہا۔

"کیسے چھوڑوں میری بچی کے مستقبل کا معاملہ ہے کیا میں اسے میراثیوں میں صرف اس لیے بیاہ دوں کہ اب وہ دولت مند اور تعلیم یافتہ ہو چکے ہیں۔" نور محمد صاحب کی آواز میں گھن گرج بھی شامل تھی۔ وہ بھی زیادہ سختی سے کہنے لگے۔

"مگر اس میں حرج کیا ہے؟" عمیس جیلانی کے پاس اپنی ہر بات کے دفاع میں کئی سوال اور کئی جواب ہوتے تھے۔ انہیں چونکہ عادت تھی اس لیے وہ خود سے زیادہ کسی کو قابلِ اعتبار سمجھتے بھی نہ تھے۔

"ہم لوگ اپنی برادری سے باہر رشتے نہیں کرتے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟" وہ بھی ان کے باپ تھے۔ اپنی منوانے کا حق بھی رکھتے تھے اس لیے دلیلیں دے کر وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ عمیس کے ساتھ ہمیشہ اپنے حق کے بل پر ہی بات کرتے تھے۔

"ہونہہ خاندان...... برادری...... ہمارے خاندانی بیٹوں میں جتنے سرخاب کے پر لگے ہیں آپ نے دیکھ ہی لیے ہیں۔" وہ بدتمیزی بھی نیچی آواز میں کر رہے تھے۔

"زائرہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ اس پر ہمارا بھی حق ہے۔" انہوں نے بات ختم کرنی چاہی۔

"بے شک آپ کا بھی حق ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنی اس بیٹی کی زندگی کا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیں۔ رِدا اور رمیض کے معاملات میں مَیں نہ بولوں گا۔" وہ دوسرے انداز میں اپنی ضد کے اٹل ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔

"میری زندگی کا فیصلہ۔ کون سا فیصلہ اب ابو کیا سوچ رہے ہیں۔" زائرہ کے دیواروں سے چپکے کان بھی اُڑ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے۔ وہ حیرت و پریشانی سے کبھی اپنے دادا اور کبھی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کے لیے آپس میں بحث کر رہے تھے۔ جس پر عمیس سر جھکا

کر بیٹھے رہے کچھ نہ بولے۔

"میں نے کہہ دیا کہ اب میں ایسی کوئی بات نہیں سنوں...... اور ہاں تمہیں اگر شکایت ہے تو عمیس اور اس کی اولاد سے ہے اور وہ بھی تم نے......"

"ابا جان بہتر ہوگا ہم ان کا ذکر نہ کریں۔" عمیس میاں نے باپ کو بات پوری کرنے سے روک دیا جس پر طاہرہ بیگم کے ساتھ ساتھ ترنم نے بھی دکھ و بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اچھا...... اچھا...... خیر...... لیکن زائرہ کے لیے خاندان میں اور بچے ہیں۔ اپنی شبانہ کے سالار اور عادل ہیں اور...... اور...... شاہانہ کا معید بھی تو ہے۔" انہوں نے بیٹے کے سخت اور سپاٹ رویے کو نظرانداز کر کے پھر بھی مشورہ دیا۔

"ابا جان! میں؟" اس پر بھی عمیس نے زبان کھولنے کی کوشش کی جسے میاں صاحب نے سختی سے ڈانٹ کر روک دیا۔

"کہا ناں...... اب تم کوئی سوال نہیں کرو گے۔ وقت آنے پر ہم خود دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ کمال ہے حد ہو گئی۔ اولاد نہ ہوئی سچ مچ کی آزمائش ہو گئی ہو۔ کیا اسی دن کے لیے ہم نے اپنے شب و روز محبت کی بھٹی میں جھونکے تھے۔"

وہ ناراضگی سے بولے۔ پھر اگلے چند منٹوں کے دوران کسی نے بھی کوئی بات نہ کی سب خاموشی سے اپنی اپنی پرچ پیالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے جیسے چائے پینے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"ابا جان کھانا کھا کر جائیے گا۔ میں ابھی بنا لیتی ہوں۔ جانے کے لیے اٹھے دیکھ کر ترنم آگے بڑھیں اور انہیں روکنے لگیں۔

"کھانے کی گنجائش کہاں اب اتنی لوازمات سے پُر چائے کے بعد۔" انہوں نے ترنم بیگم کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دادا جان مت جائیے۔ رک جائیے پلیز۔" رِدا اور رمیض نے ان کے دائیں بائیں ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے روکا۔

"پھر آئیں گے بلکہ ایسا کرو تم دونوں چلو میرے ساتھ کل اتوار ہی تو ہے آج ہمارے ساتھ رہو۔ صبح آ جانا۔" طاہرہ بیگم نے دونوں بچوں کو بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"بی بی جان! ہم......" ان دونوں نے اتنی حسرت سے کہا کہ طاہرہ بیگم کے جی پر گویا پتھر سا لگا اس پر انہوں نے عمیس جیلانی کو ایسی شکایتی نظروں سے دیکھا کہ وہ ان نظروں سے نظریں چرا گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہریں اور جلدی ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں۔

بیٹے کے کٹھور پن پر ان کی آنکھوں میں بھرا ہوا پانی اب بہہ نکلنے کو مچل رہا تھا۔

❖......O......❖

یہ سردیوں کی پہلی بارش تھی۔ جو چھما چھم برس رہی تھی۔ تیز ٹھنڈی ہوا اور صبح فجر سے شروع ہونے والی بارش دن کے دس بج جانے پر وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اسے پچھلے دو روز سے بخار بھی تھا اور اب یہ غضب کی سردی...... اسے ویسے بھی بے حد سردی لگا کرتی تھی۔

وہ بستر میں ہی سکڑی ہوئی تھی۔ ردا نے اس کے کہنے پر ابھی ایک کمبل بھی اس کے لحاف کے اوپر ڈالا تھا اور اب وہ اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔

''آپی! اٹھیں کافی لے لیں۔''

''اچھا تم اِدھر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو۔ میں لے لوں گی۔'' اس نے ٹھٹھرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے واہ کافی! وہ بھی تنہا...... اکیلے اکیلے۔''

اچانک ہی رامین کی آواز آئی۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس نے ردا کو ''کافی پی لیں'' کہتے سن لیا تھا۔

''رامین آپی! آپ وہ بھی اس قدر سخت سردی اور بارش میں......'' اسے دیکھ کر ردا کو خاصی حیرت ہوئی تھی۔

''میری جانِ جگر بیمار پڑی ہے اور میں نہ آتی...... بارش ہے۔ سردی ہے تو کیا ہوا؟'' وہ سیدھی زائرہ کے لحاف میں گھستی ہوئی بولی۔ جس کی آواز سن کر زائرہ نے بھی لحاف سے سر نکال لیا تھا۔

''یہ کیا تم ہر وقت بیمار پڑی رہتی ہو۔ اٹھو یار! سردیوں کو انجوائے کرو۔'' وہ جو خود اس وقت سردی سے ٹھٹھر رہی تھی زائرہ کو مذاق کر رہی تھی۔

''میں آپ کے لیے بھی کافی لاتی ہوں۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی آپ کی مہربانی ہوگی۔ ویسے اگر کافی کے ساتھ کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو۔ وہ کیا ہے کہ بندی بغیر ناشتے کے آئی ہے۔'' رامین نے دانت نکالتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

''جی جی...... فکر نہ کریں بندی کو آپ کا چہرہ اور وہ سامنے لگے وال کلاک پر بجتے ساڑھے دس کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا۔''

''لاتی ہوں۔'' ردا نے بھی اسی کے انداز میں کہا اور ناشتہ بنانے کچن کی طرف چل دی۔

''اے لڑکی! اٹھو...... چھوڑو یہ سب...... اور غور سے سنو۔'' ردا کے جاتے ہی رامین شروع ہو گئی۔

''تم نے کتنے روز سے اسے فون نہیں کیا۔ نہ ہی کوئی میسج نہ ہی میل آخر ماجرا کیا ہے؟ اُدھر وہ میرا سر کھا گیا ہے۔'' وہ جلد ہی اس مطلب کی طرف آ گئی جس کی خاطر وہ آج اتنے خراب موسم کے باوجود اس کے گھر آئی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔ جس کا مطلب تھا وہ جھوٹ کہہ رہی ہے ورنہ اس کی طبیعت کی خرابی کی وجہ نہ تھی۔

''اِدھر دیکھو میری آنکھوں میں...... اور پھر کہو۔'' اس نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

''رامین!'' اس کی طرف دیکھتے ہی وہ سسک پڑی۔

''ارے...... رے...... رے...... میری جان۔'' جس پر رامین چٹ چٹ اس کی بلائیں لینے لگی۔

''کیا ہوا...... ہاں کیا ہوا...... مجھے بتاؤ۔'' وہ پیار کر کر کے اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

''وہ...... ابو میرا رشتہ طے کرنے کا سوچ رہے ہیں اور...... اور دادا جان الگ سے مشورے دے رہے ہیں۔'' اس نے جلد ہی اپنے بیمار پڑنے کی وجہ بتا دی۔

''ہُو...... ؤ...... وں تو یہ کہانیاں چل رہی ہیں۔'' اس نے لمبی سی ''ہوں'' کھینچتے ہوئے کہا۔

''یہ ظالم سماج باز نہیں آئے گا اور آئے بھی کیسے تم جو اتنی بزدل اور کمزور ہو کر پڑ گئی ہو۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''تو میں کیا کروں؟'' '' اب وہ واقعی خود کو بزدل اور کمزور سمجھنے لگی تھی اس روز والے واقعے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ڈی، ایس، پی اس کے حواس پر بُری طرح چھا گیا تھا۔ ایک آسیب کی طرح۔ اس کی ہمت سے چپک گیا۔ اس کی ان ایک لمحے کو گھورتی آنکھیں جن میں اس کے لیے پہچان کی چمک کوندی تھی۔ انہوں نے زائرہ بی بی کے ہاتھ پاؤں جکڑ کے اسے بستر پہ ڈال دیا تھا اور اس کے اندر کی ساری بے باکی اور بغاوت بودی ہو کر رہ گئی تھی۔

''Oh Shit yaar! تم بھی ناں ذرا ذرا سی باتوں سے ڈر جاتی ہو۔'' رامین نے اس کی کیفیت سے اس کے اندر کو پڑھتے ہوئے کہا۔

''یہ عشق...... محبت دراصل تم جیسی لڑکیوں کے کام ہیں ہی نہیں۔ خدا جانے تم نے

کیوں دل لگالیا۔'' اب وہ اسے طنز کررہی تھی۔

''ایسا کروتم اپنے ابا جان یا...... یا پھر دادا جان کی مان لو...... کسی بھی اُلو کے پٹھے سے شادی کرواور جاؤ جا کر عیش کرو۔ کوئی عمر بھر کے لیے پاگل ہو جائے یا پھر تمہارے فراق میں جان دے دے۔ تمہیں اس سے کیا؟'' اب وہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ غصے کا اظہار بھی کررہی تھی۔

''میں...... ایسا نہیں کرسکتی۔ میرا یقین کرو۔ میں خود اس کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔'' وہ اسے اپنے ان جذبوں کا یقین دلانے لگی جو حسان کے لیے اس کے دل میں تھے اور سچے تھے۔

''تو...... تو پھر تم کیا کروگی۔ بلکہ تم کیا کرسکتی ہو۔ سوائے یہ آنسو بہانے کے۔'' وہ طنز کر کے اس کے زخموں پر جانے نمک کیوں چھڑک رہی تھی۔

''میں...... میں اپنی ہی جان لے لوں گی۔'' جس پر وہ جوش میں بولی۔

''Oh Really'' اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر بھی بے یقینی سے کہا۔

''I mean it میں کر کے دکھاؤں گی۔'' وہ خوداعتمادی سے بولی۔

''گڈ...... ویری گڈ...... تم دونوں ایسا کرو۔ ایک ساتھ خودکشی کرلو۔ تاکہ تمہاری محبت اُمر ہو جائے اور تم اس دنیا کے لیے محبت کی مثال بن جاؤ اور...... اور تمہارا نام ''داستانِ محبت'' میں سنہری حروف سے لکھا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

وہ اس پر طنز کررہی تھی یا اسے ایسا کرنے کا مشورہ دے رہی تھی زائرہ کو کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔

''What non sense خوابوں کی دنیا سے نکلو اور اس دنیا میں اسی دنیا کے اصولوں کے مطابق جینا سیکھو۔ محبت کی ہے تو اسے حاصل کرو یہ تمہارا حق ہے۔ گھر والوں کو مناؤ اگر نہیں مناسکتیں یا وہ نہیں مانتے تو کورٹ میرج کرلو۔'' اس نے بڑی سہولت، بڑی بے تکلفی سے اسے مشورہ دے دیا۔

''کورٹ میرج......'' وہ لمحہ بھر کو تو چکرا ہی گئی۔

''نن...... ن...... نہیں...... میں یہ نہیں کرسکتی۔'' وہ یہ مشورہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

''تو ٹھیک ہے کرلو خودکشی اور اسے بھی بتا دینا کہ تم ایسا کررہی ہو تاکہ وہ بھی......'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ناشتہ...... ناشتہ......'' اتنے میں ردا ناشتے کی ٹرے ہاتھ میں لیے ناشتہ ناشتہ پکارتی آ گئی۔

''ارے واہ جیتی رہو۔'' ناشتہ دیکھ کر رامین نے باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔

''آملیٹ...... آلو کی بھجیا اور یہ بل دار گرما گرم پراٹھے۔ واہ...... کیا بات ہے۔'' وہ ٹرے کو اپنے سامنے رکھ کر ندیدی نظروں سے اس میں رکھی چیزیں دیکھ کر بولی۔

''آپی کو بھی ناشتہ کروادیں۔ انہوں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔'' ردا نے زائرہ کو بستر سے اٹھے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بے فکر ہو جاؤ بیٹا...... یہ ناشتہ ہی نہیں دوپہر کا کھانا بھی ڈٹ کر کھائے گی۔'' اس نے سینہ پھلاتے ہوئے اپنا اعتماد دکھانے کی کوشش کی جس کے بل پر وہ اتنے یقین سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا تو آپ دوپہر کا کھانا بھی کھائیں گی۔'' ردا جو طبعاً خاصی خوش مزاج تھی اس نے رامین کے ارادے بھانپتے ہوئے مذاق کیا۔

''جی بالکل...... بالکل آپ بس جا کر کھانے کی تیاری میں لگیں۔ آج تو کوئی بریانی شریانی ہونی چاہیے۔''

''بہتر جناب......'' ردا آرڈر لے کر ایک سعادت مند ویٹرس کی طرح واپس چلی گئی اور وہ زائرہ کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر ناشتہ کروانے لگی۔ پھر اگلے کئی گھنٹوں تک وہ اور زائرہ کمرے میں بند رہیں۔ آپس میں چپکی ہوئیں ہولے ہولے سرگوشیاں کرتیں۔ کبھی موبائل سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور کبھی کمپیوٹر پر آنکھیں ٹکائے کچھ سرچ کرتیں۔ ردا بے چاری دوپہر کا کھانا بھی انہیں اندر ہی پہنچا گئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی اب اس کی آپی کافی فریش ہو چکی تھی۔ اب اس کے اعصاب پر طاری بخار اور سردی دونوں ہی اُتر چکے تھے۔



''آؤ ناں! کیا ہوا؟'' رامین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اسی گیٹ کے سامنے کھڑی تھیں جہاں آنے سے زائرہ ہمیشہ گھبراتی تھی۔

''یہ تم مجھے ہمیشہ یہیں کیوں لے آتی ہو؟'' آج تو اس کے پاؤں بالکل بھی اندر جانے کو تیار نہ تھے۔

''اور یہ تم ہر بار یہاں پہنچ کر کیوں نخرے کرتی ہو؟'' وہ الٹا اس پر آنکھیں نکالے کھڑی ہوگئی۔

''حسان کو کوئی اور جگہ نہیں ملتی۔'' اسے حسان پر غصہ آ رہا تھا۔

''میڈم صاحبہ! باہر جا کر ملنے کا انجام تو تمہیں یاد ہوگا کہ بھول گئیں۔'' وہ اسے یاد کرانے لگی۔ جسے سن کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔

''تم جانتی ہوناں حسان کے گھر والے تو کینیڈا ہوتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں اس کی یہی ایک رشتہ دار ہیں اور پھر آنٹی اتنی اچھی ہیں۔ تمہیں تو اتنا پیار کرتی ہیں۔'' رامین نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔ وہ ''گیسٹ ہاؤس'' کی اس مالکہ کی تعریف کم اور حمایت زیادہ کر رہی تھی۔ دونوں باتیں کرتی ہوئیں اندر آ چکی تھیں۔

''مگر آنٹی نے اپنے گھر کو گیسٹ ہاؤس کیوں بنا رکھا ہے؟'' زائرہ کا ذہن ان کے بارے میں پھر بھی الجھا ہوا تھا۔

''بھئی ان کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ بیچاری نے اپنی اچھی گزر اوقات کے لیے اپنے گھر کے نچلے حصے کو گیسٹ ہاؤس بنا دیا ہے۔ ویسے بھی ان کے اپنے تو اولاد ہے نہیں۔''

رامین اسے حسان کی آنٹی کے بارے میں تفصیل بتا رہی تھی۔

''اور وہ ریاض؟'' زائرہ کو وہ لال لال بے باک آنکھوں والا ریاض یاد آ گیا۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے ذرہ برابر عزت یا احترام نہیں ہوتا تھا۔

''وہ آنٹی کا منہ بولا بیٹا ہے۔'' رامین نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''چل چھوڑ تو نے کسی اور سے کیا لینا ہے؟ آنٹی ہوں یا ریاض! تجھے حسان سے مطلب ہونا چاہیے۔''

''حسان! جو صرف تمہاری وجہ سے یہاں اتنی دور آیا ہوا ہے۔'' اب وہ حسان کی حمایتی ہو گئی۔

''اچھا......'' اس نے ڈھیلا سا ''اچھا'' کہا۔

''مگر رامین! آج کے بعد میں دوبارہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔'' وہ اپنے گھبرائے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔

''اس کی ضرورت بھی کب پڑے گی بنو!'' رامین نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے اسے چھیڑا۔ وہ دونوں گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں آ چکی تھیں جہاں پہلے بھی وہ ایک دو بار حسان کو ملنے آ چکی تھی اور جہاں سے جانے کے بعد وہ ہر بار یہی سوچتی تھی کہ اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی۔

''اوہ ہیلو گرلز!'' اتنے میں حسان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!'' رامین نے کھلتے ہوئے جواب دیا۔

''کیسی ہو مینو؟'' اس نے رامین کا نک نیم لیتے ہوئے اس کا حال پوچھا۔ یہ دونوں آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔

''فائن...... تھینک یو!'' وہ مسکرائی۔

''وٹس اپ بے بی!'' حسان نے زائرہ کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ تو خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی مگر رامین چہکی۔

''ہونا کیا ہے۔ مس زائرہ جیلانی اب سے چند لمحوں کے بعد مسز حسان قاضی بننے جا رہی ہیں آپ کو پیشگی مبارک ہو۔'' اس نے حسان کے سامنے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اٹس مائی پلیژر۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیم سے جھکا۔

''سو مجھے اجازت کہ دو چاہنے والے زیادہ دیر تک اگر کسی تیسرے کی موجودگی محسوس کریں تو اسے وہی سمجھنے لگتے ہیں۔'' وہ ذو معنی انداز میں ان دونوں کو دیکھنے لگی اور پھر کھلکھلا کے بولی۔

''کباب میں ہڈی...... اور مجھے وہ کباب والی ہڈی نہیں بننا۔''



''زائرہ!'' رامین کے جانے کے بعد کئی لمحے ان دونوں کے درمیان خاموش اور جامد سے گزر گئے تو حسان نے اسے پکارا۔

''زائرہ!'' اس کے مسلسل چپ رہنے پر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے اپنی مما کو بتا دیا ہے۔''

اب اس نے زائرہ کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا تھا۔

''اچھا...... پھر؟'' اس نے بمشکل اپنی پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ آج وہ جینز اور شرٹ کی بجائے شلوار قمیص میں تھا۔ نیوی بلو کا مدار کرتا اور سفید لٹھے کی شلوار اس کا سفید رنگ اور اس پر تازہ کی ہوئی شیو اس کا دل جیسے ایک پل کو دھڑکنا ہی بھول گیا۔

''مما نے مجھے اجازت دے دی ہے۔ میں نے مما کو منا لیا ہے زائرہ؟'' وہ اس کی اُٹھی ہوئی پلکوں میں سے اس کے دل میں اُتر گیا۔

''ابھی اُن کا فون آئے گا۔ وہ تم سے بات کریں گی۔'' وہ اس کے دل کی زرخیز ہونے

والی زمین پر ایک پھوار کی طرح برس رہا تھا۔

''بس ہماری مشکلات ختم ہو جائیں گی۔'' اس نے اسے ایک مکمل خوشخبری سنائی۔

''حسان!'' وہ اس کی باتوں اور نظروں کی پھوار میں بھیگی ہوئی بولی۔

''ہوں...... کہو؟'' حسان نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے ساتھ لگا لیے۔

''اب جب آنٹی مان گئی ہیں تو پھر ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔'' وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔

''انتظار...... اب مزید؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''اب نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ ایک اور پل بھی نہیں۔''

وہ سر سے پاؤں تک جذبات کی شدت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''لیکن یہ طریقہ درست نہیں ہے۔'' وہ پھر نکاح کے اس چور راستے سے بچنا چاہ رہی تھی جس میں مجبوراً اسے قدم رکھنے پڑ رہے تھے۔

''کیا درست نہیں...... ہاں کیا درست نہیں؟'' اس نے ایک دم سے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''حسان! ہمیں اپنے والدین کی مرضی سے شادی کرنا چاہیے۔'' وہ اس کے چہرے پر ظاہر ہونے والی خفگی کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہوئی بولی۔

''والدین کی مرضی سے...... ہاں والدین کی مرضی سے؟'' اس نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں کو پنجوں کی طرح گاڑھتے ہوئے کہا۔ جس کا مطلب تھا وہ اس کے ساتھ ناراض ہو رہا ہے۔ اس کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔ وہ اسے پوچھ رہا تھا۔

''کیا تمہارے گھر والے مان جائیں گے۔ جو آج کل میں تمہاری شادی کرنے پر تیار ہوئے بیٹھے ہیں؟'' وہ اس کے اس سوال پر نظریں چرا گئی تو حسان نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اوپر کو اُٹھاتے ہوئے دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''زائرہ! تم خود تو کہتی ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ تم اپنی مرضی سے شادی کرو۔ نہ ہی وہ آسانی سے مجھے قبول کریں گے اور پھر تمہارے کسی کزن کے ساتھ تمہاری منگنی یا نکاح کی رسم بھی ہونے کو ہے۔'' وہ اسے تلخ حقائق یاد کرا رہا تھا۔

''ان حالات میں...... ان حالات میں ہمارے پاس سوائے اس راستے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ پھر بھی اگر تم راضی نہیں ہو تو میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔'' اس نے زائرہ کے کندھوں پر سے اپنے ہاتھ اور اس کی آنکھوں پر سے اپنی آنکھیں اُٹھا لیں اور

چہرہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔

''زائرہ! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے تم کو چاہا ہے اور میری محبت تمہیں پا کر آسودہ ہونا چاہتی ہے لیکن...... لیکن اگر ہم شادی کے بندھن میں بندھ نہ سکیں گے تو بھی یہ محبت تو زندہ رہے گی۔ بلکہ...... بلکہ امر ہو جائے گی۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اور اس میں اپنے جذبات پروتے ہوئے ادا کیا تھا۔

''میں تو تمہیں بے وفا نہیں کہوں گا اگر تم مجھے چھوڑ دو گی تب بھی...... مگر کیا تم میرے بغیر رہ پاؤ گی۔''

وہ پلٹا تو اس کی آنکھوں کے کنارے گیلے تھے۔ اس کی محبت کی پھوار تلے کھڑی زائرہ کے تو گلے تک پانی آ گیا قریب تھا کہ وہ اس میں ڈوب جاتی۔

''زائرہ! میں زیادہ ہمت والا نہیں ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہیں کھو کر بھی زندہ رہوں۔ میں...... میں......'' اس کی آواز رندھ گئی اور اس کی آنکھوں کے کنارے ٹوٹ گئے۔ زائرہ کے گلے تک آیا ہوا پانی اس ریلے کے ساتھ اور سمندر بن گیا جس میں زائرہ کا ارادہ اس کی خواہش اس کا وجود خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

''حسان پلیز!'' وہ اس کے منہ سے کوئی ایسا لفظ۔ کوئی فقرہ برداشت نہیں کر سکتی تھی جو زندگی سے اس کا ناتا توڑنے والی ہو۔

''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک......'' اتنے میں کمرے کے دروازے پر ایک مخصوص دستک اُبھری اور زائرہ کے ہاتھ اپنی چادر کی بکل ٹھیک کرنے لگے۔

''حسان صاحب! اب بس کریں۔ کچھ آنے والے اس حسین وقت کے لیے بھی بچا کر رکھ لیں جو آپ کے مقدر پر ایسے ہی دستک دے رہا ہے۔'' ریاض نے دوبارہ سے دروازے پر اپنی انگلیوں کی پشت سے ٹھک ٹھک کرتے ہوئے کہا۔

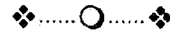
''اچھا کیا بات ہے؟ جلدی کہو؟'' حسان کو اس وقت اس کی آمد اچھی نہ لگی وہ دیکھ رہا تھا کہ زائرہ چادر کا پلو کھینچ کر اپنا چہرہ اس میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''او کھے کیوں ہوتے ہو یار!'' وہ ڈھٹائی سے ہنستا ہوا بولا۔

''امی جان بلا رہی ہیں تم دونوں کو اوپر......'' حسان کو بدستور سنجیدہ پا کر وہ ذرا سا کھسیا گیا اور جو پیغام اسے دینے آیا تھا وہ دیتا ہوا بولا۔ وہ اتنا کہہ کر واپس چلا گیا اور زائرہ کا چند لمحے پہلے گلابی پڑتا چہرہ ایک دم سے زرد ہونے لگا۔

اس کے گلے میں کانٹے چبھنے لگے۔ اسے پسینے آنے لگے جبکہ اس کی زبان خشک ہو کر

اس کے تالو سے لگ گئی اور وہ اپنے نرم و نازک لبوں کو بے دردی سے اپنے دانتوں تلے کچلنے لگی۔



''حسین محمد! حسین محمد!'' ڈی ایس پی عبدالمالک جو پچھلے بے شمار لمحوں سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا ایک دم سے اپنی سیٹ سے اُٹھا اور اپنی کیپ اپنے سر پر لیتا ہوا حوالدار حسین محمد کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس کے کمرے کے دروازے کے باہر بیٹھا چوکیدار چونک کے اُٹھا۔

''جی صاحب!'' وہ مؤدب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''حسین محمد کو فوراً بھیجو۔'' اس نے حوالدار کا نام لےکر حکم دیا جس پر وہ بیچارا پھرکی کی طرح گھوما اور اس نے حوالدار حسین محمد کے پاس جا کر ہی دم لیا۔

''صاحب نے فوراً بلایا ہے۔'' وہ اسے پیغام دے کر پھر اپنے پاؤں پر اسی انداز میں گھوما اور اگلے ہی لمحے واپس اپنی ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہی حسین محمد بھی اسی انداز میں آ چکا تھا۔

''سر!'' حسین محمد نے عبدالمالک کے روبرو پہنچتے ہی سیلوٹ کیا۔

''تیاری پکڑو...... حسین محمد!'' عبدالمالک کی آنکھوں میں ایک بجلی کوند رہی تھی۔

''سر! تیاری مکمل ہے۔'' وہ پُر اعتماد انداز میں جواب دے رہا تھا۔

''جمال کہاں ہے؟'' ڈی ایس پی نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ایس ایچ او جمال الدین کے بارے میں پوچھا تھا۔

''سر! وہ وہیں موقع کی نگرانی پر موجود ہے۔''

حسین محمد اس کے قدم بہ قدم چلتا ہوا جواب دے رہا تھا۔

''گڈ......'' اس نے ایک سنجیدہ سی شاباش دی۔

''کیا رپورٹ ہے؟''

''سر! آپریشن آج کلین اَپ ہو جائے گا۔''

''ان شاء اللہ تعالیٰ......'' ڈی ایس پی نے اپنی جیپ کے قریب پہنچ کر اسے مسکرا کر دیکھا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ سر!'' حسین محمد کے لب بھی ذرا سے کھلے۔ اس نے ڈی ایس پی کی جیپ کا دروازہ کھولا اور پھر اس کے اندر بیٹھتے ہی پھرتی سے جیپ کی دوسری جانب آیا اور اس

کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جیپ سٹارٹ ہوئی اور اک فراٹے سے آگے بڑھ گئی۔



''سر جی!'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے حسین محمد نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے افسر کے بے حد سنجیدہ اور رعب دار چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' افسر نے اپنی نگاہیں سامنے سڑک، سے ہٹا کر اس کی طرف گھمالیں۔

''سر جی! یہ آپریشن اس وقت تو کامیاب ہو جائے گا۔ مگر کیا سچ مچ کلین اَپ بھی ہو جائے گا؟'' اس کے سوال میں بے یقینی اور فکر مندی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کی بات کا مطلب جاننے کے باوجود ڈی ایس پی اس سے پھر پوچھ رہا تھا شاید اس کے سوال کی وضاحت سے اپنی بے چینی کو قرار دینا چاہتا تھا جو اس کے دل میں پچھلے کئی روز سے بس بلکہ گڑی ہوئی تھی۔

''سر! آپ جانتے ہیں اس عورت المعروف ''آنٹی'' پر یوں ہاتھ ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟'' حسین محمد بہت ہی پریشان تھا وہ اس عورت کے تعلقات اور لمبے لمبے ہاتھوں کے کرشمات پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا اس لیے ایسا کہہ رہا تھا۔

''یار! میں جانتا ہوں سب......'' اس نے اپنی حد سے زیادہ سنجیدہ صورت پر ذرا سے غصے کی آمیزش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے اس بدکردار عورت سے زیادہ فکر ان لڑکیوں کی ہے جو اس وقت اس مکروہ دھندہ کے دام اُلفت میں بُری طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ جن کی حیا داری اور شرافت کا خون ہو رہا ہے۔ جانے کتنی اس کے جال میں آ کر لٹ چکی ہیں اور کتنی......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر پریشانی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

''یہ پھر صاف بچ جائے گی۔ آپ نے اس کی فائل دیکھی ہے ناں؟''

حسین محمد اس آنٹی کے سابقہ ریکارڈ کی بات کر رہا تھا۔ جس کا بڑی گہرائی سے عبدالمالک نے مطالعہ کیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ عورت کوئی عام سی دھندہ کرنے والی عورت نہیں ہے۔ یہ تو آج کی بڑی ہی شاطر اور ہوشیار عورت تھی جس نے اپنے تعلقات بہت دور دور تک بنا رکھے تھے اور اس کے پاس جو کستوری تھی اس کی لپک پر تو بڑے بڑے شرفا و امراء اور سیاست دان کھنچے چلے آتے تھے۔ عبدالمالک سے پہلے بھی دو اور پولیس افسروں نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی کوشش ابھی پلاننگ تک ہی محدود تھی اور ان کے ٹرانسفر

بھی کروا دیے گئے۔ اور انہیں ایسی جگہ پر پھینکا گیا جو ان کے لیے کالے پانی سے کم نہ تھی۔

اب عبدالمالک نے اس پر انگلی اُٹھائی تھی اور وہ محض انگلی کے اک خفیف اشارے تک نہ رہا تھا بلکہ وہ تو اس پر پورا ہاتھ ڈالنے چل پڑا تھا۔ حسنین محمد اندر ہی اندر فکر سے گھلا جا رہا تھا کہ عبدالمالک کو اپنے اس کیے کی جانے کیا سزا ملے۔ وہ اس کی طرف ایک بھرپور نظر مارتا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ نوجوان ہے ابھی...... ابھی تو اس نے زندگی کی بہاریں بھی نہیں دیکھیں اور ابھی سے اس نے اپنے سر پر کفن باندھ لیا ہے۔ وہ اس کے لیے سلامتی کی دعائیں کر رہا تھا۔ اسے اس جوان افسر کے ساتھ محض ہمدردی نہ تھی بلکہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں محبت کے جذبات پاتا تھا۔ ایسے جذبات جو اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ہوتے ہیں۔

”حسنین محمد! تم فکر نہ کرو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ عبدالمالک نے اس کے چہرے پر سے اس کا دل پڑھتے ہوئے کہا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھنے والے کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ ہے ہمارے ساتھ۔“ اس نے حسنین محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”بے شک وہی ہے ہمارا مددگار۔“ حسنین محمد کے چہرے پر پریشانی کی جگہ دوبارہ سے وہی اعتماد عود کر آ گیا جو پولیس اسٹیشن سے نکلتے وقت اس کے چہرے پر تھا۔ اس نے جیپ کی رفتار بڑھا دی تھی کیونکہ کالے گیٹ والا وہ بدنام زمانہ گیسٹ ہاؤس اب بالکل قریب ہی تھا۔



”ہیلو...... بختیار!“

”جی بھائی جان میں...... السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟“

”الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں یار تم لوگ کہاں ہو۔“

”بھائی جان! میں تو آج کل گاؤں آیا ہوا ہوں۔ وہ چھٹیاں تھیں ناں اس لیے ذرا......“ بختیار نے کہا۔ اس کی آواز میں امتحانات سے فراغت کی خوشی اور ان دنوں کی بے فکری کا عنصر صاف جھلک رہا تھا۔

”اوہو تو تم لاہور نہیں ہو؟“ عبدالمالک کی آواز میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ اب پریشانی بھی تھی۔

”جی بھائی جان! کیا بات ہے خیر تو تھی؟“ وہ اس کی آواز میں پریشانی بھانپ کر خود پریشان ہو گیا تھا۔

”اچھا وہ تمہارا دوست زید کہاں ہے؟“ اب وہ زید کے بارے میں پوچھ رہا تھا

”زید؟“ بختیار کو حیرت ہوئی کہ عبدالمالک زید کا کیوں پوچھ رہا ہے۔

”ہاں بھئی وہ تمہارا دوست جو اکثر تمہارے ساتھ ہوتا ہے وہ جیلانی گھی اینڈ آئل ملز والوں کا بیٹا۔“ بختیار کو یاد دلانے کے لیے عبدالمالک نے تفصیلاً بتایا۔

”جی...... جی...... بھائی جان! وہی تو میرا جگری دوست ہے۔“ بختیار نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ زید کے بارے میں اسے کچھ اور تعارف دے کر یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔

”کہاں ہے وہ؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”وہ...... وہ تو آج کل کراچی گیا ہوا ہے۔ اپنی چھٹیاں انجوائے کرنے۔“

بختیار نے بتاتے ہوئے پھر دوبارہ پوچھ بھی لیا۔ ”کیوں بھائی جان آپ کو اس سے کوئی کام تھا؟“

”ہاں...... مجھے اس کے ساتھ ایک بے حد ضروری کام تھا۔ اچھا تم ایسا کرو مجھے اس کا موبائل نمبر دے دو۔“

عبدالمالک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”جی...... جی میں آپ کو ابھی اس کا نمبر Send کرتا ہوں بس ایک منٹ میں۔“ اور پھر بختیار نے اسے واقعی اگلے ہی لمحے زید کا نمبر Send کر دیا تھا۔

زید کا موبائل نمبر عبدالمالک کے سامنے تھا مگر اب وہ اسے فون کرنے کے لیے ہچکچا رہا تھا اور عجیب اُلجھن میں اتر گیا تھا۔

”وہ خود اتنی دور بیٹھا ہے۔ کہاں لاہور اور کہاں کراچی۔“ وہ پریشانی سے اپنے آفس میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کیا کرے۔

”وہاں اتنی دور...... اتنی بُری خبر سن کر وہ...... وہ تو پریشان ہو جائے گا۔ پتہ نہیں برداشت بھی کر پائے گا یا نہیں؟“

”تو پھر میں کیا کروں؟ کسے اطلاع دوں۔ یہاں کس کو بلاؤں۔“ اس نے اپنے سامنے تھر تھر کانپتی اس لڑکی کو دیکھ کر ایک لمحے کو رُک کر سوچا۔ جس کی حالت اس وقت ایک زندہ لاش کی سی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ اس روتی کانپتی لڑکی کا ”اِن کاؤنٹر“ ہی کر دے قصہ ہی پاک کر دے۔

پتہ نہیں یہ لڑکیاں ایسی کیوں ہوتی ہیں؟ اس کے دل و دماغ میں اسے دیکھ کر اس جیسی ساری لڑکیوں کے لیے بے انتہا نفرت رینگنے لگی۔ ایسی لڑکیوں کو زندہ رہنا ہی نہیں چاہیے۔

جو ماں باپ کے لیے ذلت کا باعث ہوں۔

جن کی وجہ سے ان کے بھائیوں کو زمانے بھر کی انگلیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

جن کی وجہ سے ان کی دوسری بہنوں کو معاشرہ دھتکارنے لگے اور دنیا کی رسوائیاں اپنے تن پر اوڑھے اوڑھے بوڑھیاں ہو جائیں مگر کوئی بیاہنے نہ آئے۔

یہ بیٹیاں نہیں......والدین کی عزت پر سیاہ دھبہ ہیں۔

رحمت نہیں ذلت ہیں اور ذلت کو مٹا ہی دینا چاہیے غیرت مندی کا تقاضا تو یہی ہے۔

وہ غصے اور نفرت سے بلبلا رہا تھا۔ اس کا جلتا ہوا ہاتھ بار بار اپنی پیٹی میں اٹکی پستول پر جا پڑتا جو گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے باپ کو فون کرتا ہوں۔ اسے بلا کر اس کے حوالے کرتا ہوں۔ وہ خود ہی یہ کام کر دے گا۔ بھلا اب اسے کون قبول کرے گا؟

اس نے دوبارہ سے ایک نظر اس دیوار سے لگی بے جان تصویر پر ڈالی جو اب خوف کی شدت سے پتھر ہو چکی تھی۔

وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا تاکہ آپریٹر سے اس کے گھر کا نمبر ملانے کو کہے۔

''مگر کیا ایک شریف باپ تھانے آ سکے گا۔ اس کی کمر تو یہ روح فرسا خبر سن کر ہی ٹوٹ جائے گی۔'' اس کے ریسیور تھامے ہوئے ہاتھ نے دوبارہ ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے بھائی کو خبر کرتا ہوں۔ ایک اور خیال اس کے جی میں آیا۔ بھائی؟ بھائی تو اور بھی زیادہ غیرت مند ہوتے ہیں وہ تو اس کو یہیں پر آ کر شوٹ کر جائے گا۔ اسے یاد آ گیا پچھلے دنوں بالکل ایک ایسا سانحہ ہو چکا تھا جب ایک بھائی نے تھانے آ کر اپنی بدکردار بہن کو شوٹ کر دیا تھا۔

اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زید کا معصوم سا چہرہ گھوم گیا پتہ نہیں کیوں کچھ عرصے میں ہی وہ لڑکا اسے اچھا لگنے لگا تھا اور وہ بختیار سے کہا کرتا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے بختیار کہ زید تمہارا دوست ہے۔ ایسے دوست تو خدا کی نعمت ہوتے ہیں۔ اسے واقعی زید کی عادات۔ اس کا اخلاق اور اس کا مضبوط کردار بہت بھاتا تھا۔

''کاش زید یہیں ہوتا۔'' وہ بے بسی سے سوچتا ہوا دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''سر جی! وہ باہر میڈیا والوں نے بہت ہنگامہ کیا ہوا ہے۔ آپ آ کر سنبھالیں ذرا۔'' اتنے میں ایک کانسٹیبل نے دروازے کے اندر آ کر اطلاع دی۔

''کیا چاہتے ہیں یہ میڈیا والے؟'' وہ غصے سے بولا۔

''سر جی! کہہ رہے ہیں انہیں آپ کے چھاپے کی تفصیلات اور پکڑے جانے والے لڑکے لڑکیوں کی تصویریں چاہئیں۔'' وہ بیچارا کانسٹیبل ذرا سہما سا کہہ رہا تھا وہ ڈی ایس پی

عبدالمالک کے رعب و دبدبے سے خاصا مرعوب تھا جانتا تھا یہ پولیس آفیسر بڑا با اصول اور سخت گیر ہے۔

''اچھا ان کے لیے بیٹھنے کا انتظام کرو۔ کہو جا کر میں پر.س کانفرنس میں آ کر سب بتاتا ہوں۔''

اس نے اس وقت غصے کی بجائے حکمت سے کام لیتے ہوئے پریس کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا آج کل میڈیا سے دامن بچانا ممکن نہیں، اگر ان سے کچھ چھپایا جائے تو یہ اور زیادہ بپھر جاتے ہیں اور بال کی کھال اُتارنے لگتے ہیں۔ ''جی بہتر صاحب!'' پیغام لے کر آیا ہوا کانسٹیبل مؤدب انداز میں سلیوٹ کرتا ہوا دوبارہ باہر چلا گیا۔ ''پریس کانفرنس'' وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا پریس کانفرنس کے بارے میں وہ نکات اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا جن کے ذریعے اس نے میڈیا کے سارے ہی الٹے سیدھے سوالات کا جواب دینا تھا۔

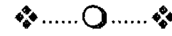


جتنی دیر میں حسین محمد حوالدار اور ایس ایچ او صلاح الدین بیگ نے میڈیا والوں کو چائے شائے پلائی اور پریس کانفرنس کے انتظامات کیے۔ اتنی دیر میں عبدالمالک ڈی ایس پی نے نہ صرف ایک بڑی اچھی اور جاندار پریس ریفلیز بھی لکھ کر فوٹو سٹیٹ کروالی تھی بلکہ وہ ان تمام لڑکیوں خصوصاً جیلانی کی اس خوبصورت بیٹی کے بارے میں بھی طے کر چکا تھا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے اس نے ان تمام لڑکیوں کے گھروں پر فون کر کے خود ان کے لواحقین کو اطلاع کر دی تھی۔ سوائے اسی ایک کے جسے اس نے حسین محمد کے ساتھ اپنی گاڑی پر اپنے گھر بھجوا دیا تھا۔ کیوں؟

اس کیوں کا جواب سوچنے کی ابھی اس کے پاس فرصت نہ تھی۔

البتہ شیخ ریاض اور اس کی خوش دامن بیگم اے ڈی دونوں اس وقت پریس کانفرنس میں پولیس کے زیر حراست موجود تھے۔ بیگم اے ڈی (عرف اللہ دتہ) کا چہرہ سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ تو اس مکروہ عورت کا چہرہ سارے زمانے کو دکھانا چاہتا تھا۔ تاکہ لوگ دیکھ لیں دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کو ورغلا کر بے راہ رو کرنے والی عورت کا اصل روپ کتنا بھیانک ہے۔ مگر کچھ محکمے کے اصول وضوابط تھے جن کی وجہ سے اسے وہ غلیظ چہرہ بہرحال چھپانا پڑا تھا۔ افسوس ناک بات یہ بھی تھی کہ جب سے وہ بیگم اے ڈی کے گیسٹ ہاؤس پر یہ آپریشن کلین اپ کر کے آیا تھا۔ بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے فون پر فون آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ بہت سے سیاسی عہدیداران کے فون بھی آ چکے تھے جو اس ''چھاپے'' کو گول کر دینے پر زور

دے رہے تھے۔ بہت سوں کے تو اپنے بیٹے اور بیٹیاں رنگے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اس لیے وہ اس چھاپے کو صیغہ راز میں رکھنے پر بضد تھے اور بہت سے بیگم اے ڈی کو اس سارے معاملے سے صاف نکال دینے پر زور دے رہے تھے۔ بلکہ عبدالمالک کو دھمکیاں تک مل چکی تھیں کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی سزا اس کو بھگتنا پڑے گی۔ مگر وہ دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں تھا اس لیے اس نے یہ پریس کانفرنس فوراً ہی رکھ لی تھی۔



رات کے ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے اور وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ عمیس جیلانی کا مارے غصے اور پریشانی سے بُرا حال تھا۔ وہ کبھی کسی کو فون کرتے۔ کبھی کسی کو...... اور پھر آ کر بار بار ترنم بیگم سے اُلجھنے لگتے۔

''میں پوچھتا ہوں آخر تم کرتی کیا رہتی ہو سارا دن گھر میں...... تم سے...... تم سے اپنی اولاد نہیں سنبھالی جاتی؟'' وہ ترنم بیگم پر گرج رہے تھے۔ وہ خود رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔

''مجھے تو وہ کالج سے اپنی کسی ٹیچر سے ملنے کا کہہ کر گئی تھی۔'' وہ دبی دبی آواز میں بتا رہی تھیں۔

''کب گئی تھی؟ کتنے بجے؟'' وہ انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

''یہی صبح کے کوئی دس بجے ہوں گے؟'' ان کی مریل سی آواز بمشکل نکلی۔

''کس کے ساتھ گئی تھی؟'' وہ سوال پہ سوال کیے جا رہے تھے۔

''وہ رامین کے ساتھ......'' وہی آواز پھر نکلی۔

''لیکن رامین تو اپنے گھر پہ ہے۔ کہہ رہی ہے کہ وہ کالج سے اکٹھی واپس آ گئی تھیں وہ اپنے گھر چلی گئی اور یہ اپنے گھر کی طرف آئی تھی۔''

وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کڑی سے کڑی جوڑ رہے تھے۔

''تو پھر آخر یہ کہاں چلی گئی؟ اور تم نے...... تم نے اسے بخشو بابا کے بغیر جانے کیوں دیا؟'' وہ ڈرائیور کے بغیر اس کے جانے پر سیخ پا تھے۔

''عمیس! میں نے آپ کو بتایا تو ہے وہ دونوں گاڑی پر بخشو بابا کے ساتھ ہی یہاں سے گئی تھیں مگر انہوں نے خود ہی بخشو بابا کو واپس بھیج دیا تھا یہ کہہ کر کہ انہیں ابھی کچھ کام ہے اور وہ خود ہی جائیں گی۔''

ترنم بیگم نے ڈرتے ڈرتے وہی تفصیل پھر بتا دی جو انہوں نے کچھ دیر پہلے عمیس کو بتائی تھی۔

''بحث مت کیا کرو۔ ایک تو تم خود کو بہت عقلمند سمجھتی ہو۔''

وہ خواہ مخواہ ہی ان پر برس رہے تھے۔ سارا الزام ان پر دھر رہے تھے۔ آج تو انہوں نے ترنم کو ایک انتہائی غیر ذمہ دار ماں اور لاپروا عورت تک کا خطاب دے دیا تھا جس نے اپنے بچوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور ان کی تربیت کرنے میں وہ بُری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

''دیکھ لیا...... دیکھ لیا انجام اپنے بے جا لاڈ پیار اور دی ہوئی آزادی کا؟'' وہ اپنا کیا کام بھی ان کے سر منڈھ رہے تھے کیونکہ یہی بات تو ترنم بیگم ہر وقت ان سے کہتی تھیں کہ بیٹی کو اتنا آزاد خیال مت بناؤ۔ مگر تب تو وہ بڑا سینہ پھلا کر کہتے تھے۔ ''زائرہ میری بیٹی نہیں میرا بیٹا ہے۔'' اور آج وہ انہیں موردِ الزام ٹھہرائے جا رہے تھے۔

''کہاں رہ گئی وہ...... رات کے بارہ بجنے کو ہیں۔ پوچھو...... پوچھو اس کی اور سہیلیوں سے پوچھو...... فون کرو۔''

وہ اپنا موبائل سیٹ بیوی کی طرف پھینکتے ہوئے بولے۔ وہ تو یوں پیش آ رہے تھے جیسے انہیں مار ہی ڈالیں گے۔

''رات کے بارہ بجے تک وہ کس سہیلی کے گھر بیٹھی ہو گی بھلا؟''

ترنم بیگم اپنے کٹتے ہوئے کلیجے کو تھام کے بولیں۔ وہ رو رہی تھیں۔

''ہائے کسی نے میری بچی کو اغوا نہ کر لیا ہو؟''

''اغوا......'' کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے عمیس جیلانی کے منہ سے بھی اچانک نکلا اور ان کا دماغ اس نقطے پر جم کر رہ گیا۔

''اغوا...... اغوا...... میری بیٹی! میری زائرہ کا اغوا......'' ان کا بیٹی پر تلملاتا غصہ کرتا ذہن اس کی ہمدردی سے پھر لبریز ہو گیا۔ ان کا دل جیسے ساکت ہونے لگا۔ اور جسم کا رواں رواں مارے خوف کے کھڑا ہو گیا یہ لفظ ہی ایسا تھا جسے لیتے ہی زبان اکڑنے لگتی تھی اور اس کی سنگینی نس نس کو تہس نہس کر ڈالتی تھی۔ ان کے وجود کا ریشہ ریشہ درد کرنے لگا۔

''میری بچی!'' بے ساختہ ان کی سسکی نکل گئی۔

''اگر مجھے تم نہ ملیں تو یاد رکھنا میں تمہیں اُٹھا کر لے جاؤں گا۔ اگر تم میری نہ بن سکیں تو میں تمہیں کسی اور کا بھی نہ ہونے دوں گا۔''

عمیس جیلانی کے خیال پر یہ الفاظ تازیانہ بن کر پڑے۔

''میں سمجھ گیا یہ کس کا کام ہے؟ میں...... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔''

وہ اپنا مکہ ہوا میں لہراتے ہوئے انتہائی غصے میں پھنکارتے ہوئے ''جیلانی ہاؤس'' کے

مین گیٹ کی طرف چل دیئے۔ دیوار کے اس پار جہاں کے مکین اس نئے آنے والے طوفان سے بے خبر سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں میں لیٹ چکے تھے۔



"عبدل! بیٹا یہ لڑکی کون ہے اور تم نے اسے گھر کیوں بھیجا تھا۔"

"عبدالمالک" کے واپس گھر آتے ہی اس کی والدہ صاحبہ نے سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی عبدالمالک نے سیالکوٹ سے اپنی فیملی کو لاہور شفٹ کر لیا تھا اب اس کے پاس رہنے کے لیے سرکاری گھر موجود تھا اور پھر اس کی فیملی میں تھا کون ایک بہن جو اس سے بڑی تھی اور شادی شدہ تھی لہٰذا اب وہ اس کے بابا اور پیاری امی جان ہی تو تھے۔

"بتاتا ہوں امی جان!" اس نے اپنی کیپ اُتار کے سامنے ڈرائنگ ٹیبل کے کونے پر اٹکائی جہاں وہ ہمیشہ اٹکایا کرتا تھا اور اپنی ماں کو دونوں کندھوں سے تھام کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگا۔

"بتاؤ ناں آخر ماجرا کیا ہے؟" ان کا دل تب سے عجیب وسوسوں کا شکار تھا جب سے وہ لڑکی گھر آئی تھی۔ اب ان سے اور صبر نہ ہو رہا تھا۔

"پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے آج ڈنر میں کیا بنایا ہے۔ سچ سخت بھوک لگی ہے۔"

وہ ماں کو اپنے ساتھ لگائے لگائے اپنے گھر کے بڑے سے کچن میں لے آیا۔

"عبدل بیٹا! تم جانتے ہو ناں میرا جی بہت کمزور ہے۔ پہلے بتاؤ ماجرا کیا ہے یہ لڑکی کون ہے اور تم اسے گھر کیوں لائے؟"

وہ بیٹے کے لیے کھانا گرم کرتے کرتے پوچھ رہی تھیں۔

اس نے اپنے لیے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور کھانے کے برتن کچن میں رکھی اس چھوٹی میز پر رکھے جہاں وہ تینوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔

"امی جان! وہ ایک بے حد شریف اور اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔"

عبدالمالک نے ماں کا گرم کیا ہوا سالن پلیٹ میں نکالتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

"وہ تو دیکھنے میں ہی نظر آ رہی ہے۔ مگر یہ تھانے میں؟" انہوں نے "تھانے" کا نام لیتے ہوئے بڑی جھجک کے ساتھ اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ دراصل شبیر حسین کانسٹیبل جب اسے گھر چھوڑ کر گیا تو ماں جی کو ساری تفصیل بتا گیا تھا ویسے اس کے پیٹ میں کم ہی کوئی بات رہتی تھی لیکن عبدالمالک کی ماں جی کی محبت نے تو اسے اپنا ہی بیٹا بنا لیا تھا اس لیے وہ اب اس گھر کا فرد ہی تھا۔ ہر بات ماں جی سے کرلیا کرلیا کرتا تھا۔

"میرا مطلب ہے تھانے کے معاملات تھانے میں ہی نمٹایا کرو۔ گھر میں کیوں؟ میں تو اس وقت سے اس فکر میں ہولتی رہی کہ کہیں رابعہ اپنے شوہر کے ساتھ آ جاتی تو بھلا میں داماد کو کس طرح مطمئن کرتی کہ یہ لڑکی گھر کیوں آئی ہے؟" وہ سادہ لوح خاتون تھیں واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔ انہیں اپنے داماد اور بیٹی سے اب بہت سی باتوں کا پردہ رکھنا پڑتا تھا۔

"امی جان! آج آپ نے کوفتے بہت لذیذ بنائے ہیں۔" عبدالمالک نے اپنی امی جان کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کو کہا۔

"ہاں...... تمہارے بابا بھی کہہ رہے تھے لیکن سنو بیٹا! اب میں تھک گئی ہوں بہتر ہے تم شادی کر لو۔ ورنہ میں تو اس بار گاؤں گئی تو تمہاری پھپھو سے رشتہ مانگ لوں گی۔" انہوں نے چائے کپ میں انڈیل کر اس کے سامنے کرتے ہوئے گویا دھمکی دی۔

"پھپھو امیراں کی بیٹی سے...... رحم کریں امی جان!" وہ اپنی بڑی پھپھو کی اس بیٹی سے جو گریجویٹ تو تھی مگر اتنی صحت منداور قد آور تھی کہ کہیں سے بھی لڑکی نہ لگتی تھی سے بے حد چڑتا تھا۔ مگر امیراں پھپھو کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ان کا ہی داماد بنے۔

"تو پھر تم کر لو لڑکی پسند ورنہ....." وہ بیٹے کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر مسکراتی ہوئی پھر دھمکانے لگیں۔

"اچھا...... اچھا میری پیاری امی جان!" وہ ماں کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈالتا ہوا بولا۔ وہ چائے کا کپ اُٹھا کر ماں کا ہاتھ تھامے انہیں اپنے کمرے میں لے آیا جہاں وہ لڑکی ایک کونے میں بیٹھی اپنا چہرہ گھٹنوں میں دیئے یقیناً رو رہی تھی۔ "امی جان! آپ پوچھ رہی تھیں ناں کہ یہ لڑکی کون ہے؟" وہ ایک دم سے اپنے افسرانہ لہجے میں آ گیا۔ سپاٹ اور سخت لہجہ۔

"یہ لڑکی جیلانی گھی اینڈ آئل ملز المعروف ستارہ ملز" والوں کی بیٹی ہے۔ ان کے کسی بیٹے یا بیٹی کی اولاد ہے میں نہیں جانتا۔" اس نے چائے کے سپ لیتے ہوئے ماں کو بتانے سے زیادہ اسے سنانے والے انداز میں کہا۔ "یہ اپنے گھر سے اس گیسٹ ہاؤس تک کیسے آئی؟ یہ تو اسی کو علم ہو گا۔ مگر اب یہ جب تھانے سے واپس اپنے گھر جائے گی تو اسے معلوم ہی نہیں اس کے گھر والوں پر کیا قیامت گزرے گی۔ اس کے گھر سے گیسٹ ہاؤس تک اُٹھتے قدموں تلے اس کے باپ کی عزت کس طرح کچلی جا چکی ہے۔ کاش یہ جان سکتی۔" اس نے پھر سے ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالی جس کا نازک سا جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

"اب اس کے عمر بھر کے آنسو بھی اس کے کردار اور باپ کی عزت پر لگی سیاہی نہیں دھو

سکتے۔‘‘ اس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

’’وہ تو یہ شکر کرے کہ میں نے اسے زید کے ساتھ دیکھا تھا اس روز اور اسی پہچان کے باعث یہ بچ گئی۔ ورنہ یہ اب یہاں نہ ہوتی بلکہ وہیں پر تھانے میں میڈیا کے کیمروں اور تیکھے سوالات کی زد میں ہوتی اور پھر...... پھر حدود کیس میں اندر ہو جاتی۔‘‘

اس نے اس جھٹکے کھاتے وجود کے قریب کھڑے ہو کر اور بھی سخت آواز میں کہا۔

’’چلیں امی جان! چادر اوڑھ لیں اور اسے بھی کہیں اُٹھے۔‘‘ وہ نفرت سے اپنے پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ کہتا ہوا۔

’’اس سے پہلے کہ رات ڈھلنے لگے اس کا اپنے گھر میں پہنچنا ضروری ہے۔ ویسے بھی اس کے گھر والوں پر جانے کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ صبح کی سپیدی سے پہلے پہلے وہ اس کالک کو کہیں چھپالیں تو شاید ان کی عزت کا بھرم دنیا میں تو رہ جائے گا۔‘‘



’’کہاں ہے طرم خان! نکالیں اسے...... میں اس کی بدمعاشی نکالتا ہوں۔‘‘ جیلانی ہاؤس کے ہال کمرے میں عمیس جیلانی کی گرجدار آواز اس کے مکینوں پر ایک مشترکہ الزام بنی ہوئی ان کے گریبان جھنجھوڑ رہی تھی اور وہ سارے کے سارے اس کے بوجھ تلے گردنیں لٹکائے کھڑے تھے۔

نور محمد جیلانی اور طاہرہ بیگم کی تو واقعی کمریں ٹوٹ گئی تھیں یہ سنتے ہی کہ زائرہ گھر پر نہیں ہے۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے اور جوان لڑکی گھر سے باہر جانے کہاں تھی؟ یہ سوال کالے پھنیر کی طرح ان کے سینوں پر بیٹھ گیا تھا۔ ’’میں کہتا ہوں پتہ کریں اس ذلیل کا کہ وہ کہاں لے گیا ہے میری بچی کو۔‘‘ عمیس جیلانی بڑے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں کھڑا تھا جیسے ابھی ان کا گریبان تھام لے گا۔

’’عمیس! وہ کہاں ہے؟ مجھے سچ میں کچھ خبر نہیں۔ میں نے تو اس دن کے بعد سے نہ اس کی شکل دیکھی یا اس کا ذکر ہی میرے گھر میں ہوا۔‘‘

انیس میاں نے پھر بھی نرمی سے بھائی کو جواب دیا۔

’’بس کریں...... یہ ڈھونگ ڈھکوسلے۔ کسی کو خبر نہیں۔ پوچھیں۔ پوچھیں...... پوچھیں اس کی ماں سے پوچھیں۔ انہیں تو سب خبر ہوگی کہ ان کا جنا کہاں گل کھلا رہا ہے۔‘‘ عمیس جیلانی غصے میں انتہائی گھٹیا زبان پر اُتر آیا تھا۔

’’بھائی جی! قسم لے لیں خدا تعالیٰ کی کہ مجھے نہیں پتہ وہ کہاں ہے؟‘‘

تکلم بیگم اپنا یقین دلانے کو ہاتھ باندھ کے قسمیں کھانے لگیں۔

’’باپ کو خبر نہیں۔ ماں کو پتہ نہیں۔ دادا کا لاڈلا ان کا جگر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہاں غائب ہو گیا۔ ابھی بھی علم نہیں۔ کاش...... کاش اس روز میری بچی کی بات کا یقین کر کے اسے سزا دی ہوتی تو وہ آج وہ اپنا کہا سچ نہ کر دکھاتا۔‘‘

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالیں۔ کمرے میں گھومتے گھومتے ان کی نظر ستارہ پر پڑ گئی۔

’’اس سے...... اس سے پوچھو...... اسے لازمی پتہ ہوگا۔ اس کا تو وہ سایہ تھا۔ اسے ہر بات کا علم ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ سب جانتی ہے۔‘‘

وہ فوراً ہی ستارہ پر انگلی اُٹھانے لگے۔ جس کے ساتھ ہی احمد کی نظریں بھی ستارہ پر گڑ گئیں شک سے بھری نظریں جن میں پچھلے کچھ دنوں سے یہ شک کچھ پھیکا پڑنا شروع تو ہوا تھا۔ وہ اپنے دماغ کو ستارہ کے بے خطاء ماننے پر مائل کر رہا تھا۔ لیکن آج پھر یوں اچانک ستارہ کا وجود مشکوک ہو گیا تھا۔

’’مم...... مم...... میں؟‘‘ وہ گھبرا کر منمنانے لگی۔ عمیس جیلانی کی انگلی اس کی طرف اُٹھتے ہی باقی سب گھر والوں کی سوال کرتی نگاہیں بھی اس پر جم چکی تھیں۔

’’ستارہ! ادھر آؤ بیٹی!‘‘ نور محمد صاحب کی بڑی کمزور اور نحیف سی آواز نے اسے پکارا۔

’’جی نانا جان!‘‘ وہ لپک کر اپنے نانا جان کے پاس پہنچ گئی۔

’’میری بیٹی!‘‘ انہوں نے ستارہ کے دونوں ہاتھ تھام کے اسے بڑی ہی لجاجت سے دیکھا جس پر اس کا دل پانی پانی ہو گیا۔

’’میری بیٹی کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور اب تو گھر کی عزت کا سوال ہے۔ اگر تمہیں کچھ خبر ہے تو بتا دو اسے؟‘‘ بڑے میاں جی کی ڈبڈباتی آنکھوں نے اتنی عاجزی سے اس کی منت کی کہ وہ تڑپ گئی۔

’’جی نانا جان!‘‘ اس نے سر جھکا کر کہا۔ جس پر احمد حسن نے سب سے پہلے اس کی طرف سے اپنا منہ پھیرا اور پھر باقی سب نے بھی آہستہ آہستہ۔

’’دیکھا...... دیکھا ناں...... دیکھ لیں۔ چور آپ کے گھر میں ہی موجود ہے۔ ساری آنکھ مچولیاں کھلی آنکھوں سے چل رہی ہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں اور سب انجان بنتے ہیں۔‘‘ عمیس جیلانی کی زبان پھر نشتر چلانے لگی۔ میاں جی نے شدت غم سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

وہ اپنے اعتماد کا بہتا ہوا لہو دیکھنے کی تاب اب نہ رکھتے تھے۔

اتنے میں ستارہ کمرے سے اپنا موبائل لے آئی تھی۔ وہ زید کا نمبر عمیس کو دینے لگی تو وہ غرا کر بولے۔

"مجھے اس مردود سے کچھ بات نہیں کرنی۔ تمہارا ہی کچھ لگتا ہے اسے کہو میری بچی کو شرافت سے گھر چھوڑ جائے ورنہ...... ورنہ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"ماموں جان! وہ تو لاہور میں ہے ہی نہیں وہ تو کراچی ہے زائرہ کو وہ......"

"اب تو اس کی اور حمایت مت کرو۔ جب تمہیں اتنی خبر ہے کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا نیا موبائل نمبر تمہارے پاس ہے جو اور کسی کے پاس بھی نہیں ہے تو فار گاڈ سیک ستارہ! اب بس بھی کر دو اور کہو اسے جو چچا کہہ رہے ہیں۔"

احمد حسن نے اپنے لہجے میں زمانے بھر کی اجنبیت اور بیگانگی بھرتے ہوئے اسے ڈانٹنے والے انداز میں کہا اور سارے گھر والوں کے سامنے پھر بے عزت کر دیا جس پر اس نے بڑی بے بسی سے ایک زخمی نگاہ اس پر ڈالی اور زید کا نمبر ملانے لگی۔

"آپی! آپ...... خیریت تو ہے؟" دوسری بیل پر اس نے فون اُٹھا لیا تھا۔

"آپی مت کہو مجھے...... آپی کہتے تو کیا ایسے کرتے تم؟" وہ غم و غصے کی حالت میں تھی اب تو اسے بھی لگ رہا تھا کہ زید نے ہی زائرہ کے ساتھ۔ چھی چھی چھی اسے یہ سوچتے ہوئے بھی گھن آ رہی تھی۔

"میں نے کیا کیا آپی؟" وہ ستارہ کا ایسا لہجہ سن کر پریشان ہو گیا۔

"زائرہ کہاں ہے؟ اور تم نے ایسی گری ہوئی حرکت کی بھی کیسے؟" اس کی آواز مارے غیرت کے کانپ رہی تھی۔

"زائرہ کہاں ہے؟ کیا مطلب؟" وہ واقعی کچھ نہ سمجھ رہا تھا۔

"ادھر مجھے دو...... ایسی گول مول باتیں کر کے ہماری آنکھوں میں مزید دھول مت جھونکو۔" احمد حسن سے شاید برداشت نہ ہوا اس نے آگے بڑھ کر موبائل ستارہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جس پر وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے روتی ہوئی اپنی نانو کے پیچھے آ بیٹھی۔

"نانو آپ کی قسم میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کر کے شرمندگی کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

طاہرہ بیگم کے اک دوجے پر سختی سے جمے ہونٹوں سے سوائے ایک سسکی کے کچھ نہ نکلا انہوں نے ستارہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً زائرہ کو لے آؤ۔ ورنہ میں جا رہا ہوں تمہارے خلاف

اغوا کا پرچہ کروانے۔ ساری آوارگی دو منٹ میں نکل جائے گی۔" احمد نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ زائرہ...... اغوا...... میں......"

زائرہ کے اغوا کا خود پر الزام سن کر اسے اتنا دھچکا نہ لگا تھا جتنا اسے زائرہ کے گھر سے غائب ہونے کا سن کر۔ وہ تو چکرا کر رہ گیا۔ آخر کو وہی ہو گیا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔

"کہاں...... کہاں گئی زائرہ؟" الٹا وہ پوچھنے لگا۔

"بکواس مت کرو اور فوراً آ جاؤ۔"

"مگر بھائی جان! میں تو کراچی میں ہوں۔ میرا یقین کریں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں میرا اعتبار کریں میں پچھلے ایک ہفتے سے کراچی میں ہوں۔" وہ قسمیں کھا کھا کر اپنا یقین دلا رہا تھا۔ مگر اب وہاں کوئی بھی اس کا یقین کرنے والا نہ تھا۔ کسی کو اس پر اعتبار نہ تھا۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔ میں پولیس سٹیشن فون کرتا ہوں۔" احمد نے جھلا کر فون بند کر دیا۔

"وہ ایسے نہیں مانے گا۔ ایف آئی آر کٹوانی ہی پڑے گی۔"

موبائل فون کو غصے سے صوفے پر پٹختے ہوئے وہ عمیس جیلانی کی طرف بڑھا۔

"رُکو...... احمد!" نور محمد صاحب بمشکل اپنے شل ہوئے جسم کو اُٹھا کر بولے۔

"اس گھر کی عزت کی فکر کرو۔ تھانے کچہریوں میں رولو گے اسے مجھے کیا جیتے جی مارنے کا ارادہ ہے تمہارا؟"

وہ انہیں واقعے کی سنگینی کے ساتھ ساتھ خاندان کی عزت کا احساس بھی دلانا چاہتے تھے۔

"اب کون سی عزت رہ گئی ہے خاندان کی...... مجھے اپنی بچی کی فکر ہے وہ جنونی کہیں اس کی عزت یا جان......"

عمیس جیلانی نے بڑی حقارت سے تکلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... نہیں میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔"

وہ تڑپ ہی تو اُٹھیں۔

"بس کریں امی جان! آپ ہی لوگوں کے لاڈ پیار نے تو اسے اس حال تک پہنچایا ہے۔"

احمد نے ماں کو بھی شک کی لپیٹ میں لے کر الزام کی گرہ سے باندھ دیا جس پر انہوں نے اپنی صفائی دینے کو منہ کھولا تو ساتھ کھڑے اسیس نے انہیں آنکھ سے گھرک کر چپ رہنے کو کہا۔

"مجھے بات کرنے دو اس سے......" میاں جی نے ستارہ کا موبائل اُٹھا کر زید کا نمبر ری ڈائل کر لیا۔

"زید! میری بات کان کھول کے سنو اور خبردار اگر تم نے کوئی جواب دیا یا کوئی حجت کی......"

انہوں نے زید کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بات شروع کی۔ اپنے بے حد پیارے دادا جان کی آواز سنتے ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ جو اتنے دنوں سے اس آواز کو سننے کے لیے مچل رہا تھا۔ اُداسی نے جسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جسے اپنوں سے بے پناہ محبت تھی۔

وہ جو اپنے دادا کا پوتا ہی نہیں بلکہ دوست تھا۔ یار...... جگر تھا۔

"میاں جی!" وہ بے اختیار سسکنے لگا۔

"آپ کی قسم ہے میاں جی! آپ کا جگر ایسا نہیں ہے۔"

"میں نے کہا ناں بکواس مت کرو۔" وہ اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے پھر غصے سے بولے۔

"تم فوراً گھر واپس آؤ۔ ورنہ میں آتا ہوں۔ میں خود تمہیں زندہ گاڑ دوں گا مجھے کسی پولیس کسی رپٹ کی ضرورت نہیں۔ سمجھے تم......" انہوں نے اتنی زور سے کہا کہ اس کمرے کے درودیوار کے ساتھ ساتھ خود ان کا وجود بھی ہل کر رہ گیا۔ وہ چکرائے اور پھر سنبھل نہ سکے۔

"ابا جان!" ایک ساتھ کئی آوازیں اور کئی ہاتھ ان کی طرف بڑھے اور اسیس جیلانی نے انہیں سہارا دے لیا ورنہ وہ فرش پر آ رہتے۔

"آپ مت غصہ کریں۔ خود کو سنبھالیں۔"

طاہرہ بیگم فوراً آ کر ان پر جھک گئیں اسیس نے انہیں قریبی صوفے پر لٹا دیا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے...... جن کی عزت کے جنازے نکل جائیں۔ پھر ان کے جسموں کو بھی مر جانا چاہیے۔" وہ دُکھ اور برداشت کے درمیان اب مزید کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان اڑھائی تین مہینوں میں ملنے والی پریشانیوں اور دُکھوں نے ان کی قوتِ برداشت کو بھی شل کر دیا تھا کہ اب وہ ڈھے ہی گئے تھے۔

"طاہرہ! میرے بچے بکھر گئے۔ میرا آشیانہ تنکا تنکا ہو گیا۔" وہ طاہرہ بیگم کا ہاتھ تھام

کے ایک بچے کی طرح رو دیئے۔

"میاں صاحب! ہمت کریں۔" وہ بھی انہیں سنبھالتے ہوئے خود بکھر رہی تھیں۔

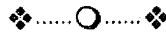
"میری محبت...... میری تربیت...... میرے ہی لہو نے خاک کر دی۔ ہائے...... ہائے مجھے میرے ہی "جگر" نے کاٹ ڈالا۔"

اب وہ بھی زید کو ہی مجرم سمجھ رہے تھے اور یہ دُکھ ان سے اُٹھایا نہ جا رہا تھا۔

"جاؤ عمیس! جا کر ایف آئی آر کٹوا دو۔ میری زائرہ کو تو بچاؤ اس پر تو ابلیس سوار ہے جانے وہ کیا کر ڈالے۔"

نور محمد جیلانی نے تکیے میں اپنا منہ چھپاتے ہوئے عمیس کو پولیس سٹیشن جانے کی اجازت دے ہی دی۔

"احمد! آؤ تم میرے ساتھ......" عمیس تو اس کے انتظار میں تھے بے قراری سے احمد کا ہاتھ کھینچتے ہوئے باہر کی طرف چل دیئے۔



ابھی وہ ہال کمرے سے باہر برآمدے میں ہی آئے تھے جب چوکیدار فضل بابا تیزی سے اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔

"السلام علیکم عمیس میاں!" اس نے تابعداری سے سلام کیا جس کا جواب اس وقت عمیس نے دینا مناسب نہ سمجھا اس وقت تو ان کے دماغ پر صرف اور صرف "زید" کو زندہ گاڑ دینے کا بھوت سوار تھا۔

"وہ جی باہر کوئی بڑے میاں صاحب سے ملنے آیا ہے کہتا ہے ڈی ایس پی ہوں جا کر اندر خبر کرو۔"

فضل بابا نے خود ہی بتا دیا کہ وہ اندر کیوں آ رہا تھا کیونکہ وہ تو ڈی ایس پی کا نام سن کر ہی کانپنے لگا تھا۔

"ڈی ایس پی۔" احمد اور عمیس دونوں کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"ج...... جی...... ی" فضل بابا نے ہکلاتے ہوئے سر ہلایا۔

"اندر بلاؤ انہیں۔ جلدی کرو گیٹ کھولو۔"

دونوں ہی کے حواس جاتے رہے۔ دونوں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ دونوں خود گیٹ پر جائیں۔ یہ سوچ کر ہی ان کے پیر پتھر ہونے لگے وہ خود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے واپس ہال میں چلے گئے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" تکلم اور ترنم دونوں ہی انہیں واپس آتا دیکھ کر ان کی طرف بھاگیں۔

"پولیس آئی ہے۔" احمد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"پولیس! میرے گھر.....اس وقت۔"

نور محمد پھر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی چھٹی حس کرنٹ کی طرح ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑی۔ ذلت کا احساس ان کے روئیں روئیں کو کھڑا کر گیا۔

"تم سب لوگ اندر جاؤ۔"

انہوں نے گھر کی خواتین کو اندر جانے کو کہا۔ جس پر وہ فوراً اندر چلی گئیں۔ "اجازت ہے سر!"

کسی نے دروازے پر دستک دینے کے انداز میں ٹھک ٹھک کر کے اجازت طلب کی۔

"کک.....کون.....آیئے۔"

میاں صاحب دروازے پر کھڑے ایک نوجوان کو دیکھ کر خود آگے بڑھے اور نوجوان ان کی طرف بڑھا۔

"السلام علیکم!" آنے والے نے بڑے ادب واحترام سے سلام کر کے ان سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی اپنا تعارف بھی کروا دیا۔

"ڈی ایس پی عبدالمالک!"

"آؤ.....آؤ بیٹا!" وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے اسے صوفے کی طرف لے گئے۔

"جی میں زید اسیس جیلانی کا دوست ہوں۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"زید کا دوست!" عمیس اور احمد دونوں کے ماتھوں پر ناگواری کی لکیریں اُبھریں۔

"اس کا مطلب ہے اس نے اپنا سارا انتظام پہلے سے کر لیا ہے مگر میں تو اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

عمیس تلملاتے ہوئے عبدالمالک کی طرف بڑھے۔

"جی میں سمجھا نہیں۔" عبدالمالک حیرانی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں ہے وہ خبیث مردود؟" عمیس بلا سوچے سمجھے گھر آئے مہمان جو ایک پولیس افسر بھی تھا پر چڑھ دوڑے۔

"جی.....جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ اپنی جگہ حیران ہی تھا۔

"زید کہاں ہے؟ اور میری بیٹی.....میری بیٹی.....کیا کیا اس نے میری بیٹی کے

ساتھ.....بولو.....بولو.....تم اس کی کیا حمایت کرنے آئے ہو۔ دھمکیاں دینے آئے ہو ہمیں.....یا اس کی قبل از وقت ضمانت کے کاغذ دکھانے آئے ہو؟"

عمیس کے سر پر اس وقت وحشت سوار تھی۔ وہ عبدالمالک کو کھا جانے والے انداز میں گھور رہے تھے۔

"دیکھیں سر! آپ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ میں تو یہاں آپ کی عزت بچا کر لایا تھا۔ آپ کی امانت پہنچانے آیا تھا۔"

"امی جان! اندر آجائیں۔" وہ اتنا عجیب رویہ دیکھ کر بُرا منا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کسی کو آواز دی۔

"امی جان!" نور محمد صاحب نے زیرلب دہراتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ایک بڑی سی چادر اوڑھے ایک خاتون اندر داخل ہو رہی تھیں جنہوں نے ایک اور چادر میں لپٹے وجود کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ لگتا تھا وہ کسی بے حد بیمار یا پھر شاید کسی بے ہوش وجود کو گھسیٹ کر لا رہی ہوں۔ خاتون نے اندر آ کر سلام کیا۔

"طاہرہ بیگم کو بلاؤ۔" انہیں دیکھتے ہی نور صاحب نے اسیس کو اشارہ کر کے کہا۔

"آپ تشریف رکھیں۔ آئیں.....یہاں بیٹھیں۔" وہ ان خاتون کو بیٹھنے کے لیے بڑی عزت سے کہہ رہے تھے۔

کمرے کا ماحول ایک دم سے بدل چکا تھا۔ عمیس جیلانی کی شعلے اُگلتی زبان تالو سے چپک گئی تھی اور ان کا دل دھڑکنا بھول کے رونا شروع کر چکا تھا اور ہاتھ پاؤں سن ہوتے ہوئے بے جان ہونے کو تھے۔ جانے کیوں حالانکہ ابھی ڈی ایس پی کے منہ سے کچھ بھی بُری خبر نہیں نکلی تھی مگر پھر بھی ان کا اندر کچھ بُرا ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔

"بتائیں امی جان! ہم کیوں آئے ہیں؟"

عبدالمالک نے ان سب کو بڑی ہی سپاٹ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

طاہرہ بیگم کے ساتھ ساتھ ترنم اور تکلم بھی واپس آ چکی تھیں۔ جنہیں اسیس نے ہی آنے کو کہا تھا۔

کمرے میں اس وقت چار عورتیں اور چار مرد موجود تھے اور ایک وہ چادر میں چھپا ہوا "اسرار" جس پر سب کی نظریں مرکوز تھیں اور جس کے کھلنے سے قبل ہی سب کے دل بند ہو چکے تھے۔

❖.....O.....❖

"بتائیں ناں امی جان! دیر ہو رہی ہے۔" وہ واپس جانے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جی...... وہ...... یہ آپ کی بیٹی ہے؟" عبدالمالک کی امی نے ترنم اور تکلم دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا انہیں سمجھ نہ آ رہی تھی کہ جو لڑکی ان کے ساتھ آئی ہے وہ ان میں سے کس کی بیٹی ہے؟ انہوں نے زائرہ کے پتھر ہوئے وجود کو آگے کرنا چاہا۔

"بیٹی......؟" تھرتھر کانپتی ترنم کے منہ سے نکلا ان کی نظریں اس وجود پر جم چکی تھیں جو سیاہ چادر کے اندر چھپا ہونے کے باوجود اپنی پہچان کروا رہا تھا۔

"ز...... ا...... ئرہ...... ہ......" اُن کے لبوں سے الفاظ اور آنکھوں سے اشک ٹوٹے۔

"زائرہ......" عبدالمالک کی والدہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس سے قبل وہ اس لڑکی کا نام نہ جانتی تھیں جو پچھلے کئی گھنٹوں سے اُن کے گھر پر تھی۔

میاں جی کے سمیت وہاں موجود عمیس، انیس اور احمد کی نظریں بھی زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور سب کے منہ میں زبان برف ہو چکی تھی۔

"اسے میں نے ایک بدنام زمانہ "گیسٹ ہاؤس" میں ہونے والے "پولیس ریڈ" میں برآمد کیا ہے جہاں اس جیسی اور بھی تھیں اور وہ آپ ہی جیسے شریفوں کی اولادیں تھیں۔"

نہ چاہنے کے باوجود بھی عبدالمالک اپنی کڑوی زبان کو تالو سے نہ لگا سکا۔ وہ یہ سب نہ چاہتا تھا مگر احمد اور عمیس نے جو بدتمیزی اس کے ساتھ کرنے کی کوشش کی تھی وہ اس سے برداشت نہ ہو سکی تھی۔ پتہ نہیں اسے اس قدر غصہ کیوں آتا تھا۔

"چلیں امی جان!" وہ اپنی ماں کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔ وہ بھی جانے کو اُٹھیں۔

"نہیں جی! آپ بیٹھیں تو سہی۔" تکلم بیگم نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں...... ہاں بیٹی! رُکو...... بیٹھو......" طاہرہ بیگم نے بھی اپنی بہو کی تائید کی۔

"نہیں یہ موقع نہیں ہے۔ پھر کبھی سہی......" انہوں نے نرمی سے تکلم بیگم اور طاہرہ بیگم کو جواب دیا۔

"بیٹا! بیٹھو تو سہی۔" میاں جی کی مری مری آواز نکلی۔

"سوری سر! اس وقت مناسب نہیں لگتا۔" عبدالمالک نے بھی ادب و احترام سے محمد صاحب کو جواب دیا۔

"بیٹا! میں کس منہ سے تمہارے اس احسان کا شکریہ......" ان کی آواز ٹوٹ گئی اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

"یہ میرا کوئی احسان نہیں...... بلکہ فرض تھا اور پھر میں بائے چانس ہی اسے گھر لے آیا

گیا۔" عبدالمالک نے میاں جی کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول کے زائرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اسے میں ایک بار زید کے ساتھ ملا تھا تب وہ اسے کالج سے لے کر آ رہا تھا اور ایک بار......" وہ آگے کہتا کہتا رُک گیا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ ایک بار وہ اسے کسی اور کے ساتھ بھی ملی تھی اور وہ بھی کوئی اچھی پچوئشن نہ تھی۔

"زید میرے کزن کا دوست ہے اور اب میرا بھی...... بڑا ہی اچھا اور مہذب لڑکا ہے۔" اس نے "اچھا اور مہذب" ذرا زور سے اور احمد اور عمیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہے۔ زید کے بارے میں؟" وہ بدستور ان دونوں کو ہی گھور رہا تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ اور ذہین پولیس آفیسر تھا سمجھ گیا تھا یہ دو افراد زید کو لے کر کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

"بس وہ......" ان کی جگہ میاں جی نے مارے شرمندگی کے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"بہرحال کچھ باتیں میں واضح کر جاؤں تو بہتر ہوگا۔" عبدالمالک نے پھر سے بات شروع کی۔

"ایک تو یہ کہ زید پچھلے کئی روز سے کراچی میں ہے اس کا میں خود گواہ ہوں۔ دوسرا آج والے اس پولیس ریڈ کی خبریں کل کے اخبارات میں موجود ہوں گی۔"

"اخبارات میں۔" عبدالمالک کے مزید کچھ کہنے سے پہلے طاہرہ بیگم کے منہ سے نکل گیا۔ ان کا دل اخبارات کا سن کر حلق میں آ گیا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں اس کی کوئی تصویر یا نام ان خبروں میں شامل نہیں ہے۔" عبدالمالک نے ان کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"شکر کریں کہ یہ زید کی بہن تھی۔ ورنہ یقیناً یہ بھی اس خبر کا حصہ ہوتی۔"

اس نے پھر سے زید کا نام لے کر وضاحت کی کہ اگر کچھ ان لوگوں کی عزت کا بھرم بچ گیا ہے تو زید ہی کی وجہ سے بچ گیا ہے۔ ورنہ وہ اس لڑکی کو کیا جانتا تھا۔

"میں تمہارا شکریہ......" اب میاں جی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے اپنی نم آنکھوں سے لگا لیے۔

"نہیں...... نہیں...... آپ ایسے مت کریں۔ بار بار احسان کا لفظ استعمال نہ کریں۔ احسان ہے رب باری تعالیٰ کا جو عزت اور ذلت دینے کا مجاز ہے۔ اسی کو آپ کی نیک نامی منظور تھی۔"

عبدالمالک نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے کہا۔

''چلیں امی جان!'' اس نے ماحول کو بہت دردناک ہوتا دیکھ کر پھر سے اپنی ماں کو یاد کرایا جو تکلم بیگم اور طاہرہ بیگم کے دُکھ کو اپنی تسلی تشفی سے کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''اچھا بی! اب اجازت ہم پھر چکر لگائیں گے۔'' وہ اجازت طلب کرتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''زید آجائے تو اسے میرا اسلام کہیے گا۔ میں اس کا انتظار کروں گا وہ آکر کچھ دفتری اور کاغذی کارروائی مکمل کرنے میں میری مدد کردے اور اگر اس کی جگہ کوئی اور یہ زحمت کرلے تب بھی میرا کام مکمل ہو جائے گا۔'' اس نے جاتے جاتے احمد پر نگاہ جما کر کہا۔

''وہ زید آجائے تو ہم دونوں آجائیں گے۔'' احمد نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ندامت سے چُور ہو کر کہا۔

''جی بہتر...... ویسے آپ زید کے......؟'' وہ ہاتھ ملاتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔'' احمد کی نظریں اور بھی خاک بسر ہو گئیں۔

''اچھا جی...... اللہ حافظ!'' اس نے میاں جی سے مصافحہ کیا۔

''اللہ تجھے خوش آباد رکھے میرے بچے!'' میاں جی نے اسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

''تم تو میرے زید جیسے ہی ہو۔ آتے رہنا۔'' انہوں نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جی...... ضرور...... بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر اپنی ماں کا ہاتھ ادب سے تھام کے انہیں اپنی گاڑی تک لے گیا۔



''وہ ایک زندہ لاش کی طرح سب کے درمیان موجود تھی اور سارے اس کی لاش سے منہ پھیرے بیٹھے تھے۔ کسی کے بھی لبوں پر کوئی آہ وزاری نہ تھی۔ نہ چیخ و پکار...... نہ کوئی بَین...... نہ ہچکیاں...... حالانکہ سب تڑپ تڑپ کے رو رہے تھے...... گرلا رہے تھے...... سسک رہے تھے...... مگر سب بے آواز...... سب گونگے...... سب نے اپنے لبوں کو اپنے دانتوں تلے داب رکھا تھا کہ مبادا کوئی سسکی نہ نکل جائے۔ کوئی ہلکی سی آواز بھی اگر نکل گئی تو اک اور قیامت آجائے گی۔ جو اس کمرے کے دروازے کے باہر بالکل ساتھ ہی لگی کھڑی تھی اور منتظر تھی کہ کوئی آواز...... کوئی لفظ...... کوئی سرگوشی ملے اور وہ اس پورے خانوادے پر ٹوٹ پڑے۔ آج تو باہر ٹھہری ہوا بھی ان کی دشمن تھی اور تاک میں تھی اندر سے کوئی راز چرا کر اسے زمانے بھر

میں پھیلا دے۔ جیلانیوں کی عزت پر آندھی بن کر پڑے اور اسے مٹی مٹی کر دے۔

لیکن کیوں؟

کیونکہ خود اس گھر کی ایک جوان لڑکی کے پیروں کے ساتھ باہر کی مٹی یہاں تک آگئی تھی۔

اس دنیا میں کسی کی بیٹی گھر سے باہر ایک رات کہیں انجان جگہ پر گزار آئے۔ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کاش یہ وہ لڑکیاں جان سکیں جو جذبات میں آکر ایسا کر گزرتی ہیں۔ یہ ایسا گھناؤنا جرم اور عظیم گناہ ہے جس کی سزا صرف ایک مجرم کو نہیں ملتی بلکہ پورا خاندان اس کی عذاب ناکیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس جرم کی سزا تو کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔

''طاہرہ!'' کمرے میں موجود گھمبیر خاموشی میں ایک ننھا سا بھربھرا سا کنکر پڑا۔

''جی!'' ویسی ہی ایک کمزور آواز نے جواب دیا۔

''اسے یہاں سے لے جاؤ۔'' ان کا اشارہ زائرہ کی جانب تھا۔

''میاں جی! یہ میرے گھر نہ جائے۔'' عمیس جیلانی کی کوسوں دور سے آتی آواز سنائی دی۔ جس کے جواب میں کمرے میں کچھ لمحے پھر وہی خوفناک، دردناک چپ ٹھہر گئی۔

''انسان اگر کبھی باہر پڑے گند میں جا پڑے اور اس میں لتھڑ بھی جائے۔ بھلے وہ غلاظت کیسی بھی انتہائی درجے کی ہو۔ بدبودار اور سڑانڈ بھری ہو۔ لیکن پھر بھی......؟'' وہ لفظ لفظ کو بمشکل ادا کرتے ہوئے جیسے تھک سے گئے۔ ذرا رُکے پھر ہمت کر کے گویا ہوئے۔

''تو...... تو انسان اپنا لباس اور اپنے جوتے تو اُتار کے کوڑے کے ڈھیر پر ڈال سکتا ہے مگر اپنے اعضاء جو اس گند سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں تو کاٹ کر پھینکنے کی ہمت نہیں کر سکتا ناں۔ حالانکہ اسے بہت دنوں تک اپنے آپ سے اس گندگی کی بدبو محسوس ہوتی رہتی ہے۔'' وہ پھر ذرا دیر کو رُکے۔ ان کی سانس یوں پھول چکی تھی جیسے وہ میلوں دوڑ کر آئے ہوں۔

''لیکن میں اپنے وہ اعضاء کاٹ دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں جو سڑ چکے ہیں۔''

اچانک ہی عمیس میاں اُٹھے اور انہوں نے پھلوں کی ٹوکری میں پڑی ہوئی چھری اُٹھائی اور کسی کے بھی کچھ سمجھنے سے قبل انہوں نے طاہرہ بیگم کے پیچھے بیٹھی زائرہ کو گھسیٹ لیا۔

''عمیس! عمیس!'' ایک ساتھ کئی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور دروازے کے باہر کان لگائے کھڑی ہوا نے بھی بند دروازے اور کھڑکیوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''چھوڑو...... چھوڑو اسے پاگل ہو گئے ہو۔'' طاہرہ بیگم نے بیٹے کی کلائی تھام لی۔

"آپ ہٹ جائیں بی بی جان! میں اس قصے کو یہیں پر ختم کردوں گا۔" وہ غم وغصے میں پاگل ہو چکے تھے۔

"ہوش سے کام لو ایک تماشہ اور مت کھڑا کرو۔" اسیس میاں نے آگے بڑھ کر وہ چھری عمیس میاں کے ہاتھ سے زبردستی چھینی جسے چھوڑنے پر وہ تیار نہ تھے۔ چھری بے حد تیز دھار تھی زبردستی کرتے وقت اسیس میاں کی انگلی کو زخمی کر گئی۔

"ابا جان!" احمد حسن جواب تک پتھر بنا بیٹھا تھا باپ کی انگلی سے لہو بہتا دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھا اور ان کی انگلی کو دبا کر پکڑ لیا۔ زخم گہرا لگ گیا تھا اس لیے خون رُکنا مشکل ہو گیا۔

ستارہ نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے سے ایک بڑی کترن لی اور اپنے ماموں کی انگلی پر پٹی باندھ دی۔ سب لوگ لمحہ بھر کے لیے زائرہ سے غافل ہو کر اسیس میاں کی طرف لگ گئے تھے اور وہ فرش پر پڑی رو رہی تھی۔

"طاہرہ! اسے اندر لے جاؤ۔" میاں جی نے اس کی طرف اُٹھنے والی اپنی نظر کو فوراً ہی دوسری جانب پھیر لیا۔

"اور ہاں...... اسے سمجھا دینا کہ یہ میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔" نا چاہتے ہوئے بھی ان کے لہجے میں سردی تھی۔ اتنی سردی کہ زائرہ کا دل سینے کے اندر ہی برف ہو گیا۔

"نانو! آپ بیٹھیں۔ اسے میں لے جاتی ہوں۔" ستارہ نے آگے بڑھ کر اسے فرش سے اُٹھایا اس کے سر پر چادر ڈھانپی اور اپنا سہارا دے کر وہاں سے لے گئی۔



کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سب اک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے اور بات کرنے سے کترا رہے تھے۔ کمرے میں اگر کوئی آواز اس وقت نمایاں تھی تو وہ ترنم بیگم کے سسکنے کی تھی جسے وہ دبانے میں بالآخر ناکام ہو گئی تھیں۔

"اب رات بہت گہری ہو چکی ہے سب جاؤ اپنے اپنے کمروں میں۔"

میاں جی کی ہی آواز نے خاموشی کا پردہ پھر چاک کیا۔

"اور سنو! کسی نے کچھ نہیں دیکھا اور یہاں پر کچھ نہیں ہوا۔ خبردار! خاندان کے کسی اور فرد تک یہ بات نہ پہنچے۔" انہوں نے کمرے میں موجود لوگوں پر ایک کڑی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کسی کا مطلب ہے ہم لوگوں کے علاوہ کسی سے بھی نہیں۔ بلکہ کچھ روز کے لیے تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں۔" انہوں نے مزید تنبیہ کی۔

"لیکن ہم اس کالک کو کیسے چھپا سکتے ہیں اور کب تک؟"

یہ عمیس میاں کی نفرت سے بھری ہوئی آواز تھی۔

"اگر خدانخواستہ کسی کی بدنصیبی سیاہی بن ہی جائے تو پہلے اسے دھونے کا جتن کرتے ہیں۔ مگر دھونے سے قبل سوچنا چاہیے کہ اسے کس طرح دھونا چاہیے۔ ورنہ بے صبری اور کم عقلی سے ایسے داغ صاف ہونے کی بجائے پھیل جایا کرتے ہیں۔"

انہوں نے عمیس میاں کو ڈانٹا۔

"جاؤ اور ہمیں سوچنے دو۔ ابھی تو ہم اس ناگہانی کو سہارنے کی بھی قوت نہیں پا رہے۔"

وہ اپنے سینے میں اُٹھنے والے شدید درد کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے صوفے پر ڈھے سے گئے۔

"میاں صاحب!"

"میاں جی"

"دادا جان!" ایک ساتھ کئی ہاتھ ان کی طرف لپکے کیونکہ وہ پسینے میں شرابور ہوئے پیلے زرد ہو چکے تھے۔



"کیسے شریف اور اچھے لوگ تھے۔ مجھے تو ان پر ترس آ ر پاروں پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی اچانک ہی......" عبدالمالک کی گاڑی جیلانی ہاؤس سے نکلی تو کچھ دور جا کر اس کی والدہ نے بات شروع کی۔

"جی امی جان!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آہ...... بے چارے ماں باپ، انہیں کیا خبر ہوتی ہے کہ آنے والے وقت میں ان کی اولاد کی طرف سے انہیں کیا آزمائش ملنے والی ہے۔" وہ بے حد غمزدہ ہو رہی تھیں۔

"اسی لیے تو بندہ دعا کرتا ہے کہ اللہ بیٹیاں دے تو نیک نصیب والی دے ورنہ نہ دے۔" عبدالمالک نے جواب دیا۔ پتہ نہیں کیوں اسے لڑکیوں سے اتنا ڈر لگتا تھا اس نے تو اپنی بہن کی شادی بھی بہت ہی جلد کر دی تھی۔ حالانکہ وہ بے حد ذہین تھی اور آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر اس نے ماں سے کہا کہ بس گریجویشن کافی ہے آپ اس کی شادی کریں۔ رشتہ اپنے خاندان میں ہی موجود تھا اس لیے کوئی زیادہ تردد بھی نہ کرنا پڑا اور اس نے بہن کے فرض سے خود کو سبکدوش کر لیا۔ ایسا شاید اس لیے بھی تھا کہ اس کی جاب میں دن رات ہونے والے

ایسے واقعات بُرے ہی تھے جو خواتین سے متعلق ہوتے تھے۔ اس لیے وہ اندر سے کچھ ڈر چکا تھا اور بظاہر خود کو عورت کے معاملے میں اور بھی سخت اور کٹھور ثابت کرنے لگا تھا۔

"ویسے لڑکی بھی بُری تو نہ لگتی تھی۔ نادان تھی جو خطا کھا گئی زمانے سے......" اس کی والدہ کو جانے کیوں بار بار زائرہ کا ہی خیال آ رہا تھا۔

"نادان تو نہ کہیں امی جان!" اس نے بُرا مناتے ہوئے بُرے سے منہ سے کہا۔

"یہ آج کل کی لڑکیاں! آپ کو نہیں پتہ کس قدر خراب ہو چکی ہیں۔ زمانہ انہیں کیا خطا دے گا یہ تو خود آج زمانے کے منہ پر طمانچہ ہیں۔" اس کا دل لڑکیوں کی حمایت میں کسی طرح سے نہ جاتا تھا۔

"ساری ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" انہوں نے بیٹے کو گھور کے دیکھا۔

"کم وبیش ایک ہی جیسی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"شرم کر عبدال! تیری بہن بھی تو ایک لڑکی ہی ہے۔" اس کے مسکرانے پر انہوں نے اسے سچ مچ ڈانٹ دیا۔

"میری بہن کی بات نہ کریں امی جان!" اسے اپنی بہن کا نام یوں لینا ہرگز بھی اچھا نہ لگا۔

"جیسے تیری بہن کی عزت ہے بیٹا! اسی طرح سے ہر لڑکی کی عزت ہوتی ہے۔ یوں کسی کو کمتر یا آوارہ نہیں جاننا چاہیے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"میری پیاری امی جان! ہر لڑکی معصوم اور شریف بھی نہیں ہوتی۔ آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ دراصل آپ بہت بھولی اور سادہ لوح ہیں۔" وہ اپنے موقف پر ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔

"اس پولیس افسری نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے عبدل! مجھے تو خوف آنے لگا ہے تیری اس انتہا پسند طبیعت سے۔" اس بار وہ بیٹے سے ناراض ہو گئیں۔

"سمجھ نہیں آتی کہ جو تیری بیوی بن کر آئے گی تو اس کے بارے میں کیا رائے رکھے گا۔ تیری شکی طبیعت تو اس بیچاری کا جینا محال کر دے گی۔"

"اس لیے تو کہتا ہوں امی جان! چھوڑیں پرے میری شادی کی فکر...... یوں بھی ہم ماں بیٹا آپس میں بہت خوش ہیں۔" اس نے ماں کا موڈ درست کرنے کے لیے شرارت سے کہا۔

"بکواس نہ کیا کرو۔ تمہاری یہ خواہش تو میں پوری نہیں ہونے دوں گی۔" انہوں نے بیٹے کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں ناں امی جان! دُکھتا ہے۔" وہ اپنا کان چھڑاتا ہوا چھوٹے بچے کی طرح بلبلا کر بولا۔

"دُکھتا ہے؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھے بھی دُکھتا ہے جب تم میرا دل مسلتے ہو۔" وہ اس کے شادی کے موضوع سے کترانے پر کہہ رہی تھیں۔

"دیکھیں ناں...... آپ نے کھینچ کھینچ کر میرے کان کس قدر لمبے کر دیئے ہیں۔ لنگور لگتا ہوں۔" اس نے گاڑی کے شیشے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس اب جلد ہی لاتی ہوں کوئی بندریا بھی...... تاکہ تمہاری بھی جوڑی بنے۔" وہ بھی شرارت سے مسکرائیں اور وہ "امی جان" کہہ کر ماں کے کندھے پر لاڈ سے اپنا چہرہ رکھتا ہوا بالکل ایک چھوٹا سا بچہ دکھائی دیا۔ اس لمحے ایک سخت گیر پولیس آفیسر والی رعونیت اس کے چہرے پر بالکل بھی نہ تھی اور وہ ایک اچھا خاصا خوبصورت نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔



اگلے روز کے اخبارات میں "گیسٹ ہاؤس" والے اسکینڈل کی گرما گرم خبریں بھری پڑی تھیں اور ہر ایک نے اپنی اپنی پالیسی اور مزاج کے مطابق اس خبر کو چھاپا تھا۔ وہ "گیسٹ ہاؤس" پچھلے کئی برسوں سے فحاشی کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ جہاں پر نوجوان لڑکیاں لڑکے ہی کیا بلکہ عیاش بوڑھے اور شادی شدہ آنٹیاں بھی اپنے شوق آوارگی کی تسکین کے لیے آیا کرتے تھے۔ جہاں سگ نوشی سے شروع ہو کر دنیا میں اس گیسٹ ہاؤس کی "آنٹی" کو ایک ملکہ کی حیثیت حاصل تھی بگڑے نوابوں کی بگڑی اولادوں سے لے کر بڑے بڑے اُمراء اور شرفاء تک اس "آنٹی" کے ایک اشارے پر پانی بھرتے نظر آتے تھے۔ یہاں پر جہاں کھلم کھلا بہت کچھ ہوتا تھا وہیں پر معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ان کے جعلی نکاح بھی کر دیئے جاتے تھے اور پھر انہیں بلیک میل کر کے انہیں غلاظت کی اس دلدل میں یوں دھکیل دیا جاتا تھا کہ پھر وہ کبھی وہاں سے نکل نہ پاتی تھیں۔ زمانے کی جدیدیت کے ساتھ ساتھ اب اس گھناؤنے کاروبار نے بھی بڑے ہی منفرد اور جدید طریقوں سے اپنے شکار پھنسانے شروع کر دیئے تھے۔ اور ان سب کے لیے یہ لوگ جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ "موبائل فون اور انٹرنیٹ" آج کل اس مکروہ کھیل کے سب سے آسان، دلچسپ اور کامیاب راستے تھے۔ "آنٹی" کے باقاعدہ ایجنٹوں نے انٹرنیٹ پر بے شمار ایسی "ویب سائٹس" باقاعدہ نیٹ ورک کے ساتھ دے رکھی تھیں جن کے وزٹ کرنے پر معصوم اور کم سن بچے بچیاں اس کھیل کا

یوں حصہ بن جاتے تھے کہ انہیں محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک نادیدہ دلدل میں دھنس رہے ہیں۔ ڈی ایس پی عبدالمالک نے ''اسی کرپٹ نیٹ ورک'' پر نہ صرف باقاعدہ ایک ریسرچ شروع کر رکھی تھی بلکہ وہ اس سلسلے میں باہر کے ملک سے کچھ لیکچرز بھی اٹینڈ کر کے آیا تھا۔ یہ ''گیسٹ ہاؤس'' ایسے ہی ایک ''نیٹ ورک'' کا پلیٹ فارم تھا۔ یہ بات اسے قریباً چھ ماہ سے معلوم ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاص نظر رکھے ہوئے تھے۔ گزشتہ روز اس نے پوری تیاری کے ساتھ اسی لیے یہاں ریڈ کیا تھا تاکہ وہ اس ''آنٹی صاحبہ'' کو مکمل ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کر کے اور ایسا اس نے اپنی محنت اور اللہ کے فضل سے کر لیا تھا۔ لیکن جہاں وہ اس ''گیسٹ ہاؤس'' کے راز کو افشا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا وہیں پر اس نے بہت سے شریف اور بے قصور والدین کی عزت کو بھی سرِعام نیلام ہونے سے بچا لیا تھا۔

صرف زائرہ ہی نہیں بلکہ اس جیسی کئی اور لڑکیاں اس چھاپے کے دوران اس کے زیرِ حراست آئی تھیں جن میں بہت کم بے خطاء اور معصوم تھیں جبکہ بہت سی لڑکیاں تو اب ایسے شرمناک فعل کو Just for Enjoyment اور ایک مشغلے کے طور پر اپنائے ہوئے تھیں اور بہت سی غریب لڑکیوں نے اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اس مکروہ کام کو بطور ''پارٹ ٹائم جاب'' کے اپنا لیا تھا اور بیشتر ایسے ''گیسٹ ہاؤسز'' میں کچھ وقت گزار کے اپنا ایک ہینڈسم ''پاکٹ منی'' بنا رہی تھیں اور یہ سب کچھ ہی انتہائی شرمناک اور قابلِ مذمت تھا بلکہ عبدالمالک نے تو ''پریس کانفرنس'' کے دوران کھلے الفاظ میں اسے ایک اسلامی جمہوریہ ملک کے لیے ''سونامی'' قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ لمحہ فکریہ ہے آج کے والدین کے لیے جو اپنی اولادوں کو جدید اور مہنگی تعلیم دینے کے لیے تو نہ صرف دن رات فکرمند دکھائی دیتے ہیں بلکہ اس کے لیے اپنا خونِ جگر تک بہا کر ان کے تعلیمی اخراجات کو پورے کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی دینی تعلیم و تربیت سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل اگر اس قدر بے حیاء اور بے راہ ہو چکی ہے تو اس کے ذمہ دار زیادہ تر والدین ہیں اور پھر ہمارا معاشرتی نظام اور بگڑتی ہوئی تہذیب ...... مگر پہلی غفلت تو گھر سے ہی ہوتی ہے تب ہی بچے غلط راہوں پر قدم رکھتے ہیں۔ اس نے ایک صحافی کے سوال کے جواب میں پاکستانی حکومت کو بھی نہ صرف اس کا ذمہ دار قرار دیا تھا بلکہ ایسے تنبیہہ بھی کی تھی کہ اگر جلد ہی اس ملک کے سماجی اور ثقافتی ڈھانچے کو از سرِ نو ''اسلام'' کی بنیاد پر تشکیل نہ دیا گیا تو بہت جلد ہمارے ہاں بھی ایسے مزید ''گیسٹ ہاؤسز'' کو پروان چڑھنے اور جگہ جگہ فحاشی کے جدید اڈے قائم ہونے میں دیر نہ لگے گی۔ پھر پاکستان کو سونامی بننے سے کوئی نہ روک سکے گا۔

عبدالمالک نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس نے تو آج ایک بُرائی کی جگہ کو نیست و نابود کرنے کی عملی کوشش کر دی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کل ہی سے ان کرپٹ لوگوں خصوصاً ''آنٹی'' کو صاف بچا لینے کے لیے اک جدوجہد شروع ہو جائے گی اور وہ اپنے بڑوں اور اس ملک کے ناقص نظامِ عدل کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی وہ بڑے لوگ قانون کے ہاتھوں سے صاف بچ کر بے حیائی کے اڈے اسی طرح سے چلاتے رہیں گے۔''

''اچھا آپ نے جن لڑکیوں کو وہاں سے گرفتار کیا ہے انہیں کیوں پردہ میں رکھا ہوا ہے۔ کیا وہ آپ کے تعلق داروں میں سے ہیں؟'' ایک صحافی نے بڑا ہی چبھتا ہوا سوال کیا تھا۔

''میرا تعلق ہر شریف آدمی سے ہے۔ اور پھر عورت کے بارے میں میرا ایک اپنا نظریہ ہے۔ عورت کی عزت عورت کی ردا بہر حال اُچھالے جانے کے لیے نہیں ہوتی۔''

''اچھا تو کیا ''آنٹی'' عورت نہیں ہے جسے آپ نے قابلِ رعایت نہیں سمجھا؟'' ایک اور سوال تھا۔

''یہ عورت کے نام پر ایک کلنک ہے۔ یہ اتنی سنگین مجرم ہے کہ اس کی وجہ سے اس ملک وملت کی بیٹیاں ''بازار کا مال'' ہو کر رہ گئی ہیں اس کا جرم قتل سے بھی سنگین ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اور اس جیسی ہر عورت کو سرِعام سنگسار کرواتا۔'' اس نے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ایک طرف کو بیٹھی المعروف آنٹی کی طرف حقارت ونفرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ آخر میں اس نے اپنی حکومت اور ان اعلیٰ افسران کے نام ایک پیغام حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنا کر دیا تھا اس امید پر کہ شاید آج کی ترقی پسند حکومت اور براڈ مائنڈڈ افسران پر اس کا کچھ اثر ہو۔ اس نے اسی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی پریس کانفرنس ختم کر دی تھی کہ ارشادِ رسولؐ ہے کہ:

''جو قوم بے حیائی کی طرف قدم بڑھائے گی اللہ اسے مصیبتوں میں مبتلا کر دے گا۔''

عمیس جیلانی کے ہاتھ سے اخبار گر گیا اور ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک جان لیوا سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''بے حیائی کیسا بڑا عذاب ہے۔ کتنی بڑی مصیبتیں اس کی بدولت آئی ہیں۔ اس کا اندازہ اب عمیس کو ہو رہا تھا۔ انہوں نے آج کے سارے اخبارات اخبار والے سے خود ہی وصول کیے اور انہیں اپنے کمرے میں لے آئے تھے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے ان

سارے اخبارات کا مطالعہ کیا تھا اور ایک ایک سطر کو دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سوچتے ہوئے پڑھا تھا کہ کہیں خدانخواستہ اگر زائرہ کی تصویر یا نام کہیں چھپا ہوا تھا تو کیا بنے گا مگر ایسا نہ تھا۔ تمام اخبارات میں ڈی۔ ایس۔ پی اسپیشل برانچ عبدالمالک کا شاندار انٹرویو تھا اور پریس کانفرنس کی تفصیلات تھیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا بہت شکر ادا کیا۔ کہ باوجود اک قیامت کے گزر جانے کے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسری بڑی بدنامی جیسی قیامت سے بال بال بچالیا تھا۔ انہوں نے سارے اخبارات کو تہہ لگا کر اپنی الماری میں رکھ دیا۔ وہ آج کا کوئی بھی اخبار کسی اور گھر والے کے ہاتھ میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے میاں جی سے زائرہ کا دیا ہوا وہ عظیم صدمہ برداشت نہ ہو سکا تھا اور ہزار ضبط کے باوجود وہ اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو بچا نہ سکے تھے۔ انہیں ایک شدید دل کے دورے نے ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ سب گھر والے اس وقت باقی سب بھول کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ترنم بیگم بی بی جان کے ساتھ ہسپتال آ گئی تھیں۔ جبکہ ستارہ زائرہ کو لے کر اپنے اس کمرے میں آ گئی تھی جو شادی سے قبل اس کا کمرہ تھا اور جوں کا توں تھا۔ زائرہ بُری طرح سے سہمی ہوئی تھی۔ رو رو کر بھی ہلکان ہو چکی تھی لہٰذا اس وقت بے دم، ٹوٹی ٹوٹی کمزور سی ہچکیاں اس کے بظاہر زندہ وجود کو ہلا رہی تھیں۔

''تم نے کھانا کھایا تھا زائرہ؟'' ستارہ نے نرمی سے پوچھا تھا۔ جواباً وہ جوں کی توں چپ تھی۔

''دیکھو زائرہ! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اگرچہ اچھا نہیں ہوا'' وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے سہلانے لگی۔

''میں بہت بُری ہوں...... مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔'' بہت دیر کے بعد اس کے خالی وجود سے ایک مری مری سی آواز نکلی۔

''اپنی غلطی کا احساس تمہیں ہو گیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ اب مزید کچھ بُرا کرنے کا مت سوچو اور اُلٹی سیدھی باتوں سے اتنی ذلت بھری زندگی کا کیا فائدہ؟'' وہ مارے غیرت کے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

''زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اس نے کس کو کب تک زندہ رکھنا ہے اور کب کسے موت آئے گی۔ یہ سب اسی کے اختیار میں ہے۔ تمہاری مرنے کی آرزو اس کی پابند نہیں ہے کہ تم موت مانگو اور تمہیں مل جائے۔''

ستارہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہی تھی۔

''میں اپنی زندگی خود ختم کر لوں گی۔'' وہ زندہ رہنے پر کسی طور راضی نہ تھی۔

''اچھا اگر تمہیں لگتا ہے کہ یہ تمہارے بس میں ہے تو کوشش کر دیکھو لیکن سنو اگر تمہیں موت آ گئی تو تم حرام موت مرو گی اور تاقیامت مرنے اور جینے کے اذیت ناک عمل سے دوچار ہو گی۔''

وہ بات کرتے کرتے ذرا سی رُکی اور پھر کہنے لگی۔

''اور اگر موت نہ آ سکی تو...... تو سوچو ایک اور شرمندگی...... ایک اور ذلت کا بار تم پر آ پڑے گا۔ عین ممکن ہے کوئی معذوری کوئی عمر بھر کی محتاجی تمہارا مقدر ہو جائے۔ تب؟ تب کیا تم وہ سہار پاؤ گی؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔ جواباً وہ اگلے ہی لمحے آنکھیں چُرا گئی۔

''مگر اب کوئی بھی مجھے اچھا نہ سمجھے گا۔ کوئی مجھ سے محبت نہ کرے گا۔ سب کی نفرتیں سمیٹنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔'' اس نے اپنی کم ہمتی کا ذکر کیا۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر اس کو وقت لگے گا۔ اب تم کو صبر اور حوصلے سے کام لینا ہو گا۔ ہمت کرنی پڑے گی زائرہ! اب نہ صرف تم پر بلکہ پورے گھر پر ایک کڑا وقت ہے۔'' ستارہ کے لہجے میں ایک گہرا دُکھ صاف عیاں تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ تمہارے دیئے گئے زخموں کو تو وہ کب سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے۔

''پھر بھی میں بہت بُری ہوں تارہ آپی!'' وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پڑی اور باقاعدہ زور زور سے رونے لگی۔

''بس...... بس میری جان!''

''بس کرو۔''

''چپ کرو میری پیاری بہن!''

وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے پچکار رہی تھی۔ وہ جتنا اسے پیار کر رہی تھی وہ اسی قدر بکھرتی جا رہی تھی۔

''آپی! میں واقعی بہت بُری ہوں۔ میں نے تو آپ کے لیے بھی کبھی اچھا نہیں سوچا۔'' وہ اپنے کیے کا اقرار کر رہی تھی۔

''میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم میری طرف سے اپنا جی میلا نہ رکھو۔''

وہ اسے واقعی دل سے معاف کرتی ہوئی بولی۔

''میں نے اپنے بابا کے اعتماد کا خون کیا۔ میں نے اپنے دادا کا سر شرم سے جھکا دیا اور میں نے...... میں نے زید پر خواہ مخواہ تہمتیں لگائیں۔ مجھے کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔ مجھے

تو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔

"یا اللہ! مجھے موت دے دے۔ سچ مچ میرا پردہ کر دے اس دنیا سے۔"

وہ روتی جا رہی تھی اور اپنے تمام دانستہ گناہوں کا اعتراف کیے جا رہی تھی۔

"بس کرو زائرہ! بس تمہیں خدا کا واسطہ چپ کر جاؤ۔"

ستارہ کا تو اپنا دل بے حد چھوٹا تھا وہ اسے یوں تڑپ تڑپ کر روتا دیکھ کر خود بھی رو رہی تھی۔

"بس میری جان!" اس نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے کر لیا اور اس کی لال سرخ آنکھوں میں نرمی سے جھانکنے لگی۔ پھر اس کے آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

"اللہ کو سب سے زیادہ غصہ دلانے والی بات پتہ ہے کیا ہے؟"

وہ اسے پوچھ رہی تھی پھر خود ہی بتانے لگی۔

"کہ اللہ سے اس کا بندہ اپنے لیے موت مانگے۔ چلو توبہ کرو اللہ سے...... اور اُٹھو جا کر وضو کرو۔ نماز پڑھو تا کہ تمہارے دل کو ڈھارس ملے۔ اس پریشانی اور غم کی گھڑی میں اس سے مدد مانگو۔ وہ یقیناً سچے دل سے توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔"

وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر باتھ روم کے پاس لے گئی اور اسے وضو کرنے کی تاکید کر کے خود وہاں سے چل دی یہ کہتی ہوئی۔

"تم نماز پڑھو تب تک میں تمہارے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

حالانکہ وہ منع کرتی رہی کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ اس کا جی نہیں چاہ رہا۔ اسے بھوک بھی نہیں ہے۔ مگر وہ نہ مانی۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی تو اتنے بڑے صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت کہاں سے آئے گی۔ اتنے کڑے امتحان سے گزرنے کی ہمت کہاں سے آئے گی اور پھر کھانا تو موت والے گھر میں بھی کچھ دیر بعد ہی کھلایا جاتا ہے تاکہ غم سے نڈھال لواحقین کو کچھ تقویت ملے۔"

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"تم نماز پڑھو میں بس آ رہی ہوں۔"



میاں جی کو ہوش آیا اور ان کی حالت ذرا سنبھلی تو انہوں نے طاہرہ بیگم کو اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔ انہوں نے پہلے تو انہیں آنکھیں کھولتا دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا پھر "جی...... جی میاں جی!" وہ لپک کر حاضر ہو گئیں۔

"زید کی کوئی خبر آئی؟" انہیں زید کی ہی فکر تھی۔

"میں نے پوچھا طاہرہ! زید سے کسی کی بات ہوئی؟" طاہرہ بیگم کو خاموش پا کر انہوں نے فوراً ہی دوبارہ پوچھا۔

"آپ کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ سب پریشان ہو کر ہسپتال چلے آئے۔"

طاہرہ بیگم نے ایک طرح سے سچ بھی کہا تھا کہ ایسا ہی ہوا تھا میاں جی کے ہارٹ اٹیک نے تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیئے تھے کسی کو اور کوئی دھیان رہا ہی نہ تھا۔

"اچھا انیس کو بلاؤ۔" انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ذرا سا بولنے سے سانس پھول گئی تھی۔ نقاہت زردیاں بن ان کے چہرے سے عیاں تھی اور بتا رہی تھی اس ہارٹ اٹیک نے ان کے بند بند کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔ طاہرہ بیگم سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ وہ تو خود ٹوٹی پڑی تھیں ایک وہ دردِ عظیم تھا جو زائرہ نے انہیں بخشا تھا۔ وہی ان کی کمر توڑنے کو کافی تھا اوپر سے شوہر کا یوں اچانک آئی سی یو میں آ جانا وہ خود کو پتہ نہیں کس طرح سے سنبھالے ہوئے تھیں۔

ترنم بیگم نے جو انیس میاں کو بلانے کا سنا تو فوراً آئی سی یو سے بھاگیں اور باہر بیٹھے انیس کو میاں جی کا پیغام دیا۔

"جی میاں جی!" اگلے ہی لمحے انیس میاں ان کے پاس مؤدب کھڑے تھے۔

"بیٹا! وہ تم نے زید کو فون کیا؟" وہ دوبارہ آنکھیں کھول چکے تھے۔

"زید کو فون......؟" اسیس میاں شرمندہ سے ہو گئے۔

"چلو اسے فون کرو اور کہو میں ہسپتال میں ہوں۔ دیکھنا وہ فوراً چلا آئے گا۔" انہیں زید شدت سے یاد آ رہا تھا۔

"میاں جی! وہ ذرا گھر میں کچھ ٹینشن کم ہو جاتی تو؟"

انہوں نے گھر کے بے حد کھنچے ہوئے ماحول کی وجہ سے احتیاطاً کہنا چاہا۔

"گھر میں ٹینشن اس کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اسی کی وجہ سے اس گھر میں قیامت برپا ہوتے ہوتے رہ گئی۔" وہ رُک رُک کر بولے۔

"آپ...... آپ...... پریشان نہ ہوں۔ آپ زیادہ بات نہ کریں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" طاہرہ بیگم نے انہیں زیادہ بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"میں...... میں فون کرتا ہوں اسے...... میرے پاس اس کا نیا موبائل نمبر نہیں ہے۔"

اسیس میاں نے فوراً اپنا موبائل نکالا تاکہ زید کو فون کریں مگر اس کا نمبر ان کے پاس نہ تھا۔

"ستارہ سے کہو اسے فون کرے اور کہے کہ وہ فوراً واپس آئے۔ پتہ نہیں کہاں دھکے کھاتا پھر رہا ہوگا۔" انہیں زید کی ہی فکر لاحق تھی۔

"آپ فکر نہ کریں میں ستارہ کو کہتا ہوں۔" اسیس میاں نے اپنے والد صاحب کو تسلی دی اور ان کے سامنے ہی ستارہ کو فون کر کے میاں جی کا پیغام دے دیا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا میرا زید بے قصور ہے وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے دوبارہ سے کہنا شروع کیا۔

"مگر تم میں سے کسی نے بھی یقین نہیں کیا اور اس لڑکی کا کہا سچ جانا۔" انہوں نے زارا کا نام لیے بغیر اس کے ذکر پر پیشانی پر بل ڈالے۔ اس کا مطلب تھا وہ اس پر سخت خفا تھے۔

"آپ...... آپ...... نہ بولیں ناں۔" طاہرہ بیگم انہیں اس کربناک موضوع سے ہٹانا چاہتی تھی۔

"طاہرہ! عمیس نے وقت پر اپنے گھر کی خبر نہیں لی۔" انہیں عمیس کے رویوں پر سخت رنج تھا۔

"چھوڑیں بھی...... یہ باتیں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر نے آپ کو آرام تلقین کی ہے۔"

حالانکہ طاہرہ بیگم کو ان کی بات سے پورا اتفاق تھا مگر یہ وقت ان باتوں کا واقعی نہ تھا۔

گھر کے صحن میں چار دیواری تو اُٹھا دی اس کم عقل نے مگر اس چار دیواری کے مقا

بھول گیا جو باہر کی دنیا سے تحفظ کے لیے ہوتی ہے۔" وہ عمیس پر اپنا غصہ ہلکا کر رہے تھے۔

"اسیس!" انہوں نے اسیس میاں کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

"جی میاں جی!" وہ دوبارہ ان کے پاس آ گئے۔

"آج کے اخبارات دیکھ لیے تھے تم نے...... کہیں کچھ......؟" بات کو پورا کرنے سے پہلے ہی ان کی نظریں زمین کو چھونے لگیں۔

"جی! آپ پریشان نہ ہوں۔ سب خیر ہے۔" اسیس میاں نے نظریں ان کی طرف مرکوز کرنے کی بجائے کسی اور جانب لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"بڑا ہی اچھا انسان ہے ڈی ایس پی!" میاں جی نے بدستور زمین کو دیکھتے ہوئے عبدالمالک کی تعریف کی۔

"ہاں نیک خون ہے۔" طاہرہ بیگم نے ان کی تعریف کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"صرف نیک خون ہونے سے کچھ نہیں ہوتا تربیت بھی تو اچھی ہونی چاہیے۔" وہ جواباً بولے۔ اتنے میں ڈاکٹر ان کے چیک اپ کے لیے آ گئے اور وہ خاموش ہو گئے۔

"ویری گڈ! یو آر سٹیے ایبل ناؤ۔"

(Very Good you are stayable now)

میاں جی کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے انہیں بتایا۔

"الحمدللہ!" طاہرہ بیگم اور ترنم بیگم کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"بہرحال اب آپ کو بہت زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔ خوراک بھی پرہیزی کھانی ہوگی اور یہ دوائیں بغیر ناغے کے کھانی ہوں گی۔"

وہ نور محمد جیلانی صاحب کا نسخہ لکھتے ہوئے انہیں علاج کی ہدایات دے رہے تھے۔

"تو کیا میں آج گھر جا سکتا ہوں؟" جیلانی صاحب وہاں پڑے پڑے گھبرا رہے تھے۔

"میاں صاحب! آپ کو اللہ نے نئی زندگی بخشی ہے۔ آپ فی الحال کچھ بہتری کی طرف جا رہے ہیں لیکن صحت مند نہیں ہوئے کہ ہم آپ کو گھر جانے دیں۔"

ڈاکٹر نے ان کی امید پر پانی پھیرتے ہوئے کہا تو وہ کچھ اُداس سے ہو گئے۔

"اللہ سے خیر مانگیں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ہم ان شاءاللہ تعالیٰ گھر بھی جائیں گے آپ ٹھیک تو ہو جائیں۔" طاہرہ بیگم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم ترنم کو تو گھر بھیجو۔ دیکھو اس کی آنکھیں جاگ جاگ کر کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔" انہوں نے ترنم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں جی! آپ ٹھیک ہو جائیں میں پھر چلی جاؤں گی اور میں بالکل ٹھیک ہوں آپ میری فکر نہ کریں۔" ترنم بیگم نے ان کے قریب آ کر احترام سے جواب دیا۔ ان کی آواز میں اب بھی ایک لرزش اور آنکھوں میں نمی موجود تھی جو میاں جی سے چھپی نہ رہ سکی۔

"ترنم!" انہوں نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

"جی میاں جی!" ان کی آواز کچھ اور بھیگ گئی۔

"تمہارے درد کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ یہاں......" انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "اور تمہارے دل میں لگی ہوئی آگ کا دھواں میری آنکھوں کو بھی سلگائے دے رہا ہے۔" وہ بھی اپنی آنکھوں میں تیرتے پانی کو چھپا نہ سکے۔

"میاں جی!" ترنم بیگم کا وہ حوصلہ اب جواب دے گیا جو انہوں نے پچھلی دو راتوں سے خدا جانے کس طرح سے کر رکھا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ تھام کے رو دیں۔

"میری بچی!" وہ بھی تڑپ گئے۔

"یہ میرے اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش ہے جو ہم سب کی ہے۔" ان کی آواز شکستہ تھی۔

"اللہ اپنے پیاروں کو ہی آزماتا ہے۔ اور وہ کسی کو اس کی قوت و ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا۔" طاہرہ بیگم نے آگے بڑھ کر ترنم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بی بی جان! میں...... میں تو کب سے عمیس سے کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ توجہ کریں۔ زائرہ کو نوٹس کریں۔ مگر......مگر وہ تو مجھے ہی......"

وہ اپنی بات کو پورا نہ کر سکیں اور ہچکیاں لینے لگیں۔

"یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ مرد اولاد کی تربیت کی ساری ذمہ داریاں صرف ماں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتا ہے۔"

طاہرہ بیگم نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ مرد اپنے خاندان کا راعی ہے اور اولاد کے اچھے بُرے کا جواب دہ ہے۔"

"پتہ نہیں یہ عمیس کی عادتیں اور اطوار کس پر گئے ہیں؟" انہیں بھی عمیس پر نہ صرف غصہ بلکہ بے حد رنج بھی تھا۔

"اولاد بھی تو ایک آزمائش ہے۔ عمیس ہماری آزمائش بنا رہا تمام عمر اور اب زائرہ اس کی آزمائش بن گئی۔"

میاں جی نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔ میاں جی!" ترنم بیگم کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تمہارا کیا قصور۔" طاہرہ بیگم بولیں۔

"نہیں...... بی بی جان! کہیں نہ کہیں تو مجھ سے بھی بھول چوک ہوتی رہی ہے ورنہ بات یہاں تک نہ بڑھتی۔" وہ پھر بھی اپنی غلطی سمجھ رہی تھیں۔

"جو ہوا......وہ اچھا نہیں ہوا۔"

طاہرہ بیگم نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اور شکر کریں اللہ تعالیٰ کا کہ بہت کچھ نہیں ہوا۔" اسیس میاں جو کب سے خاموش بیٹھے ان سب کو دیکھ رہے تھے اُٹھتے ہوئے بولے۔

"شکر ہے میرے پروردگار کا بے شک وہ بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔" طاہرہ بیگم کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا اور یہی حالت میاں جی ترنم اور اسیس جیلانی کی بھی تھی وہ چاروں سوچ رہے تھے کہ اگر اس رات زائرہ کو عبدالمالک واپس گھر نہ چھوڑ جاتا تو کیا ہوتا؟ یا پھر زائرہ ان کرپٹ لوگوں کے مزید ہتھے چڑھ کر اور کچھ کر گزرتی تو......تو کیا ہوتا؟ ان کے دل خوف سے سکڑ کر ان کے سینوں میں لہو کے قطرے بن گئے تھے اور سانسیں تو گویا برف ہو گئی تھیں اور آنے والے اس سے بھی بھیانک مناظر کو سوچ کر ہی ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ادھر ان کے اجسام و ارواح عالم برزخ میں جہنم کے دہانے پر لٹکے سوچ رہے تھے کہ بیٹیاں جب رحمت سے زحمت بنتی ہیں تو والدین پر کیسی عظیم قیامت برپا ہوتی ہے۔



زید واپس گھر آ رہا تھا اسے ستارہ نے جیسے ہی فون پر بتایا کہ اس کے دادا جان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال میں ہیں تو وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ناں؟" وہ بار بار اسے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں......اب وہ ہر طرح کے خطرے سے باہر ہیں اللہ تعالیٰ نے کرم کر دیا۔" وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ "بس تم فوراً واپس پہنچو۔ نانا جان تمہارا بار بار پوچھتے ہیں وہ تمہارے لیے بہت اُداس ہیں۔" وہ اسے جلد آنے کی تاکید کر رہی تھی۔

"ہاں......میں ابھی نکلتا ہوں۔" وہ تو خود اپنے دادا جان کے لیے ترسا پڑا تھا۔

"دیکھو......بائے ایئر آ جاؤ۔" اس نے مشورہ دیا۔

"اچھا......میں دیکھتا ہوں۔" وہ ذرا جھجکا۔

"کیا پیسے نہیں ہیں؟" وہ کچھ سمجھتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

"ہاں......لیکن میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے جھوٹ نہ بولا تھا اس کے پاس واقعی پیسے

نہ تھے۔

"میں ڈائیوو پر آ جاتا ہوں۔ جا کر ٹکٹ پتہ کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ صبح تک پہنچ جاؤں گا۔"

زید کو ڈائیوو کا خیال آ گیا تھا کہ وہ بھی جلد پہنچا دیتی ہے اور اس کا سفر بھی آرام دہ ہے۔

"اچھا...... مگر دیکھو راستے میں سوئے نہ آنا اور...... اور...... اپنا خیال رکھنا۔ ہر سٹاپ پر اترنا بھی مت۔" وہ فکرمند ہوتی ہوئی اسے نصیحتیں کرنے لگی۔

"آپی! میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" اس نے ستارہ کو سمجھانا چاہا۔

"بچے ہی تو ہو۔ عقلمند ہوتے تو کیا اتنی دور چلے جاتے ناراض ہو کر؟" چھوٹا سا ایک گلہ اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔

"میں کسی سے ناراض ہو کر نہیں آیا تھا۔" اس کے جواب میں بھی کچھ شکایت تھی۔

"اتنے سارے اپنوں کی ناراضگی اور اپنی ناحق کی ذلت کا احساس مجھے وہاں رہنے نہ دے رہا تھا۔"

"زید! تم مجھ سے بھی خفا ہو؟" وہ زید کے درد کو محسوس کر سکتی تھی اور یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کا دل دُکھانے میں خود ستارہ کا اپنا حصہ بھی ہے۔

"نہیں...... ایک تم ہی تو ہو جو میری اپنی ہو۔ سچ مچ اپنی......"

وہ شاید رو رہا تھا۔

"زید!"

"ہوں......"

"کیا رو رہے ہو؟" وہ اپنی آواز میں آنے والا بھاری پن چھپائے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بس ایسے ہی دل بھر آیا تھا۔" اس نے صاف کہہ دیا۔

"دیکھو...... میں تو تم سے بھی زیادہ تنہا ہوں۔ میرے دامن میں بھی جانے کتنے ایسے کانٹے ہیں جو اپنوں ہی نے دیئے ہیں۔" نا چاہتے ہوئے وہ بھی شکوہ کر گئی۔

"آپی! کیا ہو گیا ہے ہمارے گھر اور خاندان والوں کو؟ کس طرح سے سب کچھ بدل گیا ہے؟" اسے جیلانی ہاؤس میں کھلکھلانے والی خوشیاں یاد آ رہی تھیں جواب وہاں نہیں تھیں۔

"کس کی بدنظری نے کھا لیا ہے ہماری محبتوں کو......" وہ بھی سسک رہی تھی۔

"آپی! اب آپ بھی رو رہی ہو۔" وہ اسے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں زید! میں بھی بہت اکیلی اور بہت اُداس ہوں۔ نانا جان کی طرح مجھے بھی تم بہت

یاد آ رہے ہو۔" وہ ضبطِ غم سے اپنے لب بھینچتی ہوئی بولی۔

"اچھا! آپی چپ کرو۔ میں بس ابھی نکل رہا ہوں۔" اس سے ستارہ کی اُداسی اور اس کی آواز میں بولتا ہوا درد برداشت نہ ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے اپنی سانس کو ناک میں کھینچ کر کچھ آنسو آنکھوں سے حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔

"بس میں یوں آیا۔ تم اپنی آنکھیں بند کرو۔" وہ پیار سے بولا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی محبت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن تھا۔ اسے تو صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ محبت جو سراسر حق اور سچ تھی اور اپنا ایک وجود رکھتی تھی جس پر بدلتے موسموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جو وقت کے ساتھ نہیں چلتی تھی کہ وقت بدلے تو وہ بھی اپنے قدم دوسرے راستے پر رکھ دے۔ وہ ایک رشتہ تھی۔ کوئی معمولی تعلق نہ تھی۔ ستارہ اور زید کے جذبوں کی شدت سے گندھی، دلوں کی مٹی میں بیج کی مانند اُتری اور وہ "محبت" تھی۔ چاہت نہیں جس کے مختلف حوالے ہوتے۔ یہ محبت وہ محبت تھی جو بھی یکطرفہ یا تنہا نہیں ہوتی بلکہ سب کے لیے ہوتی ہے اور سب کچھ ہوتی ہے۔ جیسے ستارہ کی محبت زید کے لیے تھی۔ اس کی ماں بھی...... سہیلی بھی...... محبوبہ بھی...... اور بہن بھی...... اور چونکہ اس کے سیال میں کوئی ملاوٹ نہ تھی اس لیے اس کا رنگ شفاف تھا۔ بالکل پانی جیسا اور زید اس کے لیے ہو بہو ایسا ہی تھا۔ پھر بھی احمد نے جانے کیسے ان دونوں کے درمیان اس روایتی سی محبت کے ہونے کا گمان کر لیا تھا جو دراصل محبت کم اور ایک مرد اور عورت کے درمیان جذباتی کشش زیادہ ہوتی ہے اور جس کے اندر تقاضوں اور توقعات کے لاتعداد جراثیم موجود ہوتے اور صبر اور حوصلہ بے حد کم...... جس کی انتہا جلد ہی شادی پر ہو جاتی ہے دونوں محبت کرنے والوں کی شادی اگر ہو جائے تو معاشرے میں وہ دونوں وفادار اور عزت دار کہلاتے ہیں اور اگر نہ ہو پائے تو عمر بھر دونوں ہی بے وفا گردانے جاتے ہیں کسی کی نظر میں مرد اور کسی کی نظر میں مرد...... مگر یہاں تو محبت بے لوث تھی۔ اس کا تقاضہ دونوں ہی سے اخلاص تھا۔ پھر بھی لوگ سمجھ نہیں پائے اور انگلیاں اٹھا گئے ستارہ کو اپنے عمیس ماموں اور احمد کے گزشتہ رویے یاد آ گئے۔ جو انتہائی اذیت ناک تھے اس کے لیے۔ عمیس ماموں بھی خیر قابلِ معافی تھے کہ وہ تو اس کے دل کے محرم راز نہ تھے ان کے ساتھ تو اس کا صرف ایک رشتہ تھا۔ وہ رشتہ جو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آ گیا تھا۔ مگر احمد! آہ احمد! تو اس کا ایک دلی اور شعوری رشتہ تھا جو دونوں کے جذبات کے مشترک ہونے پر وجود میں آیا تھا۔

جسے ان دونوں نے اپنے دلوں میں بویا اور پھر اسے سینچا تھا۔

وہ سمجھتی تھی احمد کے اور اس کے درمیان تو احساس کا رشتہ ہے۔ یک جاں دو قالب کے احساس کا اسے تو یہ خوش فہمی بھی تھی کہ احمد اس کی دھڑکنوں کے زیر و بم سے پیغام لے سکتا ہے اس کے خیالات کو پڑھنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے احمد ہی وہ شخص ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ معتبر اور قابلِ اعتبار ہے اور میں ہی وہ عورت ہوں جو احمد کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اور معتبر ہے۔ لیکن احمد نے تو اسے ہی سب سے زیادہ مشکوک جانا اور محبت کے جرم میں معتوب کر ڈالا۔

محبت تو اب ان کے درمیان سے ہٹ چکی ہے۔ یا شاید کبھی تھی ہی نہیں یا پھر شاید اب کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس کی گیلی آنکھوں سے اشک پھر رواں ہو گئے۔

زید سے بات کرتی کرتی وہ احمد سے مخاطب ہو گئی تھی۔

اس کا زید کے لیے اُداس ہونے والا دل احمد کے لیے تڑپنے لگا تھا اور وہ محبت کے دو مختلف اور مخالف سروں سے بندھ کر اپنے دل کے اس خلاء پر جھولنے لگی تھی جو احمد کی محبت نے پیدا کر دیا تھا۔ حالانکہ محبت جہاں ہوتی ہے وہاں تو اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر خلاء کیسے ہو سکتا ہے اور جہاں دل کے کسی بھی حصے میں خلاء ہو وہاں...... وہاں پر سوائے اک ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت درد کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ستارہ کے دل میں بھی اب ایسا خلاء پیدا ہو رہا تھا جہاں دھیرے دھیرے ایک ایسا ہی درد گھر کر رہا تھا جو اس کے جسم کے ریشے ریشے سے سمٹ رہا تھا۔



وہ جب سے آیا تھا اپنے دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا تھا۔ اس نے منہ سے سوائے سلام و دعا کے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ بس کچھ کچھ دیر کے بعد اپنے دادا جان کے ہاتھ تھام کر کبھی اپنے لبوں سے لگا لیتا اور کبھی آنکھوں سے۔

''اپنے دادا سے ناراض ہو گیا؟'' میاں جی اس سے بہت شرمندہ تھے کہ انہوں نے اس کڑے وقت میں کھل کر اس کا ساتھ نہ دیا تھا۔ وہ بھی کیا کرتے۔ اس وقت مسئلہ اتنا نازک اور اُلجھا ہوا تھا کہ وہ باوجود زید کو بے خطا سمجھنے کے بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے اور بے خطا کیا؟ نور محمد صاحب تو خود یقین اور بے یقینی اور وہم و گمان کے درمیان ہی معلق رہے تھے۔ انہیں اگر یہ لگتا تھا کہ زید کبھی ایسی بُری حرکت نہیں کر سکتا تو کبھی کبھی ان کے دل میں کچھ وہم بھی آ ہی جاتا تھا۔ کہ شاید...... ہو سکتا ہے جو سب کہہ رہے ہیں وہ درست ہی ہو؟

ہو سکتا ہے زید کے دل میں زائرہ کے لیے ایسا ہی جنون چھپا ہوا ہو؟

ہو سکتا ہے زمانے کی ہوا نے زید کو بھی چھو لیا؟

ایسے بے شمار سوالیہ سوالیہ نشان ان کے ذہن پر ہتھوڑے بن کر برستے رہتے تھے۔

''یار جگر! کچھ تو بول؟'' وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''یار! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ بس اب جانے بھی دے۔'' ان کی آواز جذبات کی شدت سے لرزنے لگی تھی۔

''دادا جان! آپ ایسا مت کہیں بار بار......'' وہ ان کے کندھے سے لگ گیا۔

''تو پھر بات کرو مجھ سے۔ تمہاری چپ تو میرے دل پر کند چھری کی طرح پھرتی جا رہی ہے۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

''دادا جان! میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو...... میں تو کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔'' وہ چھوٹے بچے کی طرح رونے لگا۔

''میری جان!''

''میرا جگر!''

وہ بھی اسے پیار کرتے جا رہے تھے اور اپنی نم آنکھیں صاف کرتے جا رہے تھے۔

''میاں صاحب! بس بھی کر دیں اب...... آپ کی طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔''

بی بی جان نے آگے بڑھ کر دادا پوتے کو علیحدہ کیا۔

''ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ جذباتی ہونے سے منع کیا ہے چاہے خوشی ہو یا غم؟''

وہ زید کو اپنے ساتھ لگا کر انہیں سمجھاتی ہوئی بولیں۔

''ڈاکٹروں کو بھلا اور کیا کام ہے سوائے نصیحتیں کرنے کے اور مجھے اب کچھ نہیں ہو سکتا میرا دل بھلے کمزور ہو مگر میرا ''جگر'' بڑا حوصلے والا ہے۔''

انہوں نے ''جگر'' کہتے ہوئے زید کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''کیوں نوجوان؟'' ان کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔

''بالکل دادا جان!'' اس نے بھی اپنی آنکھیں زور سے رگڑ کر پونچھیں اور مسکرا دیا۔

''دیکھو تو کیسا کمزور ہو گیا ہے طاہرہ! کھانا بنواؤ اچھا سا میرے بچے کے لیے۔''

انہوں نے محبت بھری نظروں سے زید کا جائزہ لیا جو انہیں بہت کمزور لگ رہا تھا۔

''بن رہا ہے کھانا...... آپ کے کہنے سے پہلے ہی۔ اس گھر میں اور لوگوں کو بھی اس سے محبت ہے۔''

انہوں نے مصنوعی بُرا مناتے ہوئے کہا۔

"جانتا ہوں۔ میرے علاوہ اور کتنوں کو محبت ہے اس سے......؟"

میاں جی نے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے اسیس میاں پر اک شکایتی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ جس پر وہ شرمندہ سے ہو کر وہاں سے یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔ "اچھا میاں جی! میں ذرا آفس کا ایک چکر لگا آؤں۔"

"اچھا......اچھا جاؤ۔" نور محمد جیلانی نے انہیں جانے کی اجازت دیتے ہوئے زید کو پھر سے اپنے قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔

"آپ دادا پوتا کر لیں اپنے راز و نیاز میں ذرا نوافل ادا کروں۔" طاہرہ بیگم بھی وہاں سے اُٹھ کر وضو کرنے چل دیں۔



جیلانی ہاؤس کے مکین اپنے اپنے کاموں میں بظاہر تو مصروف ہو چکے تھے مگر ان کے شب و روز میں اب سوائے ایک گھمبیر یکسانیت کے کچھ نہ تھا۔ ہر ایک اپنے مزاج سے بڑھ کر سنجیدہ ہو چکا تھا اور دوسرے سے نظریں چراتا ہوا نظر آتا تھا اور خود کو خواہ مخواہ کے کاموں میں اُلجھائے دکھائی دیتا جیسے اسے کسی اور چیز سے سروکار نہ ہو اور تو اور زید بھی بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اس کی تو یہ حالت تھی کہ وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتا۔ نکلتا تو سرعت سے اپنے دادا جان کے کمرے میں داخل ہو جاتا یا پھر کالج جاتا۔ اس کے اور گھر والوں کے درمیان اک دیوار اُٹھ چکی تھی ایک اَن دیکھی اور ایسی دیوار جس کی اونچائی یا موٹائی کا بھی کچھ اندازہ نہ تھا۔ اگرچہ یہ دیوار کچی مٹی کی ہی تھی اور ابھی گیلی بھی تھی مگر اس دیوار نے اسے اپنوں سے جدا کر دیا تھا۔ گھر کا ہر فرد اس سے نظریں ملانے کا یارا نہ رکھتا تھا اور اس لیے اسے دیکھتے ہی کترا کر گزر جاتا تھا۔ خاموشیوں کے اس تبادلے سے پیدا ہونے والے دھوئیں سے پورے گھر کا ماحول گھٹن کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب اپنے اوپر لگنے والے الزام سے پوری عزت کے ساتھ بری الذمہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کے بری ہونے کے دوران زائرہ کے جو جرائم ثابت ہوئے تھے۔ وہ بے حد کڑے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔

"کاش! سب مجھے ہی بُرا سمجھتے رہتے۔ مگر زائرہ کی عزت تو بنی رہتی اور زائرہ کی عزت بنی رہتی تو ہی پورے گھر کی ناموس بھی پاکیزہ رہتی۔ مگر اب تو......اب تو......؟" اس کا دماغ غم و غصے سے پھٹنے لگتا۔

"کاش! کاش! وہ خبیث مجھے کہیں مل جائے۔ وہ تھا کون؟ یہی تو میں پتہ نہیں لگا سکا۔"

وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگتا۔

"اس ذلیل آدمی نے میرے گھر سے چین، سکون اور اس کی خوشیاں چھین لی ہیں۔ مجھے اگر اس کے بارے میں معلوم ہو جائے تو میں...... میں اس کا خون پی جاؤں۔" آج تو اسے بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا اس کے غصہ آنے کی وجہ بھی درست تھی وہ کیا کرتا اگر غم و غصہ نہ کرتا تو......وہ جس روز سے آیا تھا دیکھ رہا تھا سب سے زیادہ اُداسیاں اگر کسی کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں تو وہ ستارہ تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک جانے کہاں معدوم ہو گئی تھی۔ وہ اندر سے بے حد ٹوٹی اور بکھری ہوئی لگتی تھی۔ مگر اس نے اپنے خزاں رسیدہ وجود پر اک مسکراہٹ کی چادر ڈال رکھی تھی۔ باقی سارے تو شاید اس کی مسکراہٹ کو اس کی خوشحال ازدواجی زندگی کی سند گردانتے ہوں مگر زید سے اس کا حالِ دل نہاں نہیں تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ احمد کے اور اس کے درمیان کون سی خلیج حائل ہو چکی ہے اور دونوں دریا کے دو کنارے بنے کن اذیتوں سے دوچار ہیں۔ اس سے ستارہ کے چہرے کی ماند پڑتی شگفتگی برداشت نہ ہو رہی تھی۔ ایک دن جب وہ صبح کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس نے دیکھا ستارہ برآمدے میں بیٹھی تھی۔ سفید بڑے سے دوپٹے نے اس کے چہرے کو اپنے مقدس ہالے میں لیا ہوا تھا۔ وہ بھی ابھی نمازِ فجر سے فارغ ہوئی تھی۔ زید نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قریب چلا آیا۔

"صبح بخیر۔"

ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتا ہوا وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صبح بخیر۔" اس نے بھی مسکرا کر جواباً کہا۔

"چائے پیو گے؟"

"چائے؟" وہ کچھ سوچنے لگا۔

"ہاں......میں نانا جان اور نانو کی چائے بنانے جا ہی رہی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اچھا پھر ٹھیک ہے میرے لیے بھی بنا لیں۔" اس نے جواب دیا۔

"بلکہ چلو دونوں اکٹھے ہی کچن میں چلتے ہیں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"نہیں زید! تم یہاں بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" ستارہ نے اس سے یوں نظریں چراتے ہوئے کہا کہ زید کا دل سینے سے اُڑ کر اس کی مٹھی میں آ کر بھنچ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ ڈھیلا ہو کر وہیں رُک گیا۔ حالانکہ پہلے تو وہ دونوں اکثر کچن میں اکٹھے ہی کھڑے رہتے۔ ستارہ کچھ بھی بنا رہی ہوتی وہ اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی کھاتا رہتا تھا۔ وہ بات بے بات چٹکلے سناتا اور وہ ہنستی ہوئی اسے گھرکتی رہتی۔

"بس کروزید!"

"مت کرو۔"

"دیکھو مجھے زیادہ نہ ہنساؤ تمہیں پتہ ہے ناں میں زیادہ نہیں ہنس سکتی۔"

حالانکہ وہ کبھی قہقہہ نہیں لگاتی اپنی دھیمی سی ہنسی سے بھی اسے خوف آتا تھا۔

"کیوں...... کیوں نہیں ہنس سکتیں؟" وہ اسے کندھوں سے تھام کے پوچھتا۔

"میں جس روز زیادہ ہنسوں اس روز میرا دل بے حد اُداس رہتا ہے۔"

وہ وجہ بتا دیتی۔

"اور تمہاری آنکھوں سے پانی کیوں بہنے لگتا ہے ہنسنے پر۔" وہ اس کی گیلی آنکھوں کو چھو کر پھر پوچھتا۔

"پتہ نہیں...... لیکن کہتے ہیں جن لوگوں کے ہنستے ہوئے آنکھیں بھیگنے لگیں ان کے اندر دُکھ سہنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ جب انہیں زندگی آزماتی ہے تب وہ روتے نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں بھی آزمائی جاؤں گی۔" وہ اُداسی سے کہتی تو وہ ناراض ہو جاتا۔

"پاگل ہو تم تو۔ دماغ خراب ہے تمہارا۔ کوئی غم تمہیں چھو لے۔ میرے ہوتے ہوئے تو یہ نہ ہو سکے گا اور کوئی آزمائش تم پر پڑے۔ میں کیا مر گیا ہوں گا اس وقت۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ اس کے مرنے کا سن کر اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی اور کہتی۔

"اللہ میرے بھائی کو میری عمر بھی لگا دے۔" وہ اسے درازی عمر کی دعا دیتی۔ ستارہ تو اسے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اس کا بغیر اس کے زیادہ دیر گزارہ ہی نہ ہوتا۔ وہ ذرا کالج سے لیٹ ہوتا تو وہ اس کے موبائل پر دس ایس ایم ایس کرتی۔ شادی سے قبل تو اس نے کبھی زید کے بغیر کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ اور اب...... اب وہ ذرا اس کے قریب جاتا تو وہ کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے اُٹھ جاتی۔ جیسے وہ اب چائے بنانے چلی گئی تھی اور کیسی اجنبیت دکھانے کی وہ ناکام سی کوشش کرتی رہتی تھی۔

لیکن کیوں؟ کس وجہ سے؟

اس کی سوچوں میں پھر آگ لگ گئی اور وہ چائے کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا ستارہ کو اس کا یوں وہاں سے چلے آنا بُرا نہیں لگے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے وہ بھی چاہتی ہو۔



زائرہ کو بخار ہو گیا اور اتنا تیز بخار ہوا کہ ایک سو تین ایک سو چار سے کم ہی نہ ہونے پر آ

رہا تھا۔ ستارہ کا تو مارے پریشانی کے بُرا حال تھا۔ پہلے تو وہ خود ہی دوا بھی دیتی رہی اور سنبھالتی رہی مگر جب وہ بخار کی حدت میں ہذیان بولنے پر آ گئی تو وہ طاہرہ بیگم کی طرف لپکی۔

"نانو!" وہ ان کے پاس کھڑی تھی مگر کہنے سے جھجک رہی تھی۔

"جی نانو کی جان!" انہوں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی پشت سے کھینچ کر اپنے سامنے کر لیا۔

"نانو! وہ زائرہ کو بہت تیز بخار ہے۔" اس نے جلدی سے کہہ دیا کہ مبادا اس کی زبان اٹکنے لگے۔

"کب سے؟" طاہرہ بیگم کے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ اسے دیکھنے کی بجائے سامنے دیوار کو دیکھنے لگیں۔

"رات سے ہے نانو! پہلے تو کچھ کم تھا مگر اب ایک سو چار ہے اور کم نہیں ہو رہا؟" وہ بے حد پریشان تھی۔

"ڈاکٹر نذیر کو فون کر کے حالت بتا دو اور دوا لکھوا لو۔" انہوں نے اپنے دلی جذبات پر قابو پاتے ہوئے نارمل انداز میں کہا۔ (انہوں نے اپنے فیملی ڈاکٹر کا کہا تھا)

"نذیر انکل سے میں نے دوا پوچھ کر چاچا سے منگوالی تھی۔" اس نے گھر کے بوڑھے ملازم سے منگوا کر دی جانے والی دوائی کے بارے میں بتایا۔

"تو پھر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ دو۔ انا بی سے کہہ دو وہ اس کے پاس رہیں رات کو......" انہوں نے اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو سنبھال کر کہا۔

"نانو! اسے ہسپتال لے کر جانا چاہیے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔" وہ اپنی نانو کے گھٹنوں کے پاس بیٹھتی ہوئی پیار سے بولی۔

"ہسپتال...... اسے کون لے کر جائے گا ہسپتال؟" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"تمہارے نانا جان اور عمیس نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ وہ کمرے سے باہر نہ نکلے۔ کسی کے سامنے نہ آئے۔" وہ اپنی آواز میں پڑنے والی دراڑوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے کے لیے کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

"نانو! وہ ایک انسان ہے۔ حصہ ہے آپ کے جسم کا؟" اس نے آگے بڑھ کر اپنی نانو کے سامنے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور انہیں روک کر ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"وہ تڑپ رہی ہے نانو! کیا آپ کو درد نہیں ہو رہا؟" وہ ان کے ہاتھ تھامے پوچھ رہی

تھی۔ ان کے وہ ٹھنڈے یخ ہاتھ جو ہلکے ہلکے لرز رہے تھے اور ان کے دل کی ساری حالت صاف بتا رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ ان کی ہر دھڑکن زائرہ کی تکلیف کا سن کر بے چین ہے اور اس کی طرف دوڑ کر جانے کو مچل رہی ہے۔

”جاؤ ڈاکٹر نذیر کو دوبارہ فون کرو۔“

وہ پھر بھی اس پر اپنی کمزوری عیاں نہ ہونے دینا چاہتی تھیں۔

”نانو! آپ چلیں میرے ساتھ...... وہ آپ کا نام لے رہی ہے بار بار۔“ وہ انہیں ساتھ لے جانے کے لیے بضد تھی۔

”میرے جانے سے کیا ہوگا؟ اس کا بخار تو ڈاکٹر کی دوا سے ہی اُترے گا۔“ وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”نانو! اس پر غشی طاری ہے۔ سخت تکلیف میں مبتلا ہے وہ اور آپ؟“ اس نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ کھینچا۔

”وہ اس گھر میں موجود ہے اور اپنی زندگی کے دن یہاں گزارنے کی اجازت اسے مل گئی ہے۔ یہی اس کے لیے بہت ہے۔ اب محبتیں اور محبت کرنے والوں کی توجہ حاصل کرنا اس کے لیے شاید ممکن نہیں رہا۔“ طاہرہ بیگم نے اپنے چہرے پر سختی لاتے ہوئے کہا۔

”نانو! اِدھر دیکھیں۔ میری آنکھوں میں؟“ اس نے ان کا چہرہ اوپر کو اُٹھایا اور اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے ان کی آنکھوں میں یونہی اپنی آنکھوں کی گرفت میں لیے وہ انہیں ایک ٹک دیکھے گئی۔

”آپ کو اس سے اب بھی محبت ہے۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”میری محبت کو وہ اپنے جوتوں سے لگا کر اس گھر سے باہر لے گئی تھی اور جب وہ واپس لوٹی تو اس کے پاؤں ننگے تھے۔“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔

”آپ کو وہم ہے نانو! محبت کوئی گرد مٹی نہیں ہوتی جو جوتوں سے لگ جائے۔“ وہ پھر بھی ان کی آنکھوں کو جکڑے کھڑی تھی۔

”اچھا تم جاؤ اس کے پاس؟“ وہ اپنا چہرہ اس کی طرف سے پھیرنے کو تھیں۔

”آپ چلیں میرے ساتھ۔“ ستارہ نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ کھینچا اور اپنے کمرے میں لے گئی جہاں پچھلے نو روز سے زائرہ پڑی رو رہی تھی۔ ستارہ نے اسے ان دنوں کے لمحے لمحے میں مرتے اور جیتے دیکھا تھا وہ اسے ذرا دیر کے لیے بھی پُرسکون دکھائی نہ دی

تھی۔ وہ کئی بار اس کے پاس آئی تھی۔ آج کل کھانا بھی اسی کے ساتھ کھاتی اور اسے زبردستی دو چار نوالے کھلاتی تھی۔ وہ جو کبھی سر پر دوپٹہ نہ لیتی تھی۔ جائے نماز پر کھڑی بھی کبھی کبھی ہی نظر آتی تھی۔ اب تو سجدوں میں پڑتی تو سر اُٹھانا بھول جاتی تھی۔ اس روز جس سیاہ چادر میں واپس آئی تھی پندرہ روز گزر جانے کے بعد بھی وہی سیاہ چادر اس کا اوڑھنا بچھونا تھی وہ اپنے وجود کو اسی میں چھپائے رکھتی تھی۔ جس طرح سے وہ اپنے اللہ کے حضور جھکی سسکتی رہتی تھی اسے دیکھ کر ستارہ تڑپ جاتی تھی۔ اسے اپنے گھر والوں سے ایسے ناروا سلوک کی امید بھی نہ تھی جو وہ زائرہ کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس روز کے بعد سے کسی نے کبھی اس کے بارے میں بات تک نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے ملنے کوئی آیا تھا حتیٰ کہ ترنم بیگم نے بھی اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ دیا تھا۔ مگر آج تو وہ اپنی نانو کو کھینچ کر لے ہی آئی تھی۔

”یا اللہ! یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ معاف کر دے رب العالمین مجھے معاف کر دے۔“

طاہرہ بیگم نے دیکھا وہ آنکھیں موندے بے سدھ پڑی تھی مگر اس کے لب ہل رہے تھے۔

”میں نے سب کا دل دُکھایا۔
میں خطا کار ہوں۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔
میں کیا کروں؟
کیا کروں؟ کس طرح سے اپنے پیاروں کو مناؤں؟“

اس نے بولتے بولتے بے چینی سے کروٹیں بدلنی شروع کر دیں۔ اس کی پیشانی بھیگی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

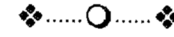
”امی! امی جان! میری امی جان!“ وہ اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔

ستارہ نے دیکھا طاہرہ بیگم بے قراری سے اپنے ہاتھ ملنے لگی تھیں۔ اس نے ہولے سے انہیں کندھوں سے تھام کر زائرہ کے پلنگ پر بٹھا دیا۔

”نانو! آپ اس کا خیال رکھیں میں ڈاکٹر انکل کو فون کرتی ہوں۔“

وہ جان بوجھ کر وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی۔ طاہرہ بیگم چپ بیٹھی تھیں وہ بھی خاموشی سے کمرے سے باہر چلی آئی تاکہ وہ انہیں زائرہ کے قریب ہونے کا موقع دے سکے۔ وہ سوچ رہی تھی یہ رشتے اور یہ محبتیں بھی اللہ نے عجب بنائی ہیں روٹھنے پر آئیں تو بلاوجہ کے لیے روٹھ جاتی ہیں پھر قربتوں کو فاصلے میں ڈھلتے دیر نہیں لگتی اور جب اپنوں کو غمزدہ پاتی ہیں تو بھی انہیں گلے لگانے میں دیر نہیں کرتیں۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہو گی

تو طاہرہ بیگم زائرہ کا سر اپنے زانو پر رکھے محبت سے اسے دبا رہی ہوں گی۔



''میاں صاحب!'' دوسری صبح طاہرہ بیگم جب نور محمد جیلانی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی تھیں تو انہوں نے بات شروع کر دی۔

''کہو میں سن رہا ہوں۔'' انہوں نے اخبار پر نظریں جمائے جمائے جواب دیا۔

''زائرہ بہت بیمار ہے۔'' وہ نرمی اور آہستگی سے بتا رہی تھیں۔

جواباً وہ بغیر کوئی جواب دیئے اخبار کے مطالعے میں مصروف رہے تو چند لمحوں کے بعد انہوں نے پھر سے کہا۔

''میاں صاحب! اپنی زائرہ بہت بیمار ہے۔ گزشتہ چار روز سے شدید بخار میں مبتلا ہے۔''

''اچھا تو ڈاکٹر کو بلا کر چیک اپ کرا دو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

''ڈاکٹر تو روز آ رہا ہے۔ دوائیں بھی تبدیل ہو رہی ہیں مگر کوئی افاقہ نہیں ہو رہا؟'' وہ انہیں حقیقتِ حال بتا کر اس کی سنجیدگی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''تو ہسپتال داخل کرا دو۔ لے جاؤ۔'' ان کے لہجے میں خالی خولی مشورہ تھا کوئی فکر مندی نہ تھی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسے اب ہسپتال ہی داخل کرانا پڑے گا۔ ورنہ خدانخواستہ......'' وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ آگے ان کی زبان لوچ کھا گئی تھی۔

''مرے گی نہیں ذرا سے بخار سے۔ تم خواہ مخواہ زیادہ فکر نہ کرو۔'' اب انہوں نے اخبار اپنی نظروں کے سامنے سے ہٹا کر اپنی سرد نگاہیں ان کے چہرے پر گاڑھ دیں جو ان کے چہرے سے سیدھی ان کے لہو میں پیوست ہو گئی تھیں اور اک کپکپا دینے والی ٹھنڈک ان کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی تھی۔

اتنی بیگانگی......

ایسی اجنبیت......

اور اس قدر کٹھور پن...... وہ بھی اپنی پوتی کے لیے...... جیلانی خاندان کی بچی کے لیے

بچیاں تو جیلانی صاحب کو بے حد عزیز تھیں۔ اپنی نواسیوں اور پوتیوں میں تو ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ بلکہ کبھی طاہرہ بیگم انہیں کسی بات پر ڈانٹیں یا سختی سے سمجھاتیں تو وہ ہنس کر کہا کرتے تھے۔

''کیا کرتی ہو طاہرہ! یہ تو آنگن کی چڑیاں ہیں کتنی دیر یہاں کا دانہ چگیں گی ذرا سی عمر کی دھوپ پڑی تو پھر سے اڑ جائیں گی۔ انہیں مت ڈراتی رہا کرو۔'' وہ انہیں اپنے ساتھ پیار

سے چمٹا چمٹا کر کہتے۔ اسی لیے تو لڑکیوں کو جب بھی کوئی بڑی فرمائش منوانی ہوتی تو وہ زید کے ذریعے میاں جی سے منظوری لے لیا کرتی تھیں اور طاہرہ بیگم کی پھر ایک نہ چلتی۔

''زید!'' انہیں فوراً ہی زید کا خیال آیا۔

''تو ٹھیک ہے میں اور ستارہ زید کے ساتھ اسے ہسپتال لے جائیں گے۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے زید کا نام لیا۔

''زید کو کس لیے...... چاچا ہے ناں اسی کے ساتھ جاؤ۔'' انہیں زید کے ساتھ جانے پر اعتراض تھا۔

''ہسپتال والوں کے سو نخرے اور سو بکھیڑے ہوتے ہیں ہم عورتیں کہاں پریشان ہوتی رہیں گی وہ ماشاءاللہ سے سب جانتا ہے منٹوں میں کروا لے گا۔''

اس بار انہوں نے میاں صاحب کے سپاٹ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات میں وزن ڈالنا چاہا۔

''زید نہیں جائے گا زائرہ کو لے کر۔'' وہ اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

طاہرہ بیگم دیکھ رہی تھیں ان کے چہرے پر اندر کے درد کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔

''اس لڑکی نے اس معصوم کو پورے خاندان میں کیسا رسوا کر کے رکھ دیا۔ کیسا گھناؤنا الزام لگایا اس کے صاف کردار پر اور تم کہتی ہو کہ وہ اپنی ذلت کو بھلا کر پھر سے اسے...... نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ زید کا نام بھی مت لینا۔ وہ نہیں جائے گا کہیں بھی۔'' ان کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''تو ٹھیک ہے کوئی اسے ہسپتال نہیں لے کر جائے گا۔ بلکہ کوئی دوا بھی نہیں لائے گا اس کی مرتی ہے تو مرنے دیں۔ آخر کو لڑکی ہے۔ لڑکیاں تو یوں بھی دوسرے درجے کی مخلوق ہوتی ہیں اور یہ تو خطا کار ہے۔ لہٰذا ناقابل معافی مجرم ہوئی۔ اس کی یہی سزا ہے کہ وہ ایک کونے میں پڑی سڑتی رہے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں اسے موت ہی آ لے تو اچھا ہے۔ جیلانی خاندان کے ماتھے کی کلنک تو دھلے۔''

آج طاہرہ بیگم بھی بول ہی پڑیں اور وہ سب کچھ کہہ گئیں جو وہ کبھی بھی اپنے شوہر کے سامنے کہنے کا سوچ نہ سکتی تھیں۔

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہی بہتر ہو گا سب کے لیے۔'' میاں جی نے بھی غصے میں جواب دیا اور چائے کا کپ پیئے بغیر وہاں سے چلا ہے۔

''نانا جان! چائے تو پی لیں۔'' ستارہ جو ابھی چائے کی ٹرے لے کر آئی تھیں

انہیں یوں غصے میں جاتا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''نانو! کیا ہوگیا نانا جان کو چائے بھی نہیں پی کر گئے۔'' ان کے جواب نہ دینے پر ستارہ کو اپنی بھی فکر لاحق ہوگئی۔

''کچھ نہیں ہوا انہیں۔ بلکہ کسی کو بھی کچھ نہیں ہوا۔ بس ہمارے مقدروں پر سے ہی اللہ کی رحمت کا ہاتھ اُٹھ گیا ہے۔ خدا جانے ہمارے کن بُرے کاموں کی یہ سزا ہے۔'' وہ مارے غم کے رونے لگیں۔

''نانو! نانو! آپ نہ روئیں۔ چپ کریں۔ بس کریں۔'' وہ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر انہیں چپ کرانے لگی۔

''کیا کروں؟ تم ہی کہو میں کیا کروں؟'' انہوں نے بے بسی سے ستارہ کے ہاتھ تھام لیے۔

''اب سکت کہاں ہے میرے شکستہ وجود میں کہ ایسے صدمے سہہ سکوں۔''

وہ اس وقت چہرے سے ہی نہیں بلکہ اپنے پورے وجود سے ستارہ کو ضعیف دکھائی دے رہی تھیں۔

''اللہ بڑا مہربان ہے نانو! وہ اپنے پیاروں کو ان کی قوتِ برداشت سے بڑے غم نہیں دیتا۔ نہ ہی ان کی استطاعت سے بڑھ کر آزمائش کا بوجھ ان پر ڈالتا ہے۔'' وہ انہیں پیار سے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دے رہی تھی۔

''اللہ ہم گناہ گاروں کو معاف کردے۔ ہم پر رحم کرے۔'' وہ سسک رہی تھیں۔

''اللہ ہی تو انسان کا سب سے بڑا غمخوار ہے۔ وہ ہمارے زخموں کی مسیحائی ضرور کرے گا۔'' وہ اپنی نانو کے کانپتے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹے بڑے حوصلے سے کھڑی تھی۔

''ستارہ! میری بچی! اللہ سے دعا کرو سب کچھ ٹھیک کر دے۔ پہلے جیسا......'' وہ ایک چھوٹے بچے جیسی معصومیت سے خواہش کر رہی تھیں۔

''اللہ! پہلے سے بھی بڑھ کر خوشیاں اور سکون ''جیلانی ہاؤس'' کے آنگن میں بکھیر دے گا بس آپ اس پر بھروسہ رکھیں۔'' وہ ان کے آنسو صاف کر کے انہیں پیار کرتی ہوئی بولی۔

''اپنے نانا کو بھی سمجھاؤ بیٹی! وہ تو اپنا دل نفرت سے بھرے بیٹھے ہیں۔'' طاہرہ بیگم دراصل اندر ہی اندر یہی دُکھ کھائے جا رہا تھا کہ میاں جی نے زائرہ کے معاملے میں اتنا سخت رویہ کیوں اپنا لیا۔ بجائے دوسرے بچوں کو سمجھانے کے وہ خود کیوں اس کے لیے پتھر گئے۔ حالانکہ خود طاہرہ بیگم نے بھی کئی روز تک اس کی طرف سے اپنے دل کے دروازے

قفل لگائے رکھے تھے۔ مگر وہ جانتی تھیں انہوں نے ایسا کس اذیت ناک کیفیت سے دوچار رہ کر کیا تھا۔

''میں نانا جان سے بات کروں گی آپ فکر نہ کریں نانو!'' ستارہ تو پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ اب وہ اپنے نانا سے بھی زائرہ کے لیے بات کرے گی اور انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ زائرہ کو معاف کر دیں اور جو کچھ ہوگیا اسے بھلا دیں۔

''مجھے یقین ہے نانا جان میری بات کو سمجھیں گے اور اسے معاف کر دیں گے۔''

وہ اپنی اس محبت کے بھروسے پر یہ یقین رکھتی جو اس کے نانا جان کو اس سے تھی اسی لیے وہ اپنی نانو کو بھی تسلیاں دے رہی تھی۔

''اچھا اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟''

وہ اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتی ہوئیں زائرہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

''پتہ نہیں کیوں بخار نہیں کم ہو رہا۔ بلکہ رات سے تو اسے پیٹ میں درد کی بھی شکایت ہے۔'' وہ ان کے ساتھ بیٹھتی ہوئی بتانے لگی۔

''پیٹ میں درد......'' وہ اور بھی پریشان ہوگئیں۔

''خدا خیر کرے۔ بس ذرا دن چڑھنے دو پھر اسے ہسپتال لے کر چلتے ہیں۔''

❖......○......❖

''تارہ آپی! مجھے بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔'' وہ اپنے پیٹ کی طرف کو دونوں ہاتھوں سے دباتی ہوئی دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

''بس...... بس میری جان! ذرا سی دیر رُکو رمضان چاچا آ رہے ہیں پھر چلتے ہیں ہسپتال۔'' وہ اسے اپنی بانہوں میں بھرتی ہوئی بولی۔

''آپی! بہت درد ہے۔'' اس کا چہرہ نیلا پڑ رہا تھا۔

''کہاں...... کہاں درد ہے؟'' وہ اس کے پیٹ پر نرمی سے ہاتھ پھیرتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

''یہاں...... اُف...... میرے اللہ! میں کیا کروں؟'' وہ اس کا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھتی ہوئی شدت درد سے بلبلا اُٹھی۔

''میں...... میں ذرا ڈاکٹر انکل کو تو بتاؤں۔'' ستارہ نے اپنے موبائل پر ڈاکٹر نذیر احمد کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی تھی۔ وہ اکیلی کرتی بھی کیا۔ انانی

بھی اس وقت کمرے میں نہیں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اس نے زائرہ کی کیفیت بتائی تو وہ پریشان ہو کر بولے۔

''بیٹی تارہ! اب ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر اسے ایمرجنسی وارڈ میں شفٹ کرو مجھے ڈر ہے کہ اس کا اپینڈیکس پھٹ نہ جائے۔''

''جی...... کیا کہا آپ نے؟'' اس کے تو ہاتھوں سے جان ہی نکل گئی اپینڈیکس کا سن کر۔

''انکل! اسے یہ اتنا شدید درد اپینڈیکس کا ہو رہا ہے؟''

''ہاں یہ اپینڈیکس ہی ہو سکتا ہے مجھے سو فیصد یقین ہے۔ بس تم لوگ دیر مت کرو ذرا سی دیر بھی معاملے کو بے حد سنجیدہ کر سکتی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بے حد فکر مند تھے۔ وہ فون بند کر کے نانو کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہاں نانو سے زیادہ اس کے نانا جان پریشان ہو گئے۔

''فٹافٹ کرو بیگم اُٹھو جلدی سے......'' وہ پیروں میں چپل اٹکاتے ہوئے ستارہ کے کمرے کی طرف لپکے جہاں زائرہ تڑپ رہی تھی۔

''رمضان سے کہو گاڑی نکالے۔'' باہر نکلتے ہی انہیں احمد مل گیا تو وہ اسے دیکھتے ہی بلند آواز سے بولے۔ ''اور زید سے کہو فوراً میرے ساتھ آئے۔'' انہوں نے جاتے جاتے مزید کہا اور ستارہ کے پُرانے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اگلے آدھے گھنٹے کے بعد زائرہ ہسپتال میں تھی۔ گھر سے باہر آ کر مال روڈ پر آج انہیں ایک ٹریفک جام کی اذیت ناک آزمائش سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ اُدھر زائرہ کا رنگ درد کی شدت سے نیلا پڑتا جا رہا تھا اور دوسری جانب نور محمد جیلانی کے چہرے پر پوتی کی حالت دیکھ دیکھ کر زردیاں چھا رہی تھیں۔ وہ بار بار گاڑی سے باہر نکل کر آگے جام ہوئی گاڑیوں کی لمبی قطار کو دیکھتے اور بے چینی و بے بسی سے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔

''ستارہ! تم اسے سونے نہ دینا۔'' وہ زائرہ پر طاری ہوتی غشی دیکھ دیکھ کر گھبرا رہے تھے۔

''مجھے بچا لیں دادا جان! میں مر رہی ہوں۔'' زائرہ نے اپنی نیم وا آنکھوں سے ان کی طرف التجا سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کچھ نہیں ہو گا میری بچی! تجھے کچھ نہیں ہو گا۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگے۔

''مجھے معاف کر دیں دادا جان!'' اس کے نیلے کانچ ہوئے چہرے پر بلا کی شرمندگی تھی ''میں آپ کی ناراضگی کا بوجھ لے کر مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ اٹک اٹک کر بمشکل بول رہی تھی۔

''خبردار...... اگر اُلٹے سیدھے الفاظ منہ سے نکالے تو۔'' انہوں نے اس کے کانپتے ہاتھ تھام کر اپنے چہرے کے ساتھ لگا لیے۔ تب اس نے اپنی بند ہوتی پلکوں کو بمشکل اُٹھا کر انہیں ذرا سا دیکھا اور اس کے مُردہ ہوتے لبوں پر زندگی کی آخری ہچکی جیسی اک لکیر کھنچ گئی۔ جیسے وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو اس نے اپنے دادا کے ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچا جیسے انہیں عقیدت سے اپنی آنکھوں کے ساتھ لگانا چاہتی ہو۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو گئی۔

''ستارہ! دیکھو اسے...... دیکھو کیا ہو گیا اسے۔''

وہ زور سے چلائے۔ فرطِ غم سے ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''زائرہ! زائرہ! آنکھیں کھولو۔ ہوش کرو۔'' ستارہ نے اس کے گالوں پر اپنے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ مگر وہ تو بے سدھ و بے حس ہو چکی تھی۔



وہ سچ مچ موت کے منہ میں آ گئی تھی۔ اپینڈیکس کے پھٹ جانے سے اس کے اندر زہر پھیل چکا تھا اور اس کی زندگی سے زیادہ اس کی موت کے سائے گہرے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹرز اپنی کوششوں میں ضرور مصروف تھے مگر انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔ یہ خبر جیلانی خاندان کے ایک ایک فرد تک پہنچ چکی تھی اور ہر ایک پریشان ہو کر ہسپتال آتا جا رہا تھا۔

''اندر سے کوئی خبر آئی؟''

شاہانہ کے بعد اب شبانہ آئیں تو آتے ہی ماں سے پوچھنے لگیں۔

''بس تم دعا کرو۔'' اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے پریشانی سے بولیں۔

''یہ ہوا کیسے؟'' معاذ صاحب نے انیس میاں سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس پیٹ میں درد تھا۔'' وہ مختصر بولے۔

''کیا ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تھا کیا اپینڈیکس تشخیص نہیں ہوا تھا؟'' وہ پھر پوچھ رہے تھے۔

''نہیں......'' انیس میاں نے اور بھی مختصر جواب دیا۔ باقی اور کئی سوال معاذ ان سے کرنا چاہتے تھے مگر اس وقت وہاں پر طاری گھمبیر سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ایک طرف چپ کر کے کھڑے ہو گئے۔

''اماں جان! ترنم بھابی نظر نہیں آ رہی ہیں۔'' کچھ دیر بعد شبانہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... وہ اسے نہیں بتایا کہ زائرہ حالت اتنی خراب ہے۔''

طاہرہ بیگم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''اماں جان! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' اس بار شبانہ سے زیادہ شاہانہ کو حیرانگی ہوئی۔

''بس وہ چھوٹے دل کی ہے ناں۔ خواہ مخواہ صدمہ لے بیٹھتی اس لیے اسے نہیں بتایا۔'' طاہرہ بیگم نے بات بنائی۔

''آخر پتہ تو چلے گا ہی۔'' شبانہ نے دھیرے سے کہا۔

''ابھی بتا دیں تو اچھا ہے۔ اچھا ہے آ کر بیٹی کو دیکھ لیں۔ دعا کریں ماؤں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔'' شاہانہ نے اپنے طور پر تو مشورہ ہی دیا تھا مگر اس میں جانے کیوں ہلکے سے طنز کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ اب آئی بھی تو کوئی مہینہ بعد تھیں۔ جب سے زید کے زائرہ کو اس ''میسج'' کے کھلنے والا معاملہ ہوا تھا وہ اپنے میکے نہیں آئی تھی بلکہ معاذ نے انہیں آنے ہی نہ دیا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنے سسرال سے نالاں ہوئے تھے اور بہت ہی زیادہ ہو گئے تھے۔

''وہ ماں ہے دعائیں ہی کر رہی ہو گی۔ تم لوگ بھی اس کی زندگی کے لیے دعا کرو۔ میری بچی موت کے دہانے میں ہے۔'' طاہرہ بیگم نے اپنی دونوں بیٹیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا اور خود تسبیح کرتی ہوئی ایمرجنسی وارڈ کے اس حصے کی جانب چل دیں جہاں نماز پڑھنے کی جگہ تھی۔ نور محمد جیلانی وہاں پر پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو ہولے ہولے گرا رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے عجیب سے درد کی شدتیں جھانک رہی تھیں۔

''وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جائے گی۔'' طاہرہ بیگم نے ان کی آنکھوں سے ان کی اندرونی کیفیات پڑھتے ہوئے انہیں تسلی دینے کے لیے اپنے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''بے شک اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

ان کی داہنی طرف زید بھی چپ چاپ بیٹھا ہوا ایسی ہی کیفیات کا شکار تھا۔ وہ بھی زائرہ کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔



''عمیس! اٹھیں اللہ کے واسطے ہسپتال چلیں۔'' ترنم بیگم کب سے ان کی منتیں کر رہی تھیں۔

''اللہ کے واسطے عمیس! اُٹھیں۔ چلیں میری بچی مرنے والی پڑی ہے۔'' وہ روتے ہوئے انہیں ہاتھ پکڑ کر اُٹھا رہی تھیں۔

''میں نے کہاں تم چلی جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گا۔ مر جائے وہ میں تو اس کی میت پر بھی نہ جاؤں گا۔'' وہ غم و غصے سے بولے۔

''اللہ نہ کرے عمیس! اس کی زندگی کی خیر مانگیں۔'' وہ شوہر کے اس کٹھور پن پر تڑپ

گئیں۔

''میں نے کہہ دیا ناں کہ مجھ سے بحث نہ کرو اور جاؤ یہاں سے۔''

عمیس بدستور غصے میں تھے۔ ترنم بیگم نے دیکھا ان کے چہرے پر غصے کی سیاہی سے بھی تر یادہ غم کا اندھیرا گہرا تھا۔

''وہ بیٹی ہے ہماری...... اور پھر آپ کی تو وہ بے حد لاڈلی تھی۔'' وہ انہیں ان کی وہ محبت یاد کرا رہی تھی جو انہیں زائرہ کے ساتھ تھی۔

''تب وہ زندہ تھی اور سنو!'' وہ منہ پھیر کر بولے۔

''میرے لیے تو وہ اسی رات مر گئی تھی جب پولیس کے ساتھ گھر واپس آئی تھی۔'' انہوں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

میں نے اسی رات اسے دفنا دیا تھا۔ تم جاؤ اور اب جا کر اس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔'' انہوں نے برف جیسے لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔ ترنم بیگم وہیں صوفے پر گر کے سسکنے لگیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے عمیس کو سمجھائیں کہ وہ اسے معاف کر دیں۔ اولاد جیسی بھی ہو والدین کو گلے لگانی ہی پڑتی ہے البتہ اولاد کے دُکھ والدین کو جیتے جی مار دیتے ہیں۔ وہ اپنا دل ٹٹول رہی تھیں جس میں زائرہ کے دیئے ہوئے دُکھ کے سوا اب کچھ بھی نہ تھا۔ یقیناً یہ حالت اندر سے عمیس میاں کی بھی تھی۔ وہ بھی تو اس روز سے کمر جھکا کر چلنے لگے تھے ان کا سارا طمطراق خاک ہو چکا تھا اور ان کے چہرے کا جلال راکھ ہوتی چنگاری کی طرح تھا جس میں تو خود جلنے کی استطاعت بھی باقی نہ تھی بھلا وہ دوسروں کو کیا جلاتی۔

''رمیض! رمیض!'' ترنم بیگم نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے رمیض کو آوازیں دیں۔

''جی امی جان!'' وہ دوسری آواز پر حاضر ہو گیا۔ کچھ تو وہ یوں بھی وہیں اپنی ماں کے کمرے کے باہر لیونگ میں موجود تھا اور دوسرے اس کی عادت بھی تھی کہ وہ والدین کی آواز سنتے ہی ہر کام چھوڑ کر ان کی طرف لپکتا تھا۔

''رمیض بیٹا گاڑی نکالو۔'' وہ الماری میں سے اپنی چادر نکالتی ہوئی بولیں۔

''امی جان! میں؟'' اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے گاڑی نکالنے کو کہا ہے۔

''ہاں تم......'' انہوں نے سختی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگیں۔

''چھوٹے نہیں ہو اب تم...... باپ کے کندھے سے کندھا جڑنے لگا ہے تمہارا اپنے اوپر کچھ ذمہ داریوں کو محسوس کرو۔''

وہ قدرے بلند آواز میں کہہ رہی تھیں اور یقیناً اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ اس وقت وہ عمیس کے گوش گزار بھی یہ بات کرنا چاہتی تھیں کہ رمیض اب جوان ہو چکا ہے اور اس کا کام ہر وقت کتابوں میں سر دیئے رکھنا نہیں ہے۔ اور دوسرے معنوں میں وہ عمیس کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھیں کہ وہ ابھی سے اپنے کندھے نہ جھکائیں وہ ایک جوان بیٹے کے باپ ہیں جوان کی ہمت ان کا بازو بننے کے قابل ہو چکا ہے۔

"امی جان! گاڑی کی چابی تو......؟" رمیض نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم باہر چلو میں چابی لے کر آتی ہوں۔" ترنم بیگم نے عمیس کی سٹڈی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ عمیس ان کے ساتھ جھگڑا کر کے ابھی سٹڈی روم ہی گئے تھے۔

"جی بہتر امی جان!" رمیض اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بڑا تو وہ خود کو پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ہی دیکھ رہا ہے مگر امی جان کو آج ہی ایسا کیوں نظر آیا؟



زائرہ کا آپریشن جاری تھا پھر بھی وہ زندگی کی طرف لوٹتی نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کے خون میں شامل زہر کی مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے کیس اُلجھ گیا تھا۔ اسے خون کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا خون کا گروپ اونیگٹو (O Negtive) تھا اور اس وقت ہسپتال کے بلڈ بنک میں یہ گروپ موجود نہ تھا۔ آپریشن تھیٹر سے بار بار پیغامات آ رہے تھے۔ "خون کا جلد انتظام کرلیں۔"

معاذ میاں، انیس میاں نے سب بچوں کے بلڈ گروپ پتہ کر لیے تھے اور بچوں کو اپنے اپنے دوستوں سے بھی بلڈ گروپ معلوم کرنے کا کہہ دیا تھا۔

"دیکھیں جی! اگر دس پندرہ منٹ میں خون کا انتظام نہ ہوا تو مریض کا بچنا ناممکن ہو جائے گا۔" نرس نے اس بار تھیٹر سے باہر آ کر ذرا غصے ہی سے کہا تھا۔

"چلیں خون کہاں دینا ہے۔" زید نے نرس کو واپس تھیٹر جاتے دیکھ کر کہا۔

"کیا آپ کا بلڈ گروپ O Negtive ہے؟" اس نے زید کو غیر یقینی نظروں سے گھور کے دیکھا۔

"جی......" وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تو پھر اتنی دیر سے چپ کیوں کھڑے تھے؟" معاذ میاں نے ایک تیکھی سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا ان کے لہجے میں بھی ایک کاٹ تھی جسے زید کے علاوہ میاں جی نے بھی محسوس کیا۔

"جلدی آئیں۔ آپ کا بلڈ کراس میچ کرنا ہوگا۔" وہ نرس، زید کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

"چلیں شاہانہ!" معاذ نے فوراً ہی یوں کہہ دیا کہ سب ہی چونکے۔

"کیا ہوا معاذ بیٹا! کیا آپ کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے؟" طاہرہ بیگم نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ بی بی جان! جی...... جی میری ایک بہت اہم میٹنگ ہے۔ بتایا تھا میں نے شاہانہ کو۔" انہوں نے شاہانہ کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے اپنی بات کی تائید چاہتے ہوں۔

"جی...... جی امی جان!" وہ بھی فوراً ہی بولیں۔

"تو ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اللہ سے خیر مانگو۔ میں تمہیں فون کر دوں گی۔" طاہرہ بیگم نے بیٹی کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"میں رُک جاتی ہوں معاذ! آپ جایئے؟" شاہانہ کا دل بہرحال بھتیجی کو اس حال میں چھوڑ کر جانے پر تیار نہ تھا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولے اور پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔ طاہرہ بیگم ہی کیا وہاں موجود سب لوگ معاذ کے اس کھردرے رویے کی وجہ جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بُرا نہ منایا ویسے بھی یہ وقت کسی اور بات کے سوچنے کا نہ تھا۔ یہ وقت تو فقط دعائیں کرنے کا تھا۔ زائرہ کی زندگی کی خیریت مانگنے کا تھا۔ سبھی اس کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔

اندر زید کے خون کا کراس میچ ٹیسٹ ہو چکا تھا۔ اسے وہیں ایک بیڈ پر لٹا لیا گیا تھا اور خون اس کی رگوں سے نکل کر براہ راست زائرہ کی رگوں میں جا رہا تھا۔

"تمہاری مدد تو دور کی بات ہے تم سے تو میں کبھی دعا بھی لینا پسند نہ کروں بھلے موت کے منہ میں لٹکی ہوئی ہوں۔" اسے زائرہ کی ایک بار کی کہی ہوئی بات اس وقت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جب اسے میتھس میں کچھ پرابلم آ رہے تھے تو زید نے کہا تھا وہ چاہے تو زید اسے یہ اسباق سمجھا سکتا ہے۔ تب وہ کیسے گردن اکڑا کر بولی تھی۔ جواباً وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"دیکھ لو زائرہ بی بی! کبھی کبھی قدرت ہمیں ایسی سچوئشن میں مبتلا کر دیتی ہے کہ ہمیں اپنے کہے پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔"

"یعنی سیدھا سیدھا یوں کہو کہ تکبر میں اپنا تھوکا ہوا مجبوری میں چاٹنا بھی پڑتا ہے۔" تب سالار نے شرارت سے کہا تھا اور زائرہ مزید چڑ گئی تھی۔

"مر جاؤں گی مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔" اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی

تھی۔ مگر آج...... آج وہ کس طرح سے بے بس پڑی تھی۔ موت اپنے نوکیلے پنجے اس کی روح میں گاڑھنے کو مچل رہی تھی اور وہ زندہ رہنے کے لیے اس بے رحم کے ساتھ جنگ کر رہی تھی۔

"یا اللہ! اسے زندگی عطا کر دے۔ ایک صحت مند زندگی۔" اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی تھی۔ وہ بہت بڑے دل والا تھا۔ ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی زندگی یا موت سے بے پروا اپنی پیٹھ موڑے کھڑا ہوتا اور یقیناً یہی سوچتا کہ "اچھا ہوا اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ اُتارنے کے لیے اسے بے بس کر کے ڈال دیا۔" مگر وہ تو اس کے برعکس سوچ رہا تھا۔

"یا اللہ اسے معاف کر دے۔ میں نے بھی اسے معاف کر دیا اور اسے کسی آزمائش میں نہ ڈالنا۔" وہ زید کے دل سے نکلی ہوئی دعا تھی یا اس کی دادی کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی التجا یا پھر اس کے دادا جان کی اپنے رب کے حضور ڈالی ہوئی عرض۔

یا پھر اس کی ماں کی عرش کو ہلا دینے والی سسکیاں۔

جو بھی تھا اس کی منظوری رب کائنات کے ہاں ہو چکی تھی۔

"مبارک ہو۔ مبارک ہو سر! پیشنٹ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے۔" آپریشن کے بعد زخم کو ٹانکے لگاتے ہوئے ایک سرجن کی پُرمسرت آواز زید کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔

"اوہ یس...... تھینکس گاڈ......" یہ دوسرے سرجن کی آواز تھی جو اس کی بحال ہوئی سانس کو دیکھ رہا تھا۔

"شکر الحمدللہ! میرے مالک تیرا شکریہ......" زید کے دل نے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہوئے کہا۔

"بے شک تُو ہی ہے بے نیاز...... اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

اس کے لب ہولے ہولے ہلنے لگے اور لہو میں خوشی لہریں لینے لگی۔ جبکہ اس کی پلکوں پر سے دو شفاف موتی چپکے سے ڈھلک گئے۔ اس کے ظاہر و باطن جیسے صاف و شفاف موتی۔

❖......O......❖

ڈی ایس پی عبدالمالک کے موبائل کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور وہ سننے کے باوجود اپنا موبائل نہ اُٹھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فون بج بج کر خود ہی خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے سیل فون کو سامنے میز پر رکھے ہوئے جانے کن خیالات میں گم تھا۔

"عبدل! عبدل! بیٹا کہاں ہو تم؟" وہ آج گھر پر ہی تھا اس لیے اس کی امی جان اسے آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھیں۔ آج وہ آفس نہ گیا تھا اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔

"خیر تو ہے بیٹا! موبائل کب سے بج رہا ہے سن کیوں نہیں رہے ہو؟" وہ پریشان ہو کر

پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں امی جان! آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسے ہی غیر ضروری فون ہے۔ کوئی رانگ نمبر ہے اور تنگ کر رہا ہے۔" اس نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی رانگ نمبر تمہیں تنگ کر رہا ہے اور تم اسے نظر انداز کر رہے ہو۔ یہ تو بڑی اچنبھے کی بات ہے۔" وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی ہلکا سا مسکرائیں۔

"امی! آپ چھوڑیں ان باتوں کو اور بتائیں مہ رُخ کب آ رہی ہے؟" وہ اپنی بہن کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"مہ رُخ تو بس پہنچنے ہی والی ہے۔ تم اُٹھو اور جا کر بازار سے کچھ چیزیں لے آؤ۔"

وہ اسے بازار بھیجنے کے لیے ہی آئی تھیں انہیں کچن میں کچھ چیزوں کی ضرورت تھی وہ عبدالمالک سے وہ منگوانا چاہتی تھیں۔

"جی امی جان!" وہ بنا مزید سستی کیے اُٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مہ رُخ آ گئی تو وہ بازار نہ جا سکے گا۔ وہ اتنے دنوں کے بعد آ رہی تھی اس لیے اس نے آتے ہی اس کا سر کھانا شروع کر دینا تھا۔

"بھائی! ایسا ہوا؟ بھائی ویسا ہوا؟

میں نے یہ شاپنگ کی؟ یہ کتاب خریدی؟ وہ مووی دیکھی، میری ساس اتنی اچھی ہیں۔ میری نند کا تو جواب نہیں۔" آج کل وہ اپنے سسرال والوں کی خصوصاً ایک عدد غیر شادی شدہ نند کی تو بہت ہی تعریفیں کرتی تھی۔

دراصل وہ عبدالمالک کا ذہن اپنی نند کے لیے بنانا چاہتی تھی۔

"اُف بھائی! میں کیا بتاؤں ماہم کتنا اچھا پزا بناتی ہے۔" وہ اپنی نند کا نام لے کر اس کی پسندیدہ چیز کی تعریف کرتی۔

"پاگل ہے بالکل ہی۔" وہ اپنی بہن کو یاد کر کے مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ سوسائٹی کا ڈیپارٹمنٹل سٹور ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا اس لیے وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔

"ماہم!" خوامخواہ ہی ایک نام اپنے پورے حلیے سمیت اس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔

دراز قد، دراز گیسو، گوری رنگت، دلکش نقوش، گریجویٹ سب کچھ تو ٹھیک تھا۔ ماہم کسی بھی ذی ہوش کو پسند آ سکتی تھی۔ یہی سب کچھ تو مرد سوچتے ہیں کہ لڑکیوں میں ہو۔

لیکن پھر بھی وہ عبدالمالک کے جی میں کھب نہ رہی تھی اور جو جی میں نہ کھب سکے وہ

زندگی کے لیے پیام مسرت کیسے ہوسکتی ہے۔ جب جی ہی راضی نہ ہوا تو پھر خوشی کہاں سے نمو پائے گی۔

اس نے اپنے دماغ میں آنے والے خیالات کو جھٹکا۔

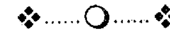
"تو آخر یار تمہیں کیسی جیون ساتھی درکار ہے؟" اس کے دل نے آج بُرا منا لیا تھا۔ وہ بھی کیا کرتا یہ عبدالمالک تو اس کے در و دیوار پر کسی بھی تصویر کو آویزاں ہونے ہی نہ دے رہا تھا۔

"دیکھیں گے جب وقت آئے گا۔"

اس نے لاپروائی سے سوچا۔

"وقت تو کب سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور جناب کے حواس پر دستک دے رہا ہے کوئی وجہ ہو تو معلوم ہو کہ محترم عبدالمالک صاحب آپ کی شادی کی آئیڈیل اور سنہری عمر نوجوانی کی دہلیز پر زیادہ دیر رُکی نہ رہے گی۔" اس کے اندر سے آج اس کی اچھی خاصی لتاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی۔

"اچھا...... اچھا میں ابھی بوڑھا نہیں ہو رہا۔ کمال ہے یار! عمر کے صرف چھبیسویں سال میں تو ہوں ابھی۔" اس نے اپنے اندر کو جھڑکا اور ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہو گیا۔ اس نے امی جان کے بتائے ہوئے سودے کے علاوہ مہ رُخ کی پسند کی بھی تو چیزیں لینی تھیں۔ اس نے چپس اور سلانٹی کے کئی پیکٹوں کے ساتھ ساتھ چاکلیٹ بھی پیک کرنے کو کہا۔ "بچی ہے ابھی تک......" وہ دکاندار کے دیئے ہوئے شاپر ہاتھ میں لیتے ہوئے مسکرا دیا۔



زائرہ کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ وہ پورا ایک ہفتہ ہسپتال رہ کر گھر واپس آ رہی تھی۔

"سنیں جی! اگر آپ اجازت دیں تو زائرہ......؟" ترنم بیگم نے عمیس میاں کا اچھا موڈ دیکھ کر بات شروع تو کر لی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی بات مکمل کرنے کی ہمت نہ پا سکیں۔

"کیا زائرہ؟" عمیس میاں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے انہیں گھورا۔

"بچی ہے۔ آپ معاف کر دیتے تو......؟" ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"معاف کر دوں اپنی عزت کا خون کروا کے اسے معاف کر دوں؟" غصے کے باوجود آج ان کا لہجہ بلند نہ تھا۔

"میں تو بس اتنا کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آ جائے تو...... بیمار ہے وہ اسے آرام کی ضرورت ہے۔" ترنم بیگم ڈرتے ڈرتے بھی بات کر رہی تھیں۔

"بیمار ہے تو میں کیا کروں؟ مر جاتی تو اچھا ہوتا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اللہ نہ کرے۔ عمیس! آپ اسے مرنے کی بددعا تو نہ دیں۔" وہ تڑپ کر بولیں۔

"اس کی عمر درازی کے لیے نوافل مانو تم...... اب میرے لیے تو اس کا زندہ رہنا یا مر جانا ایک برابر ہے۔" وہ غصے سے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے باہر چلے گئے اور ترنم بیگم اپنے آنسو چھپانے کو جھک کر اِدھر اُدھر کی چیزیں سمیٹنے لگیں وہ جانتی تھیں عمیس نہیں مانیں گے پھر بھی ان کی ممتا کو قرار نہ آ رہا تھا وہ کیا کرتیں؟ اپنے دل کے گوشے کو دل سے کاٹ کر کیسے پھینک دیتیں۔

"امی جان!" ردا نے ماں کو آواز دی۔ وہ ابھی ابھی اپنے والدین کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی تھی۔

"امی جان!" وہ اپنی ماں کے قریب آ گئی۔

"ہوں...... کیا ہے؟" ترنم بیگم نے سر جھکائے جھکائے ہی اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب۔

امی جان! میں نے آپی کا کمرہ صاف کروا دیا ہے۔" وہ ماں کو کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ جس پر ترنم بیگم سسک اٹھیں۔

"اس بدنصیب کا کمرہ اب اس گھر میں شاید کہیں بھی نہیں ہے۔"

"ایسے نہ کہیں امی جان!......" اس نے ماں کو اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں کرتی ہوں ابا جان سے بات...... آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے ماں کو تسلی دی۔

"تم...... تم کیا بات کرو گی ان سے؟" وہ اور بھی پریشان ہو گئیں۔

"آپ دیکھیں تو سہی...... میں ان کو کیسے راضی کرتی ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی اور ماں کو تسلی دے کر اپنے ابا جان کے کمرے میں چلی گئی۔



"ابا جان! میں نے آپ سے ایک درخواست کرنی تھی۔" وہ عمیس میاں کے پاس آ کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔

"مجھ سے کیا بات کرنی تھی؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گئے۔

"ابا جان! آپی نے جو کیا وہ ہرگز بھی اچھا نہیں تھا۔ ان کی غلطی قابل سزا ہے اور سزا انہیں مل چکی ہے۔ وہ سچے دل سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں وہ بڑی دکھی ہیں بس ایک خطا تھی جو ان سے ہو گئی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی اس کی آواز میں دکھ تھا شرمندگی تھی اور آنسوؤں کا بوجھ تھا۔

"درگزر کر دیں ابا جان! معاف کر دیں آپی کو۔" وہ ہاتھ باندھ کے ان کے گھٹنوں میں بیٹھ گئی۔

"ابا جان! کچھ غلطیاں ہم سے ہو جاتی ہیں نادانی میں ......اور کچھ ...... کچھ تو شاید ہمارے مقدروں میں بھی لکھی ہوئی آتی ہیں۔ یہ ہونی بھی آپ کے مقدر کا لکھا تھی۔ وہ بے حد شرمسار ہیں۔ احساسِ ندامت سے گڑگڑا کر اقرارِ جرم کیا ہے انہوں نے اور دل سے توبہ کرنے والے کو تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ آپ بھی انہیں معاف کر دیں...... پلیز۔" وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بڑی التجا سے پھیلائے ہوئے تھی۔

عمیس جیلانی نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور وہ تڑپ کے ان کے سینے سے لگ گئی۔

"ابا جان؟" وہ شاید جب سے بڑی ہوئی تھی آج پہلی بار اپنے باپ کے اس قدر قریب آئی تھی۔ ان کی دھڑکنوں کو پہلی بار اس کے کان اتنے قریب سے سن رہے تھے اور ان کے سینے سے پھوٹتی خوشبو کا سحر اسے پہلی بار جکڑ رہا تھا۔ وہ اس نعمت سے فیض یاب ہوتی سوچ رہی تھی کہ ماں کی طرح سے باپ کی محبت اور قربت بھی تو بے حد ضروری ہوتی ہے بچوں کے لیے اور خصوصاً بیٹیوں کے لیے۔ مگر ہماری معاشرتی روایات نے بیٹی اور باپ کے بیچ عجیب سے فاصلوں کو پیدا کر دیا تھا اور ایسا کر کے کتنا بڑا ظلم کیا تھا بیٹیوں پر...... وہ اپنے باپ کے سینے سے لگی اس عظیم نعمت کے ایک ایک پل کو سمیٹ رہی تھی۔ جبکہ عمیس جیلانی کے دل میں شدت سے یہ خیال تڑپ رہا تھا کہ۔

"بیٹیاں اپنے باپ کو ماں سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہیں البتہ باپ اس حقیقت کا اقرار اور اظہار کرنے سے عمر بھر کتراتا رہتا ہے۔ جانے کیوں اسے رحمت پا کر بھی نعمت ہی کی ہوس رہتی ہے حالانکہ جسے رحمت مل جائے وہ تو بے شمار نعمتوں کا خود وسیلہ ہو جاتی ہے۔

"جاؤ جا کر اس کے کمرے کا دروازہ کھولو۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

انہوں نے ردا کے سر پر بڑی شفقت سے بوسہ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

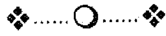
"ابا جان! میں نے اس کا کمرہ صاف کروا دیا ہے۔ آپ چلیں میں اور امی بھی آپ کے ساتھ چلیں گے اسے لینے کے لیے۔"

ردا نے فرطِ مسرت سے ان کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے اور امی جان

"امی جان کہاں ہیں آپ؟"

کہتی ہوئی ترنم بیگم کو یہ خوشخبری سنانے کو بھاگی۔ آج اسے نہ صرف زائرہ کے لیے

معافی مل گئی تھی بلکہ خود اس کے اس احساسِ محرومی کا ازالہ بھی ہو گیا تھا جو بچپن سے اس کا دل زخمی کیے ہوئے تھا۔



زائرہ کو اپنے کمرے میں بند ہوئے کئی روز ہو گئے تھے۔ اب اسے کسی نے نظر بند نہ کیا تھا بلکہ خود اس نے اپنے آپ کو یہاں محصور کر لیا تھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ زیادہ تر خاموش رہتی۔ باہر بہت کم نکلتی۔ نماز و قرآن سے جڑی رہتی اور چپکے چپکے روتی رہتی۔ ترنم بیگم دیکھ رہی تھیں کہ وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے احساسِ گناہ کا بھاری بوجھ اس کے جینے کی امنگ کو کچل رہا ہے وہ اپنوں سے بھی کٹ کر رہ گئی تھی اور اس کی یہ حالت انہیں بے سکون و بے قرار کیے دے رہی تھی۔ وہ کیا کرتیں بیٹی کے دکھ سے ان کا اپنا کلیجہ بوٹی بوٹی ہوا جا رہا تھا۔ مجھے آپا سے ایک بار تو بات کرنی چاہئے؟" ان کے دل نے مشورہ دیا۔

آپا سے؟ کیا کہوں گی؟" ایک احساسِ کمتری نے انہیں شرمندگی سے باندھ دیا۔ "میں ان سے معافی مانگ لیتی ہوں اور درخواست کرتی ہوں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے۔"

ان کا خیال تھا کہ اگر زائرہ اور جواد کی شادی ہو جائے تو نہ صرف زائرہ کے لبوں کی ہنسی واپس آ سکتی ہے بلکہ اس خاندان کے بیچ حائل ہونے والے اَن دیکھے فاصلے بھی دوبارہ سے مٹ سکتے ہیں۔

"مگر میں یہ بات آپا سے کیسے کروں؟" ان کی زبان سوکھنے لگی۔

"تو پھر کون کرے؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"بی بی جان! ہاں بی بی جان اگر یہ بات کریں گی تو یقیناً کسی کو برا بھی نہیں لگے گا اور بات بن بھی جائے گی۔"

ان کے دل میں بی بی جان کا خیال آیا۔

"خیر ان سے تو میں بات کر لوں گی۔" ان کے جی کو حوصلہ ہوا۔

"یا اللہ! تُو ہی بہتر جانتا ہے۔ بس جس میں بہتری ہے تُو وہ آسان کر دے۔" انہوں نے فوراً صدقِ دل سے دعا مانگی۔

مجھے آج ہی بی بی جان سے بات کر لینی چاہئے۔ اچھا ہے جتنی جلدی زائرہ کی شادی ہو جائے یہ معاملہ ختم ہو اور گھر پر تنی سوگواری کی یہ چادر بھی ہٹے جس نے دونوں طرف کی خوشیوں کو زنجیر پا کر رکھا ہے۔" وہ مختلف خیالات میں گھری ہوئی بی بی جان کے پاس جانے کے لیے تیار ہونے لگیں۔



"ستارہ!"

"ہوں۔"

"یہ ذرا میری ٹائی کی ناٹ تو درست کر دینا پلیز۔"

"جی۔"

"اچھا یہ میری رسٹ واچ۔ دیکھنا ذرا بند نہیں ہو رہی۔"

"ستارہ!"

"جی۔"

"پلیز دو کپ کافی تو بنا لو۔"

"جی بہت اچھا۔"

آج کل احمد اور ستارہ کے درمیان بس ایسی ہی مختصر سی گفتگو ہوتی تھی۔ احمد بہانے بہانے سے اس کے ساتھ بات کرتا اور اسے اپنے قریب بلاتا رہتا تھا اور وہ مختصر جواب دے کر جلدی سے اپنا کام کرتی اور پلٹ جاتی۔ ایک اَن دیکھی خلیج تھی جو دونوں کے درمیان روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل دونوں کے دل دکھی تھے اور نارسائی کے درد سے شل بھی۔ ستارہ نے تو اپنی محبت کے ہاتھوں بے اعتباری کا رنج اٹھانے کے ساتھ ساتھ شک کے نیزے بھی برداشت کیے تھے۔ اس کا کلیجہ تو تازہ زخموں سے ابھی چھلنی تھا اور احمد کو شرمندگی اور پچھتاوں کے ناگ رات رات بھر ڈستے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور تھے۔ احمد سے اب یہ عجیب سی اجنبیت برداشت کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ آج اس نے سوچا تھا کہ وہ ستارہ سے کھل کر بات کرے گا۔ اس کا جو بھی فیصلہ ہے وہ بھی کھل کر بتا دے۔ اس نے آفس پہنچتے ہی ستارہ کا موبائل نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے فون آن کیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے احمد کے بولنے سے پہلے ہی سلام کر دیا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "تم میری ہر نیکی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"بھئی سلام کرنے میں پہل مجھے کرنی چاہیے مگر ہمیشہ تم کر دیتی ہو۔" اس نے مذاق سے کہا۔

"اس لیے کہ آپ کو پہل کرنے کی عادت نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ آپ کو کچھ مشکل نہ

ہو۔ بس اسی لیے۔" ستارہ نے اپنی طرف سے وضاحت کی۔

"ارے میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ وضاحت کی کیا ضرورت ہے؟" احمد نے اپنے اندر اک احساسِ کمتری کو سرسراتے ہوئے پا کر کہا۔

"وضاحت کرنی چاہیے احمد......! ورنہ بعض اوقات معمولی معمولی سی باتیں بڑے بڑے شکوک کو جنم دینے لگتی ہیں۔" نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ شکایتی ہو گیا تھا۔

"ستارہ پلیز...... سوری کہہ تو دیا تھا میں نے۔" احمد کو بار بار شرمندہ ہونا اچھا نہ لگتا تھا۔

"سوری کہہ دینے سے ہمارا دل کسی کے لیے ہلکا تو ہو جاتا ہے مگر اس ذرا سے لفظ میں گہرے زخموں کو بھرنے کی تاثیر کہاں۔" اس کا جی تو چاہا کہ وہ یہ احمد سے کہہ دے مگر وہ سوچ کر رہ گئی۔ کہہ نہ سکی۔

"ستارہ!" اسے چپ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"جی۔" وہی مختصر جواب جو احمد کا دل چیرنے لگا تھا۔

"آج شام کو تیار رہنا...... ہمیں بیگ صاحب کے ہاں کھانے پر جانا ہے۔"

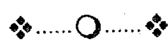
احمد نے جان بوجھ کر جھوٹ کا سہارا لیا اسے پتہ تھا ایسے ستارہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ اب وہ اس کے ساتھ جانے سے کتراتی تھی۔

"بیگ صاحب کے ہاں؟" ستارہ احمد کے بزنس پارٹنر اور دوست کے ہاں جانے کا سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں بس تم تیار رہنا...... ٹھیک سات بجے۔" اس نے اسے مزید سوچنے کا موقع دیے بغیر تاکید کر دی۔

"اچھا سویٹ ہارٹ...... سی یو...... گڈ بائے۔" ساتھ ہی اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"بیگ صاحب کے ہاں ڈنر پر۔" ستارہ کئی لمحے موبائل کو ہاتھ میں تھامے سوچتی رہی۔



ترنم بیگم نے بی بی جان سے ایک لمبی تمہید کے بعد آخر کار اپنے دل کی بات کہہ دی جسے سن کر وہ کچھ دیر تو چپ بیٹھیں رہیں پھر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"ترنم! میری جان! تم نے جو کہا یہ سراسر میرے اور میاں صاحب کے دل کی آواز ہے...... مگر۔"

"مگر کیا؟ بی بی جان! مگر کیا؟" انہیں چپ ہوتا پا کر ترنم بیگم نے بے صبری سے پوچھا۔ ان کا تو دل ٹھہرنے لگا تھا۔

"اب بات بڑوں کی نہیں ہے۔ اب تو جواد کی مرضی ہے اور وہ؟" طاہرہ بیگم خود بے حد پریشان تھیں۔

"آپ نے بات کی؟" ترنم بیگم کا دل شدتِ کرب سے پھٹنے کو تیار تھا۔ میں نے بات تو نہیں کی مگر مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے تو میرا دل ڈر رہا ہے یہ بات شروع کرتے ہوئے۔"

طاہرہ بیگم نے سچ کہا تھا کیونکہ وہ پچھلے کئی روز سے اس موضوع پر سوچ رہی تھیں میاں صاحب سے بھی انہوں نے ذکر کیا تھا وہ بھی کچھ اسی طرح سے پریشان ہو کر خاموش رہ گئے تھے۔

"پر بی بی جان؟" ترنم بیگم کا دل بے آس ہونے کو تیار نہ تھا۔

"اچھا میں آج پھر میاں صاحب سے کہتی ہوں۔ وہ اسیس اور تکلم سے بات کریں۔"

طاہرہ بیگم نے بہو کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر انہیں تسلی دی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ ڈھیلی ڈھیلی سی بولیں۔

"خدا پر بھروسہ رکھو ترنم اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

طاہرہ بیگم کا دل خود بہت بے قرار تھا ترنم بیگم کا پریشان چہرہ دیکھ کر تو ان کی جان پر بن گئی۔

"پتہ نہیں بی بی جان! میری اس بچی کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے؟ میں تو بہت فکر مند ہو گئی ہوں۔ اب بھلا کون اسے باہر سے آ کر اپنائے گا۔ آج کل لوگوں کے ظرف اتنے کہاں؟" وہ رونے لگیں۔

"تم اللہ سے اچھی امید رکھو یوں پریشان رہنے سے بھلا کیا ہوگا؟ میں آج دوبارہ سے بات کروں گی۔ میں نے تم سے کہا تو ہے۔" بی بی جان نے انہیں پیار کرتے ہوئے کہا اور پھر رات کے کھانے پر انہوں نے واقعی یہ بات چھیڑ دی جب سب کھانا کھا چکے تو انہوں نے کہا۔

"اسیس میاں! مجھے تم سے اور تکلم سے کچھ کہنا ہے۔"

"جی بی بی جان!" اسیس میاں جو کھانے کی میز سے اٹھنے ہی والے تھے دوبارہ بیٹھ گئے اور سعادت بندی سے بولے۔

"جواد بیٹے تم بھی بیٹھو اور غور سے میری بات سنو۔" انہوں نے جواد کو بھی وہیں بٹھا لیا۔

"بلکہ زید تم بھی بیٹھے رہو اور سب لوگ غور سے میری بات سنو اور سوچ سمجھ کر مجھے جواب دو۔"

انہوں نے زید اور جواد کو وہیں بیٹھنے کا پابند کر کے نور صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ بات شروع کریں۔

"دیکھو! بچو! جو کچھ ہو چکا ہے وہ تم میں سے کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔"

نور محمد صاحب نے بات کو بنا کسی تمہید کے شروع کیا جس پر سب نظریں جھکا کر رہ گئے

انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔

"انسان خطا کا پتلا ہے خواہ مرد ہو یا عورت...... بلکہ عورت تو زیادہ کم عقل اور جذباتی ہوتی ہے اور اس مردود ابلیس کے بہکاوے کا زیادہ شکار ہوتی ہے۔"

وہ جواد کو اپنی نظروں میں رکھے ہوئے بات کر رہے تھے۔ جس پر اس نے گھبرا کر ابھی ابھی پہلو بدلا تھا۔

"دیکھو جواد؟" اب انہوں نے سیدھا سیدھا جواد کو مخاطب کیا۔ "جو غلطی زائرہ سے ہو گئی۔ وہ تم سے بھی ہو سکتی تھی۔" وہ جواد کے اگلے تاثرات کو نوٹ کرنے کے لیے ذرا خاموش ہوئے جس پر وہ نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں بولا۔

"لیکن میاں جی وہ لڑکی ہے اور پھر جو ہوا وہ دانستہ کیا گیا تھا۔" اس کا لہجہ گستاخ نہ ہونے کے باوجود احتجاجی ضرور تھا۔

"جواد؟" تکلم بیگم نے اس کو جواب دیتے پا کر فوراً گھر کا۔

"کہنے دو اسے۔" میاں صاحب نے ان کے ڈانٹنے کو نظر انداز کر کے جواد کو اپنے دل کی بات کہنے کی پوری اجازت دی۔

"میاں جی! گستاخی معاف! مگر میرے پاس اتنا بڑا دل اور اتنا بڑا ظرف نہیں ہے کہ میں اس کی دانستہ خطا کو معاف کر دوں۔" اس نے مختصر مگر جامع جواب دے دیا۔

"یعنی تم سے مزید بات نہ کی جائے؟" اب طاہرہ بیگم بولیں۔

"بی بی جان! صرف اس موضوع پر۔ باقی آپ جو کہیں میرے سر آنکھوں پر۔" اس نے ادب کے ساتھ اپنا پورا حق رائے وہی استعمال کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ کم گو اور اپنی ذات میں محدود۔ بہت کم موقعوں پر وہ سب کے ساتھ گھلتا ملتا تھا۔ ورنہ پہلے اس کی کتابیں ہوا کرتی تھیں اور اب آفس، اسے کسی کے ساتھ نہ کوئی گلہ تھا اور نہ ہی کسی کو اس کے ساتھ کبھی کوئی شکایت ہوئی تھی۔ اگرچہ زائرہ کو وہ چاہنے لگا تھا مگر اپنی چاہت میں بھی اسے اپنی ذات، اپنی عزت اور انا کا خیال زیادہ تھا لہٰذا اس نے صاف بتا دیا کہ وہ زائرہ کو معاف تو کر سکتا ہے مگر اس طرح سے نہیں کہ اپنی زندگی کا حصہ بنا لے۔

"بھائی پلیز...... وہ ہماری اپنی ہے اور یہ ہمارے گھر ہمارے خاندان کا معاملہ ہے۔ اسے ہم نے ہی سلجھانا ہے۔ آپ دل بڑا کریں اور پھر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اللہ نے بڑا کرم کیا اور ہماری عزت اور ناموس محفوظ ہے۔"

زید نے بڑی حکمت اور نرمی سے بھائی کو سمجھانا چاہا اور التجائیہ انداز میں کہا۔

"زید! بہتر ہو گا تم اس معاملے میں مزید نہ پڑو۔ تمہاری کھلنڈر عادتوں کی وجہ سے گھر میں پہلے ہی بہت مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔"

جواد نے آواز بلند کیے بغیر اسے سختی سے روک دیا کہ وہ اسے مشورے نہ دے۔

"بھائی! میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ ایک بار ٹھنڈے دل سے سوچیں تو سہی؟"

اس نے برا منائے بغیر کہا۔

"میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ بہتر ہے کہ ہم اس موضوع پر زیادہ بات نہ کریں۔"

جواد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرد تھیں کہ لمحہ بھر کو زید کو جھرجھری آ گئی۔

"جواد! ہم بڑے آپس میں فیصلہ کر لیں گے تم مت بولو۔" انیس میاں کو بھی اس کا یوں کھرا سا جواب دینا اچھا نہ لگا۔

"انیس! جود کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کا یہ فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کرے یہی اللہ کا حکم ہے اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔" میاں جی نے انیس جیلانی کو سمجھایا۔

"بیٹا! زید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم ایک بار ٹھنڈے دل سے سوچو تو سہی۔ کیا پتہ تمہارا دل کوئی اور رائے دے؟" طاہرہ بیگم نے اک آس باندھتے ہوئے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

"بی بی جان! کیا میں آپ سے جھوٹا وعدہ کر لوں اور آپ کو کسی خوش گمان امید سے خواہ مخواہ باندھ دوں۔" وہ اٹھ کر اپنی دادی کے پاس آ گیا اور قریبی کرسی پر بیٹھ کر ان کے ہاتھ محبت سے تھام کے بولا۔

"زائرہ کو اب میرا دل کبھی قبول نہیں کرے گا۔ بلکہ جس کو بھی حقیقت کا علم ہو گا وہی اس سے پہلو بچا لے گا۔ لہٰذا آپ لوگ اسی حسان کے گھر والوں سے بات کریں ویسے بھی زائرہ اور وہ۔"

"جواد! بدتمیزی مت کرو۔" اس کی بات کو درمیان سے اچکتے ہوئے تکلم بیگم غصے سے بولیں۔

"بھائی! وہ حسان ایک فلرٹ لڑکا ہے۔ اس نے زائرہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی اور آپ اسی کو؟" زید کو حسان والا مشورہ اچھا نہ لگا تھا۔

"زائرہ بھی ایک فلرٹ تھی جس نے مجھ سمیت پورے خاندان کو دھوکہ دیا ہے اور تم اسے میرے ساتھ؟" جواد نے ٹھیک اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"دیکھیں...... دیکھیں میاں جی! اس جواد کو دیکھیں کس طرح سے بے لحاظ ہو کر ہم سب کے سامنے بکواس کیے چلا جا رہا ہے اور آپ سن رہے ہیں؟"

انیس میاں سے اب اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ شاید اس وقت جواد کو ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیتے مگر انہیں میاں جی کا لحاظ تھا۔ جبکہ نور محمد دکھ اور حیرت سے اپنی اگلی نسل کو دیکھ رہے تھے جسے بزرگوں کی دید لحاظ بالکل بھی نہ رہی تھی اور جو اپنے حقوق کی آڑ میں خاندانی روایات کو پامال کر رہی تھی۔

"بھائی آپ کو اس طرح سے۔" زید نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر جواد نے اسے وہیں پر روک دیا۔

"زیادہ ہی نیکیاں کمانے کا شوق ہے تو تم کر لو اس سے شادی۔ تم بھی تو اس گھر کے فرد ہو......اور پھر تم کو اس کے ساتھ۔"

"بس کرو جواد! ورنہ سچ مچ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" تکلم بیگم نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"سوری امی جان! سوری دادا جان!" اس نے فوراً ہی معذرت کی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم لوگوں کا زمانہ ہے۔ تمہارے حقوق اور مرضی ہی اہم ہونی چاہئے ہمارا کیا ہے ہم تو بس ایسے ہی؟" نور محمد جیلانی مارے صدمے کے اور بھی نڈھال ہو گئے بمشکل اٹھے اور جانے لگے۔ انہیں دیکھ کر طاہرہ بیگم بھی فوراً اٹھ گئیں۔

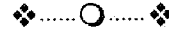
"اچھی بات ہے بچو! زائرہ نے اپنی پسند اور اپنی مرضی کر کے ہمیں سر اٹھانے کے قابل کہاں چھوڑا ہے۔ اب تم جینے کا سامان بھی چھین لو۔" ان کی آواز میں گہرے رنج کا بوجھ تھا۔

"بی بی جان! بی بی جان! دادو جی! پلیز میری بات تو سنیں۔ میرا مقصد ہرگز بھی آپ کا دل دکھانا نہ تھا۔ میری بات تو سنیں۔ پلیز مجھے غلط نہ سمجھیں۔"

جواد پریشان ہو کر اپنے دادا اور دادی کے پیچھے لپکا تا کہ انہیں سمجھا سکے کہ وہ تو بس اتنا کہنا چاہتا ہے کہ اب وہ زائرہ کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنا سکتا اور یہ بات اس کے بزرگوں کو جانے کیوں سمجھ نہیں آ رہی۔" وہ اپنی صاف گوئی اور صاف دلی کا کیا کرتا۔ منافق نہیں تھا اور منافقت نہیں کر سکتا تھا۔

"دادو جان...... پلیز مجھے غلط نہ سمجھیں۔" وہ کوریڈور میں جا کر بے بسی سے پیر پٹختا ہوا رک گیا۔ کیونکہ اس کے دادا جان اور بی بی جان اپنے کمرے میں جا کر اس کا دروازہ بند کر چکے تھے۔ وہ چند لمحے تو بند دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنی ماں

کے سامنے آیا انہیں عجیب سی التجائیہ نظروں سے دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ تو مجھے جانتی ہوں ناں؟ پھر سر جھکا کر پلٹا اور پریشان ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور انیس میاں مارے غصے اور شرمندگی کے وہیں پر اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے جبکہ زید کچھ سوچتا ہوا باہر چلا گیا۔



مہ رخ کو آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ دونوں بہن بھائی بے حد خوش تھے اور ان کی امی جان ان دونوں سے کہیں زیادہ خوش تھیں۔ دونوں بہن بھائیوں کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے ہر وقت گھر میں رونق لگی رہتی تھی۔ اس وقت بھی ناشتے کی میز پر یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ عبدالمالک بات بات پر مہ رخ کو چھیڑ رہا تھا۔ ''امی جان! جلدی کریں مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے مہ رخ کو ناشتہ سرو کرتا دیکھ کر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور اپنی ماں کو آوازیں دینے لگا۔

''بھائی! یہ ناشتہ آپ کے سامنے تو رکھا ہے؟'' مہ رخ نے فرائی انڈہ اور ٹوسٹ اس کے سامنے کھسکاتے ہوئے توجہ دلائی۔

''یہ......؟'' اس نے فرائی انڈے کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔

''کیا ہوا بھائی؟ یہ ناشتہ ہی تو ہے؟'' وہ بے چاری کچھ پریشان سی ہو کر بھائی کو دیکھنے لگی۔

''یہ انگریزی ناشتہ تمہارے میاں صاحب کرتے ہوں گے۔ ہم تو دیسی لوگ ہیں پراٹھے کھاتے ہیں۔'' اس نے ڈبل روٹی کے ٹوسٹ واپس مہ رخ کی طرف کھسکا دیئے۔

''میں پراٹھا بنا دیتی ہوں آپ؟'' وہ پراٹھا بنانے کے لیے اٹھنے لگی۔

''تم اور پراٹھا؟ ہونہہ۔'' وہ مذاق کے انداز میں مسکرایا۔

''مجھے آتا ہے بنانا؟'' وہ کچھ برا مان گئی۔

''نہیں......نہیں تم رہنے دو۔'' اس نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا۔

''امی جان! میرا ناشتہ؟'' وہ پھر زور سے آواز دینے لگا۔

''لا رہی ہوں بھئی......ایک تو تم بہت تنگ کرتے ہو کھانے پینے کے معاملے میں۔''

انہوں نے گرم گرم پراٹھا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''بس بھئی عبدل! اب بہت ہو گئی۔ اب تم اپنا انتظام کر لو۔''

وہ ناراضگی سے اسے دھمکا رہی تھیں۔

''انتظام؟ کیسا انتظام؟'' وہ گھبرا کے انہیں دیکھنے لگا۔

''اپنے لیے کھانا پکانے والی کا انتظام کر لو......بلکہ اپنے سب کاموں کے لیے کسی کو لانے کا فیصلہ کرو۔'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔ انداز وہی ناراضگی والا تھا۔

''کیوں امی جان! کیا نسیم ماسی نے بھی جواب دے دیا ہے؟'' اس نے کام والی کا نام لے کر لا پروائی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ منہ پھلا کے بیٹھ گئیں۔

''تو پھر کیا ہوا؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔ ایک طرف اس کی پیاری سی بہن منہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھی دوسری طرف ماں غصے کی ایکٹنگ کر رہی تھی اسے بڑا مزہ آ رہا تھا دونوں کو ستانے میں۔

''اس گھر کی ماسی ملکہ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور آج سے ہڑتال کا اعلان کر دیا ہے۔'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں بغلوں میں دبا کر فوری طور پر اپنے قول کا عمل پیش کرتے ہوئے کہا۔

''گھر کی ماسی ملکہ؟'' اس نے پراٹھا ختم کر کے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

''ہاں۔'' انہوں نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

''میں صدقے۔ گھر کی ملکہ پر......ان کا حکم سر آنکھوں پر۔ البتہ یہ گھر کی ماسی کا معاملہ ٹیڑھا ہے اس کی انکوائری کرنی پڑے گی کہ یہ آخر اتنے نخرے کیوں کرتی ہے۔''

اس نے ماں کا ہاتھ لبوں سے لگا کر بہن کو ذومعنی نظروں سے دیکھ کر ماسی کہا تو وہ اور بھی جل گئی۔

''دیکھا ناں امی جان! بھائی ابھی تک مجھے ماسی سمجھتے ہیں۔''

عبدالمالک اسے ''ماسی'' کہہ کر چڑایا کرتا تھا شادی سے پہلے اور اب بھی اکثر چھیڑتا تھا۔

''ماسی'' اپنے حقوق کی حفاظت کرنی جانتی ہے تم ملکہ کا حکم سنو۔''

انہوں نے عبدالمالک کو کان سے پکڑ لیا۔

''جج......جج......جی......کان تو چھوڑیں۔'' اس کی ماں نے کان سچ مچ زور سے مروڑ دیا تھا اس لیے وہ بلبلایا۔

''جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لو اور ملکہ کی خدمت گاری کے لیے ایک عدد ماسی مہیا کرو۔''

انہوں نے اس کا کان چھوڑے بغیر کہا جس پر مہ رخ زور سے ہنسی۔

''ماسی...... ہاں یہ نام ٹھیک ہے۔ اب امی جان آپ کی زوجہ کو ''ماسی'' کہہ کر بلایا کریں گی۔ بلکہ ماسی غفوراں۔'' اس نے اپنی ایک سابقہ کام والی کا نام لیا جو بے حد کالی اور

موٹی تھی اور بدسلیقہ بھی تھی جو عبدالمالک کو کبھی بھی نہ بھائی تھی۔

"ماسی غفوراں...... تمہیں تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔" اپنا کان چھڑا کر بہن کی طرف لپکا جس پر وہ گھبرا کر ایک دم سے بھاگی تو پاؤں پھسلنے پر گر گئی۔

"مہ رخ۔" عبدالمالک اور اس کی امی جان تڑپ کر اس کی طرف بڑھے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا...... زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" عبدالمالک اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں کو اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر رگڑنے لگا۔ وہ اس کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"اُف۔ ہائے اللہ۔" وہ بھائی کو پریشان دیکھ کر اور بھی اترا گئی اور لاڈ میں آ کر ہائے اوئی کرنے لگی۔ ماں نے پوچھا تو انہیں آنکھ مار کے سمجھا دیا۔ جس پر وہ بھی عبدل کو ڈانٹنے لگیں۔ "دیکھا ناں گرا دیا ناں بہن کو۔ لگ گئی ناں اسے چوٹ؟"

"سوری...... سوری مہ رخ۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"سوری کیا اب اسے اٹھاؤ اور اندر لے کر چلو۔" وہ رعب سے بولیں جس پر عبدالمالک نے جھک کر بہن کو سہارا دیا اور اندر لے گیا۔ بستر پر لٹایا اور فرسٹ ایڈ بکس لے کر اس کے پیر پر آیوڈیکس ملنے لگا۔

"بہت چوٹ لگی گئی؟" وہ بہن کو پیار سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے بھائی کا ہاتھ روک دیا۔

"تو پھر؟" وہ اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ دیکھ کر حیران ہوا۔

"حساب برابر ہو گیا۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر سنجیدگی اختیار کی۔

"حساب؟" اب وہ اس کا پاؤں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے پراٹھے بنانے نہیں آتے اور میں ماسی ہوں ہے ناں؟" وہ اس کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتی ہوئی بولی۔ جس پر عبدالمالک نے پہلے تو اسے گھور کے دیکھا پھر کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پیاری بہن مہ رخ اور ماں کی ہنسی کا جلترنگ بھی فضا میں پھیل گیا۔



زید نے اپنے دادا جان کے دونوں ہاتھ تھام کے اقرار کر لیا تھا کہ وہ زائرہ سے شادی کرنے کے تیار ہے جس پر جہاں نور محمد جیلانی حیران و پریشان سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے وہیں پر طاہرہ بیگم نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"میرا بچہ! میرا لعل!" وہ اسے پیار سے دیکھتی ہوئیں اپنے جذبات کو قابو نہ کر پا رہی تھیں جو اس وقت زید کی محبت میں مچل کر اشک بنتے جا رہے تھے۔

"تُو...... تُو یہ کیا کہہ رہا ہے؟" وہ اس کے کہے کو اپنا خواب سمجھ رہی تھیں۔ یقین کرنے کو اس کے قریب آ کر اس کا چہرہ چومنے لگیں۔

"جی بی بی جان! مجھے زائرہ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ان کے ہاتھ تھام کے اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوا بولا۔

"مگر بچے! تُو ایسا کیوں کرے گا...... کیا محض جواد کی اس بات کی خاطر......" وہ سمجھ رہی تھیں زید جواد کے اس روز کے طعنے پر جذباتی ہو کر یہ قدم اٹھا رہا ہے۔

"نہیں اپنے گھر کی عزت کے لیے۔" وہ انہیں اپنے بازو کے حصار میں لے کر پیار سے بولا۔

"گھر کی عزت بچانے کے لیے آج پھر تُو ہی قربان ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

وہ اس پر نثار ہوتی نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ ان کی نگاہیں پوتے کی پیشانی پر بوسہ کناں تھیں اور وہ اس وقت ان کے دل کی گدازی بنا جا رہا تھا۔

"نہیں بی بی جان...... ایسا نہیں ہے۔ میں نے یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔" وہ انہیں لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ادھر میرے پاس بیٹھیں دادا جان۔" دوسرے ہاتھ سے ا[illegible] قریب کھڑے گم صم سے نور محمد جیلانی کو نرمی سے اپنی طرف کھینچا اور ساتھ بٹھا لیا۔

"زائرہ بہت اچھی ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"زید! بس کر...... میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔" طاہرہ بیگم کو اس وقت اس کی ہنسی میں اس کے دل کی اس معصوم سی خواہش کا خون نظر آ رہا تھا۔ جس کا نام "عیون" تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ زید کو عیون سے محبت ہے۔

"بی بی جان! میں زائرہ کو بہت خوش رکھوں گا اور اس میں دوبارہ جینے کی خواہش پیدا کروں گا۔" وہ ان کی آنکھوں میں چھپی گہرائی کا مطلب جان بوجھ کر نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"زید یار! میں اتنا بھی قوی نہیں ہوں کہ تم بھی میرے اعصاب آزمانے لگو۔" میاں جی نے اس کے کندھے پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یار جگر! کمال کرتے ہیں آپ؟ میں بھلا کیوں آپ کے اعصاب شل کروں گا۔ میں تو خود آپ کی قوت بننے کو تیار ہوں۔" اس نے اپنے دادا جان سے بے تکلفی برتتے ہوئے

دوستوں والے انداز میں کہا۔

"یار اور جگر کہتے ہو اور مجھے امتحان میں بھی ڈالتے ہو۔ ایسا مت کرو۔" وہ بھی زید کا حالِ دل جانتے تھے اس لیے کہہ رہے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ دونوں میری شادی کے بیچ ظالم سماج بن رہے ہو۔" وہ پھر بھی ان دونوں کی آنکھوں کے معنی جھٹلا کر شرارت سے بولا اور پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

"دادا جان! آپ کچھ بھی اور مت سوچیں اور اللہ کا نام لے کر عمیس چچا سے بات کریں باقی سب اللہ ٹھیک کر دے گا۔"

"لیکن بیٹا! پھر بھی یہ مناسب نہیں ہے۔" طاہرہ بیگم اس پر راضی نہ تھیں۔

"دادو جان! یہی مناسب ہے۔ آپ ایک بار اس پر ٹھنڈے دل سے سوچیں تو سہی۔" وہ انہیں تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

"اور ہاں...... میں نے امی جان کو اس بات پر قائل کر لیا ہے۔ آپ ان کے لیے پریشان نہ ہوں۔"

اس نے ان کی آنکھوں میں اگلا سوال پڑھ کر جواب دیا۔

"اور عیون؟" طاہرہ بیگم کے لبوں سے ایک سسکی کی طرح عیون کا نام نکلا۔

"ع...... یون۔" اس کے لب کانپے اور لہجہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

"عیون کیا دادو؟" فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر مسکراہٹ کا پردہ گرا لیا۔

"اپنے دل پر ہاتھ رکھو اور پھر دوبارہ سے کہو۔" طاہر بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے سینے پر دھرتے ہوئے طنز سے کہا۔

"کیسے...... ایسے...... عیون......" اس نے منہ بنا کر بڑے اسٹائل سے کہا اور خود ہی ہنس دیا۔

"آپ بھی ناں دادو؟ بات کو سمجھتی ہیں اور پھر بھی نہیں سمجھتیں۔" وہ ذو معنی ہو گیا۔

ان کے سامنے جھک کر دوزانو ہوا اور ان کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے انہیں اسی طرح دیکھتا رہا پھر آنکھیں موند کے چہرہ جھکا گیا۔

"آپ لوگ عیون کا نہ سوچیں پلیز زائرہ کا سوچیں۔ عیون کو مجھ سے بہت بہتر مل جائیں گے مگر زائرہ کے لیے صرف میں ہی بہتر ہوں۔" اس کے لہجے میں بے پناہ درد کے باوجود اک اعتماد تھا۔

ایسا اعتماد جس نے طاہرہ بیگم اور نور محمد جیلانی کے پانی ہوتے دلوں کے آگے بند باندھ

دیا۔ دونوں کے لرزتے ہوئے ہاتھ اٹھے اور آ کر زید کے سر پر شفقت بھری دعا بن گئے اور زید کی آنکھوں سے دو قطرے پانی نکلا اور طاہرہ بیگم کے پیروں کی طرف جھک گیا۔ جبکہ اس کے دل کا باقی تلاطم اک خاموش سی آہ بھر کے وہیں برف ہو گیا۔

❖......O......❖

مہ رخ کو اپنی دوست فاریحہ بخاری کے ساتھ درزی کے پاس گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ فاطمہ خان کا مارے پریشانی کے برا حال تھا۔ عبدالمالک کے بھی واپس گھر آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ کیا کرتیں۔ عبدل اگر مہ رخ سے پہلے گھر آ جاتا تو کہرام مچا دیتا کہ انہوں نے مہ رخ کو ایسے کیسے جانے دیا۔ وہ خود شام کو لے جاتا مگر وہ کیا کرتیں کہ آج کل کی لڑکیوں کے کپڑوں کی سلائیاں، اللہ معافی...... کبھی میچنگ ربن اور کبھی لیسیں جنہیں خریدنے کے لیے بہت سارا وقت درکار ہوتا تھا اور یہ مرد حضرات کبھی خواتین کے ساتھ دکان دکان نہیں پھرتے نہ ہی ڈرائیوروں کی طرح سے بازار کی نکڑ پر گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں اور یہ عبدالمالک تو بالکل بھی زیادہ دیر نہ رکتا تھا ہمیشہ کہتا تھا کہ بغیر بحث کے خریداری کرو۔ اچھی دکان پر جاؤ اور چیز پسند کرنے میں زیادہ حیل و حجت سے کام نہ لو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے یہ خریداری کے اصول اگرچہ سنہری تھے مگر ان پر آج کل کی لڑکیاں بھلا کہاں چل سکتی تھیں۔ وہ سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں جا پہنچیں۔

دوبارہ مہ رخ کا موبائل نمبر ملایا۔ مگر وہ مسلسل بند تھا۔ وہ جھنجھلا گئیں۔

ایک تو یہ لڑکی خدا جانے اس نے یہ موبائل کیوں لے رکھا ہے جسے ہر وقت بند ہی رہنا ہوتا ہے۔"

"اب میں کیا کروں؟" ان کا دل پتہ نہیں کیوں عجیب سی گھبراہٹ کا شکار تھا ان کی چھٹی حس بھی کچھ بے کل سی تھی۔

"یا اللہ خیر۔" وہ بے چینی سے کبھی صحن تک جاتیں اور کبھی واپس آ کر فون ملانے لگتیں۔ مہ رخ کو گئے ہوئے پورے دو گھنٹے ہو گئے تھے درزی کی دکان کوئی بہت دور بھی نہ تھی انہوں نے ایک بار تو سوچا کہ وہ خود چادر اوڑھ کے چلی جائیں۔ مگر وہ خود بھی تو کبھی تنہا نہ گئی تھیں۔ پھر سوچا کہ ڈرائیور کو بلا لیں۔ مگر عبدالمالک فوراً پوچھے گا کہ کہاں جانا ہے؟ وہ خود سے سوال جواب کر کے اور بھی الجھ گئیں۔

آج انہیں مہ رخ پر بہت غصہ آ رہا تھا وہ سچ مچ اس کے ساتھ ناراض ہو گئی تھیں۔ وہ خود کو ملامت کر رہی تھیں کہ انہوں نے آخر اسے جانے کیوں دیا۔

”جب دیکھو اس لڑکی کو یہی کرتی ہے۔ یہاں آتی جائے گی اور اس نے اپنے سارے کام کرنے ہوتے ہیں ٹک کر تو بیٹھ نہیں سکتی۔ وہ جی ہی جی میں اس کو بھی ڈانٹ رہی تھیں۔

اتنے میں باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

”عبدل!“ وہ اور بھی بوکھلا گئیں۔

”السلام علیکم پیاری امی جان!“ وہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ ماں کے سامنے کھڑا مسکرا کر سلام کر رہا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ بھی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولیں۔

”چائے۔ چائے پیو گے عبدل؟“ وہ فوراً ہی چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دیں۔

”امی جان مجھے چائے نہیں پینی۔“ اس نے ماں کو ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔

”کیوں...... کیوں نہیں پینی چائے پی لو۔ میں بناتی ہوں۔“ وہ اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھیں۔

”کیا بات ہے امی؟ ادھر دیکھیں میری طرف؟“ وہ ماں کے چہرے کی گھبراہٹ سے جان گیا کہ وہ پریشان ہیں اور اس سے کچھ چھپا رہی ہوں۔

”عبدل! وہ مہ رخ۔“

”کیا ہوا مہ رخ کو؟“ وہ ان کے منہ سے مہ رخ کا نام سن کر ان سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔

”کچھ نہیں ہوا بیٹا۔ بس وہ ذرا درزی کے پاس گئی ہے۔ میں کہہ رہی تھی کہ میں ذرا ڈرائیور کے ساتھ جا کر اسے لے آؤں۔“ انہوں نے فوراً ہی بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”آپ نے اسے تنہا جانے کیوں دیا۔ آئیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ وہ انہیں لے کر تیزی سے باہر نکلا۔ فاطمہ کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ ویسے بھی وہ اس سے کیوں چھپاتیں۔ آخر ایسی کیا بات تھی۔ مہ رخ درزی کے پاس ہی تو گئی تھی وہیں دیر لگ گئی ہو گی۔ فاریحہ بھی تو اس کے ساتھ تھی دونوں لگ گئی ہوں گی شاپنگ میں۔“ وہ اپنے خواہ مخواہ کے پریشان دل کو حوصلہ دیتیں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

عبدالمالک جو آج بہت خوشگوار موڈ میں گھر آیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ امی اور مہ رخ کو ساتھ لے کر گاؤں کو نکل جائے گا۔ وہ ایک دن کی چھٹی لے کر آیا تھا جسے وہ بے حد سکون کے ماحول میں گزارنا چاہتا تھا اور اس کا دل اپنے دادا جان کے لیے بھی اداس ہو رہا ہے۔

”اس مہ رخ کو تو میں نے گاؤں میں ہی چھوڑ آنا ہے پورا ہفتہ وہیں پر رہے جب تک اس کا شوہر واپس نہیں آتا۔“ اس نے دل سے سوچا کیونکہ اس کے شوہر نے آج ہی تو اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے ٹور پر دبئی جا رہا ہے اس کی واپسی تک مہ رخ وہیں پر رہے۔“

”ارے یہ فاریحہ...... روکو۔ عبدل! ذرا گاڑی روکو۔“ فاطمہ خان نے فاریحہ کو تنہا کھڑی پا کر وہیں پر گاڑی رکوائی۔ فاریحہ ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”فاریحہ بیٹی! مہ رخ کہاں ہے؟“ وہ اسے تنہا دیکھ کر ہول کھا رہی تھیں۔

”جی آنٹی...... وہ...... وہ...... وہ تو گھر چلی گئی تھی۔“ وہ فاطمہ آنٹی کے ساتھ عبدل کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

”گھر چلی گئی۔ کب؟ کس وقت...... کیوں؟“ ان کا تو کلیجہ ہی منہ کو آ گیا۔

”آنٹی جی! مجھے ابھی کچھ اور شاپنگ کرنی تھی اور مہ رخ رکنے کو تیار نہ تھی اس لیے وہ ٹیکسی میں چلی گئی تھی۔“ وہ بے چاری خود پریشان ہو رہی تھی۔

”کتنی دیر قبل گئی؟ کیا آپ کو ٹیکسی کا نمبر یاد ہے؟“ عبدالمالک نے انکوائری کے انداز میں پوچھا۔

”بھائی صاحب! وہ گھر جا رہی تھی شہر سے باہر تو نہیں جا رہی تھی کہ میں ٹیکسی کا نمبر دیکھتی۔“ فاریحہ کا جی تو چاہا کہ یہی کہہ دے مگر وہ فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

”سوری جی مجھے خیال نہیں رہا کہ میں ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرتی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”اچھا آپ آئیں، ہم آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔“ عبدالمالک نے اس سے بحث کرنے کی بجائے گھر واپس جانا بہتر سمجھا۔ وہ بے چاری ڈری سہمی خاموشی سے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”یا اللہ! مہ رخ گھر پہنچ گئی ہو۔“ فاریحہ کے دل نے دعا مانگی۔

”اللہ پاک میری بچی خیر سے گھر واپس چلی گئی ہو۔“ فاطمہ خان بھی سارے راستے دعائیں ہی مانگتی رہیں فاریحہ کا گھر ان کے گھر سے چند گز پہلے تھا فاریحہ کو ڈراپ کر کے وہ اپنے گھر پہنچے۔ عبدل ابھی گاڑی میں تھا جب فاطمہ مہ رخ کو آوازیں دیتی ہوئیں اندر کو لپکیں۔ ”مہ رخ! مہ رخ!“ وہ اندر آ چکی تھیں۔ مگر مہ رخ کی آواز کہیں سے نہ آ رہی تھی۔

”عبدل! مہ رخ تو گھر میں نہیں ہے۔“ وہ اپنا سینہ دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں

برآمدے میں پڑی کرسی پر ڈھے سی گئیں۔ ان کی چھٹی حس نے ان کے اندر عجب چیخ و پکار مچا رکھی تھی جس کی وجہ سے ان کا سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔

❖......O......❖

"بی بی جان! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" طاہرہ بیگم نے جب ترنم سے زید والی بات کا ذکر کیا تو وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

"ہاں ترنم! یہ سچ ہے۔" انہوں نے اپنی ہی بات کی تائید کی تاکہ ترنم بیگم کو یقین آ جائے۔

"زید اور زائرہ؟ بی بی جان یہ تو درست نہیں۔" ان کا دل بھی اس پر راضی نہ تھا۔

"شاید یہی درست ہے ترنم! اللہ کو یہی منظور ہے۔ اس میں یقیناً سب کی بہتری بھی ہو گی۔" وہ انہیں سمجھانے لگیں۔

"مگر بی بی جان! زائرہ نہیں مانے گی۔" انہیں ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔

"اس سے میں خود بات کروں گی۔"

لیکن بی بی جان! بہتر تھا کہ جواد ہی۔" پتہ نہیں کیوں ان کے دل کو جواد ہی زائرہ کے ساتھ جچتا تھا حالانکہ انہیں محبت زید کے ساتھ زیادہ تھی۔

"بھول جاؤ اسے؟" بی بی جان نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"تو وہ نہیں مانا؟" ترنم اداس ہو گئیں۔

"نہیں۔" بی بی جان نے مختصراً کہا۔

"زید کا کیا ہے وہ تو بچہ ہے۔" انہیں جواد کے انکار سے جو صدمہ پہنچا تھا اس کے بعد زید کا پرپوزل انہیں خوشی نہ دے رہا تھا۔

"وہ بچہ نہیں ہے ترنم! وہ ہم سب سے زیادہ سمجھدار اور حساس ہے۔ اس کے اندر خدا نے بڑی محبت اور حکمت رکھ دی ہے وہ دوسروں کے درد اپنے سینے میں پالتا ہے۔ وہ اپنے لبوں کی مسکراہٹ دوسروں کو سونپ کر خوش ہو جاتا ہے۔ بڑی خوش نصیب ہو گی زائرہ اگر مان گئی تو۔" بی بی جان نے زید کی بے حد تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"اور اگر اس نے انکار کر دیا تو؟" ترنم بیگم کا جی لرزنے لگا۔

"وہ ایسا نہیں کریں گی۔ اسے یہ بات ماننی ہی پڑے گی۔ آخر کو وہ کب تک اپنی مرضیاں کرتی رہے گی؟" طاہرہ بیگم کے لہجے میں کچھ سختی تھی جس پر ترنم بیگم خاموش ہو کر رہ گئیں۔

"کہاں ہے وہ میں خود بات کرتی ہوں اس سے؟" وہ زائرہ کے کمرے کی طرف

بڑھتی ہوئی بولیں۔

"بی بی جان! بی بی جان! چائے تو پی لیں تیار ہے۔" ردا نے انہیں آگے بڑھ کر پیار سے روک لیا۔

"چائے کب بنالی تم نے؟" وہ فوراً ہی نرم پڑ گئیں اور مسکرا کر پوچھنے لگیں۔

"جب آپ امی جان سے باتیں کر رہی تھیں۔" وہ لاڈ سے بولی اور ہاتھ تھام کے دادی کو چائے کی ٹرالی کی طرف لے گئی جہاں اس نے چائے کے ساتھ گرما گرم پکوڑے بھی بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ جو اس کی دادی جان کو پسند بھی تھے۔

❖......O......❖

نیوی بلیو شفون کی سادہ مگر خوبصورت ساڑھی میں آج ستارہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک سے سجے اس کے نرم و نازک لب حسب عادت ہولے ہولے ہل رہے تھے جس کا مطلب تھا وہ اس وقت بھی ذکر الٰہی میں مگن ہے۔ احمد نے کئی بار اسے چوری چوری نگاہوں سے دیکھا تھا اور ہر بار اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ اسے گھر سے تو اپنے دوست کے گھر ڈنر پر جانے کے لیے کہہ کر لایا تھا مگر اب جب اس نے گاڑی کو کسی اور ہی راستے پر ڈال دیا تو ستارہ نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ...... وہ میں کیا کرتا۔ تم ایسے میرے ساتھ نہ آتیں؟" اس نے فٹ سے اپنے جھوٹ کی وجہ بیان کی۔

"یہی تو آپ آج تک سمجھ نہیں پائے اور اپنے ہی طور پر میرے بارے میں اندازے لگاتے رہے۔" ستارہ نے قدرے افسوسناک لہجے میں کہا۔

"آئی ایم رئیلی سوری ستارہ...... یہی کہنے تو میں تمہیں باہر لایا ہوں۔" اس نے اپنے طور پر اس بار سچ بولا تھا۔

"آپ یہ بات مجھ سے گھر پر بھی کرتے تب بھی وہ ایسی ہی ہوتی جیسے اب ہو گی۔" ستارہ نے دل میں سوچا۔ ایک نظر اس پر شکایتی انداز میں ڈالی پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

وہ لوگ شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے جھونکے ان کے چہروں کو چھونے لگے تو جو بے حد بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

احمد نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

خوبصورت آواز میں بڑا ہی پیارا نغمہ تھا۔

احمد نے ڈرائیونگ کرتے کرتے ایک ہاتھ اٹھا کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جس پر اس

نے کوئی تاثر نہ دیا۔

"ستارہ!" وہ جذبات سے مخمور آواز میں بولا۔

"جی۔" اس کا وہی سادہ، سپاٹ اور مختصر جواب تھا۔

"جو کچھ ہوا وہ یقیناً اچھا نہیں تھا۔" احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

جس کے جواب میں ستارہ خاموش ہی تھی بس احمد کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ذرا سا کسمسایا تھا۔

"مجھے دل سے اپنے کیے پر شرمندگی ہے۔" احمد نے گاڑی کو ایک طرف کر کے روک دیا اور اپنا چہرہ اور توجہ دونوں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اب اس کے دونوں ہاتھ ستارہ کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے تھے۔

"معاف کر دو مجھے۔" وہ اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں جھک کر جھانکنے لگا۔

"پلیز۔" اب اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے تھے۔

"ایسے مت کریں۔" ستارہ نے اس کے ہاتھ نیچے کیے۔

"تو پھر کیا کروں جس سے تم مان جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ اب کچھ پریشان ہونے لگا۔

"میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اچھا اگر خفا نہیں ہو تو تمہارے چہرے پر لحہ کی چھائی ہوئی اداسی اور بیگانگی کا کیا مطلب ہے؟"

وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھ کے سہارے سے اوپر کرتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"میں تو بالکل نارمل ہوں۔ احمد! آپ کو ایسے ہی لگتا ہے۔" ستارہ نے اس کی سانسوں کی حدت سے گھبرا کر اپنا چہرہ دوسری جانب گھما لیا۔

"ستارہ' پلیز۔ بس کرو۔ مجھ سے تمہاری یہ بے اعتنائی برداشت نہیں ہوتی۔ یہ سزا مجھے مت دو۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"احمد! میں آپ کو سزا دوں...... یہ سوچنا بھی میرے لیے گنا ہے۔"

اس نے فوراً ہی اپنی صفائی پیش کی۔

"تمہاری یہ دل چیر دینے والی سرد مہری۔ سزا نہیں تو کیا ہے؟" وہ اس کے بدلے ہوئے رویے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جب سے زائرہ کے گھر سے جانے والا سانحہ ہوا تھا ستارہ اس کی طرف سے ایسی ہی سرد مہر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی وہ بے پناہ محبت وارفتگی۔ اظہار

کی شدت سب ماند پڑ گئی تھی حالانکہ وہ کئی بار سوری کہہ چکا تھا۔

"سزا تو میں نے پائی ہے احمد؟" اس کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکل گیا۔

"میری محبت کو بے اعتبار کر کے آپ نے جس طرح سے مسخ کیا۔ اس کا کیا جواز تھا آپ کے پاس ایک بے حد بودا اور عام سا شک...... اس قدر گھٹیا الزام کہ میری روح کانپ اٹھی تھی۔ میرے جذبوں کی سفید چادر کو آپ کے گندے الفاظ نے نہ صرف متعفن کیا بلکہ دھجی دھجی کر دیا۔

"بتائیں احمد! یہی تھی ہماری انڈراسٹینڈنگ۔

"یہی تھی آپ کی وہ محبت جس کے دعوے آپ نے سترہ برس کی عمر سے کرنے شروع کر دیئے تھے؟" وہ سسکنے لگی۔

"ستارہ! پلیز...... پلیز آئی ایم سوری...... پلیز۔" احمد نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا کر اس کا چہرہ، پنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کہا ناں غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

ستارہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ندامت نمی بن کر تیر رہی تھی۔

"احمد! آپ نے مجھے بہت دکھ دیا۔" اس نے احمد کی نم آنکھوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا اس کا دل اس قدر دکھا ہوا تھا کہ اس کی رگ رگ میں سوائے اک گہرے اور کربناک درد کے کچھ نہ تھا۔ وہ احمد سے ناراض بھی نہیں تھی۔ مگر اب اس کا دل احمد کی جانب محبت سے ہمکتا بھی نہ تھا۔ وہ کیا کرتی؟

"تو کیا میں واپس آسٹریلیا چلا جاؤں؟" احمد نے اچانک ہی سوال کر دیا۔

"کیوں؟" وہ اس اچانک سوال پر گھبرا گئی۔

"اس طرح قریب رہتے ہوئے بھی تو ہمارے بیچ فاصلے آ چکے ہیں۔ دور چلے جانے سے کیا خاص فرق آئے گا۔" وہ اداسی اور ندامت سے بولا۔

"اتنی جلدی گھبرا گئے آپ؟" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"ہاں مجھ میں تم جیسا صبر اور حوصلہ نہیں ہے۔" اس نے اپنی کمزوری کا اقرار کیا۔

"نہیں ہے تو پیدا کریں۔" وہ قدرے خوشگوار موڈ میں آ گئی تھی۔

"اس سے کیا ہو گا؟" وہ بدستور اداس تھا۔

"پتہ نہیں۔ البتہ صبر کا پھل تو ضرور میٹھا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں تلے دباتے ہوئے بمشکل کہا۔ اسے احمد کا اس قدر سوگوار چہرہ اور بار بار معافی مانگنا بھی اچھا نہ

لگ رہا تھا، لیکن فی الحال اس کا دل بھی رنجیدہ تھا وہ احمد کی ہر خواہش کو پورا نہ کر سکتی تھی۔

''اب چلیں...... بہت زیادہ دیر ہو گئی۔'' اس نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیر تو کہاں ہوئی ہے ابھی۔ تم پتہ نہیں کیوں ڈرتی رہتی ہو ہر وقت۔'' اس نے واپس جانے کی بات پر برا مناتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو! لوگ ہمیں کیسی عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟'' ستارہ نے اس کی توجہ نہر کی دوسری جانب دلائی جہاں راستے سے گزرنے والے لوگ خواہ وہ گاڑیوں میں تھے یا موٹر سائیکلوں پر انہیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

''دیکھنے دو...... لوگوں کا تو کام ہی یہی ہے۔ میں کوئی تمہارا بوائے فرینڈ نہیں ہوں منکوحہ ہو تم میری۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟'' وہ اسے چھیڑ کے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''گواہی موجود ہے میرے پاس۔'' وہ بھی اسے مسکراتا دیکھ کر مسکرا دیا۔

''کون سی گواہی؟'' ستارہ کو واقعی سمجھ نہ آئی تھی کہ وہ کس گواہی کی بات کر رہا ہے۔

''یہ دیکھو! سنو بلکہ محسوس کرو۔'' اس نے ایک دم سے اس کا ہاتھ تھام کے اپنے سینے پر رکھ دیا جہاں اس کا دل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''ہے نا یہ گواہ...... سچا اور پکا۔'' اب وہ اس کی جانب شرارت سے دیکھ رہا تھا۔

''ہے نا؟''

''ہے نا......؟'' وہ اس کے خاموش ہوئے لبوں سے اقرار چاہتا تھا اور وہ چہرہ گھما کے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے نرم و نازک لب پھر سے ہل رہے تھے۔ جیسے احمد کے اس پکے اور سچے گواہ کی عمر درازی کے لیے دعا گو ہوں۔



''بی بی جان! یہ کیسے ممکن ہے؟'' زائرہ ان کی بات سن کر حیران تھی۔

''دیکھو! زائرہ تم نے ابھی ابھی وعدہ کیا ہے کہ تم انکار نہیں کرو گی۔'' بی بی جان نے اسے یاد دلایا وہ اس سے پہلے ہی وعدہ لے چکی تھیں کہ وہ جس کا نام لیں گی زائرہ اس شادی سے انکار نہیں کرے گی۔ زائرہ نے یہ وعدہ اس لیے کر لیا تھا کہ اب اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور اپنے گھر والوں کو کوئی مزید پریشانی نہیں دینا چاہتی تھی۔ ''مگر بی بی جان؟'' وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بی بی جان نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''آپ لوگ آخر میری شادی کرنا کیوں چاہتے ہیں؟ رہنے دیں ناں اس موضوع کو۔'' وہ ان کی منت کرنے لگی۔

''بی بی جان! دنیا میں کتنی ہی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی اور کتنی ہی لڑکیاں شادی نہیں کرتیں اور ان کی زندگیاں اچھی گزر جاتی ہیں۔ میں اپنے بابا کا بازو بننا چاہتی ہوں۔ ان کی بھی تو یہی خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ بزنس کو سنبھالوں۔''

وہ انہیں بتا رہی تھی تاکہ وہ اس کی شادی کا فیصلہ واپس لے لیں۔

''دادی جان پلیز۔'' وہ ان کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''زائرہ! تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم اقرار کر رہی ہو یا انکار؟'' طاہرہ بیگم نے اس کے آنسوؤں اور التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''دادی جان! آپ مجھے کسی جاہل، فقیر، لولے لنگڑے جس کے ساتھ چاہے باندھ دیں اگر میں بوجھ لگنے لگی ہوں تو، لیکن زید......؟''

وہ گڑگڑا رہی تھی۔

''لیکن زید کو تم آج بھی پسند نہیں کرتی ہو۔'' بی بی جان کو بہت ہی برا لگا وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''یہ بات نہیں ہے بی بی جان؟'' وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' وہ بدستور خفگی سے پوچھ رہی تھی۔

''اس کے احسانات کی تو اب میری سانس سانس قرض دار ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''تو اچھا ہے اللہ تمہیں اس کے احسان کے چکانے کا بہترین موقع دے رہا ہے ساری زندگی اس کے ساتھ محبت کرو۔ اس کی خدمت کرو۔'' طاہرہ بیگم کو پھر بھی اس کے انکار کی منطق سمجھ نہ آ رہی تھی۔

''بی بی جان! محبت تو محبت ہوتی ہے کسی کے احسان کے بدلے میں دیا جانے والا اچھا سلوک نہیں اور پھر زید اتنا اچھا ہے کہ محبت اس کا حق ہے۔ ایسی محبت جو صرف اور صرف اسی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور میں...... میری محبت؟'' وہ مارے شرمندگی اور ندامت کے اور بھی جھک گئی۔

''تت...... تم ایسی باتیں مت سوچو...... محبت وحبت سب ہو جاتی ہے جب شادی ہو جائے تو اور یہ زید کی اپنی خواہش ہے۔'' طاہرہ بیگم نے جلدی سے کہا انہیں تو لفظ محبت سے ویسے بھی سخت الجھن اور گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس ''محبت'' نے آخر کسی کو کیا دیا تھا اب تک

سوائے دکھوں اور ذلت کے۔ کم از کم ان کے خاندان کی رگوں میں تو ''محبت'' اک زہر بن کر ہی اتری تھی جس نے اپنوں کو بھی پرایا کر کے رکھ دیا تھا۔

پہلے عبدالوہاب...... ان کے بڑے بھائی جو برسوں پہلے اسی محبت کا درد سینے میں چھپائے چھپائے اس جہان سے اٹھ گئے۔ انہیں اپنے بھائی جان یاد آ گئے اور ان کے دل میں ڈھیر ساری اداسی اور دکھ کی لہریں اٹھنے لگیں۔

اور پھر ان کی پیاری شبانہ۔ انہیں شبانہ کی جوان موت یاد آ گئی۔ وہ بھی عامر کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی اور پھر اس کی بے وفائی کے صدمے سے نبرد آزما ہوتے ہوتے یہ جہان ہی چھوڑ گئی اور اب یہ زائرہ؟

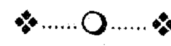
طاہرہ بیگم کو ایک جھرجھری سی آ گئی۔ یہاں تو کسی کا بھی انجام اچھا نہ تھا۔ کیسی ظالم اور کٹھور چیز ہے یہ محبت؟ انہیں اس محبت کے لیے اپنے جذبات میں کوئی گدازی محسوس نہ ہوئی۔

''بس زائرہ! اب کوئی بحث نہیں ہو گی۔ ہم لوگ تاریخ مقرر کر رہے ہیں۔''

وہ حتمی طور پر کہتی ہوئی وہاں سے چلدیں۔ زائرہ خاموش اور گم صم سی کتنی ہی دیر تک پتھر بنی کھڑی رہی۔

واقعی کس قدر بری تھی یہ محبت جس میں مبتلا ہو کر وہ یہ تک بھول گئی کہ وہ کسی کی بیٹی ہے کسی کی عزت ہے۔ وہ ایک لڑکی ہے جس کے لیے اس کی ''محبت'' سے زیادہ قیمتی متاع اس کی ناموس ہونی چاہئے۔ اس نے پچھتاوے اور ملامت کے ساتھ خود کو دیکھا اور اپنی آنکھوں کو زور سے رگڑ کر صاف کر دیا۔

''ٹھیک ہے اب میرے گھر والے جو بھی کریں میں دخل اندازی کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کروں گی۔''



مہ رخ کا کچھ پتہ نہ تھا شام ہونے کو آئی تھی اور فاطمہ بیگم کے دل پر قیامتیں گزر رہی تھیں۔

''میری بچی!''

''میری معصوم بیٹی!'' ان کا کلیجہ بار بار منہ کو آتا تھا۔ عبدالمالک کی حالت بھی ان سے جدا نہ تھی۔

''وہ کہاں جا سکتی ہے؟ سوچیں ناں امی جان؟'' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن کہیں نہیں جا سکتی۔

''امی جان! اس کی اپنے سسرال میں کسی کے ساتھ کوئی ناراضگی تو نہیں تھی۔'' وہ اور بھی

کئی زاویوں پر سوچ رہا تھا۔

''اس کے سسرال میں یہاں ہے کون؟'' فاطمہ نے اسے یاد کرایا کہ اس کے ساس سسر تو قطر میں رہتے تھے۔ مہ رخ تو یہاں پر تنہا اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی یا پھر اس کے سسرالی کچھ رشتہ دار اور تھے جو اپنے اپنے گھروں میں اتنے مصروف تھے کہ ان کے ساتھ لڑائی جھگڑوں کا کیا سوال؟

''کہیں...... کہیں مظہر کے ساتھ تو اس کی کوئی لڑائی وغیرہ...... کیا آج کل میں ان کی فون پر کوئی ایسی بات چیت ہوئی ہو۔'' وہ ماں سے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

''ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے عبدل! تم کیوں اسی جانب سوچے جا رہے ہو۔'' وہ روتے ہوئے بولیں

''تو پھر میں کیا سوچوں امی جان؟'' وہ جو ایک ذہین اور ہوشیار پولیس افسر تھا۔ اس وقت انتہائی بے بس اور قدرے سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا جانے کیوں اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو کر جڑے جا رہے تھے اور دماغ چٹختا جا رہا تھا۔

''میری بہن!

''میری مہ رخ! اور اس کا اغوا!'' وہ اتنا ہی سوچتا اور اس کے آگے اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگتیں۔

''عبدل! اٹھو کچھ کرو۔'' فاطمہ جان کئی بار اس سے کہہ چکی تھیں۔

''کیا کروں امی جان! میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔'' وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر پا رہا تھا اس کی جو سوچ ایک لڑکی کے بارے میں تھی اور عورتوں کے متعلق جس طرح کا ماحول اور معاملات وہ دن بھر دیکھتا تھا اس کے پس منظر میں اس کی سوچ عورت کے معاملے میں انتہائی سخت اور تنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو ہر وقت کسی نہ کسی شک اور وہم کا شکار رہتا تھا اس کی آئیڈیل عورت اسے اس معاشرے میں آج کہیں دکھائی نہ دیتی تھی یہی وجہ اس کی شادی کے نہ ہونے میں مضمر تھی اور اب اس کی اپنی بہن؟

''میرے اللہ!'' اس نے اپنے پھٹتے ہوئے دماغ کو دونوں ہاتھوں میں کس لیا۔

''عبدل! اٹھو اور جا کر اپنی بہن کو تلاش کرو۔ خدا جانے میری بچی کس قیامت سے گزر رہی ہو گی۔'' بالآخر فاطمہ چلا اٹھیں۔

''فضل داد آ گیا ہے اور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔'' انہوں نے اسے اطلاع دی انہوں نے ہی فضل داد کو فون کر کے گھر پہ بلایا تھا۔

"فضل داد کو بلا لیا آپ نے؟" وہ بے چین ہو کر اٹھا۔

"تو پھر میں کیا کرتی۔ تم تو پتھر بن گئے ہو۔" انہیں اس وقت عبدالمالک پر سچ مچ غصہ آ رہا تھا جو خواتین کے معاملات پر تو دن اور رات کا فرق دیکھے بغیر ہر طرح کا رسک لے کر بھی مستعد اور سرگرم رہتا تھا اب اپنی بہن پر برا وقت آیا تو پتھر ہو کر پڑ گیا تھا۔ کیوں؟ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی تھی۔

"کیا کروں..... کیا کروں میں۔ اپنی بہن کی ایف۔ آئی۔ آر کٹواؤں اور فورس تیار کر کے انہیں ہدایات دوں کہ ڈی، ایس، پی عبدالمالک کی بہن اغوا ہو گئی ہے اس کی برآمدگی کے لیے چھاپے ماریں؟" وہ عجیب ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ فاطمہ اسے یوں کرتا دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئیں۔

"بتائیں کیا کروں۔ اپنی بہن کی بدنامی کروں۔" وہ ایک دم سے شکستہ آواز میں بولا۔

"عبدل! سنو! کچھ بھی کرو مگر مجھے میری بیٹی چاہیے۔ لاکر دو کہیں سے بھی۔" وہ اس کا گریبان تھام کے کھڑی ہو گئیں۔

"وہ میری بیٹی ہے اور مجھے چاہیے۔ ورنہ..... ورنہ میں مر جاؤں گی اور تمہیں معاف کیے بغیر مروں گی۔" وہ اپنی آنسوؤں سے تر آنکھیں اس کی خشک اور ویران آنکھوں میں ڈال کر بولیں۔ عبدالمالک نے بغیر کچھ بھی کہے ان کے آنسو اپنی ہتھیلیوں پر اتارے اور اپنی یونیفارم کیپ اٹھا کر باہر چلا آیا۔ اس کے قدم جو وزن میں کئی کئی من کے ہو رہے تھے اٹھ ہی رہے تھے اور دل تھا کہ مارے خوف کے بند ہوا جا رہا تھا ہزار قسم کے واہمے اور شکوک اس کے لہو میں پھنکارنے لگے تھے۔ جنہیں وہ جھٹک جھٹک کے گرا رہا تھا۔

"نہیں..... نہیں میری بہن کو کسی نے ..... نہیں ہرگز۔" اس کے دل و دماغ یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھے۔

"السلام علیکم سر!" باہر کھڑے فضل داد نے اسے دیکھتے ہی سیلوٹ کیا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ تیزی سے جیپ میں بیٹھا۔

"کہاں صاحب؟" فضل داد گردن جھکائے پوچھ رہا تھا۔

"ہم پہلے ہسپتالوں کو دیکھتے ہیں۔ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کے گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اللہ نہ کرے سر جی!" فضل داد نے گھبرا کر کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔ کوئی اور برا ہونے سے تو یہی بہتر ہے۔" اس نے دل ہی

دل میں کہا۔ "گاڑی تیز چلاؤ۔"

"بس سر۔" فضل داد نے سعادت مندی سے کہا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔



رات کے آٹھ بج گئے تھے اور ڈی، ایس، پی فضل داد دیوانوں کی طرح سے شہر کے سارے ہسپتال کھنگالنے کے بعد کئی بڑے اخبارات کے دفاتر سے دن بھر کے واقعات کی خبریں بھی لے چکا تھا کہ کہیں سے کچھ سراغ مل سکے۔ مگر سب بے سود رہا تھا۔ اس کی والدہ کے فون بار بار آ رہے تھے اور خود اس کا دل بھی اک طوفان کے دھانے پر تھا۔ اک خطرناک آتش فشاں تھا جو اس پہاڑ جیسے دل تلے مچل رہا تھا۔ اِدھر وہ ذرا کمزور پڑتا اور اُدھر وہ پھٹ پڑتا۔

"سر جی! اغوا برائے تاوان والی فائلیں دیکھیں چل کر اور مشتبہ افراد سے....."

فضل داد نے اپنے طور پر خاصا دانشمندانہ مشورہ دینے کی کوشش کی۔

"اغوا برائے تاوان۔" عبدالمالک کے ماؤف دماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑا۔

"یاد ہے سر پچھلے دنوں آپ نے ایک بچے کو ایک ایسے ہی گروہ سے برآمد کرایا تھا۔" فضل داد نے اسے یاد کرایا۔ "اور ان میں ایک مجرم مارا گیا تھا ایک کو آپ نے گرفتار کیا تھا اور تیسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔" وہ عبدالمالک کے چہرے پر تفکر کی ابھرتی ہوئی لکیریں دیکھ کر تفصیل بتانے لگا۔ تب عبدالمالک کو یاد آیا کہ واقعی اس فرار ہونے والے کے بعد میں کئی مرتبہ فضول سے فون آئے تھے۔ اس نے کئی بار عبدالمالک کو دھمکیاں دی تھیں کہ وہ اسے دیکھ لے گا۔

اسے یاد آنے لگا کہ آخری فون تو تین چار روز قبل ہی آیا تھا جب اس نے بڑی بدتمیزی سے کہا تھا۔

"ڈی، ایس، پی عبدالمالک زیادہ دن نہیں ہیں جب تُو بھی خون کے آنسو پیئے گا۔"

وہ غم و غصے میں کہہ رہا تھا کیونکہ جو پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا وہ اس کا بھائی تھا۔ عبدالمالک نے اس وقت اس کی باتوں کا زیادہ نوٹس نہ لیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم سے جو بن پڑے کر لینا۔" اس نے اتنا جواب دے کر فون بند کر دیا تھا۔

فضل داد ذرا کسی قریبی موبائل کسٹمر سروسز پر تو چلو۔"

"جی سر!" فضل داد نے بجلی کی سی تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ اگلے چند منٹوں کے بعد وہ ایک کسٹمر سروسز کے مینجر سے بات کر رہے تھے۔ عبدالمالک نے اپنا موبائل نمبر اسے دے کر تعارف کروایا اور درخوست کی کہ وہ جلد از جلد اسے پورے پندرہ روز کی کالز کی

تفصیلات فراہم کرے۔ وہ یہ معلومات جیسے بھی لے۔ خود لے کر اسے فراہم کرے۔ اس کے ذمہ یہ کام لگا کر وہ اپنے اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں سے اس نے اس مجرم کی تصویر اور ریکارڈ حاصل کرنا تھا۔

❖......O......❖

کچھ ہی دیر میں وہ تمام معلومات اکٹھی کر کے اپنے مطلوبہ مقام کی طرف روانہ تھا۔

"سر جی! اگر ہم ایک دو سپاہی اپنے ساتھ لے لیتے تو اچھا ہوتا۔" فضل داد نے ہولے سے کہا۔

"فضل داد!" عبدالمالک نے اسے گھورتے ہوئے پکارا۔

"جی!" وہ اور بھی دھیمی آواز میں بولا۔ وہ سمجھا تھا عبدالمالک اب اسے ڈانٹے گا مگر وہ تو نہایت آرام سے پوچھ رہا تھا۔

"امی جان! تمہیں کیا سمجھتی ہیں؟"

"جی اپنا بیٹا ہی سمجھتی ہیں۔" وہ کچھ نا سمجھتے ہوئے بولا۔

"تو اس طرح سے مہ رخ تمہاری کیا ہوئی؟" وہ اور بھی تیکھے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"جی...... جی بہن۔" وہ بے چارا بے حد ڈر گیا تھا۔

"تو تم چاہتے ہو کہ تم اپنی بہن کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کو لوگوں کے لیے ایک پُرتجسس اور دلچسپ قصہ بنا دو۔ اس کا نام لوگوں کے لیے ایک چٹ پٹی خبر بنا دو۔"

"نن...... نہیں سر۔ ہرگز بھی نہیں۔" وہ تو مارے شرمندگی کے زمین میں ہی گڑ گیا۔

"تو کیا تمہیں اپنے زورِ بازو پر بھروسہ نہیں ہے یا مجرموں کو تیس مار خان سمجھنے لگے ہو۔" اب وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔ "نہیں سر! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا کسی کو ساتھ نہ لانا ہی درست ہے۔" اس نے جلدی سے کہا تا کہ بات ختم ہو۔

"کاش میں واقعی کسی کو اپنے ساتھ نہ لاتا؟" اس نے ایک کاٹ دار نظر اس پر ڈالی اور پھر منہ پھیر لیا۔ اسے واقعی فضل داد کو بھی ساتھ لاتے ہوئے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ان کا مطلوبہ قصبہ آ چکا تھا۔ یہ جگہ شہر سے کافی باہر تھی اور پسماندہ بھی اس لیے قصبہ ہی کہلاتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ ایک جنرل اسٹور کے مالک سے بات کر رہے تھے۔ یہ وہی جنرل اسٹور تھا جس کے پی۔ٹی۔سی۔ایل نمبر سے وہ فرار مجرم اسے دھمکی آمیز فون کیا کرتا تھا۔

"یہ شخص کہاں رہتا ہے۔" عبدالمالک نے اس کی فوٹو دکاندار کے سامنے کرتے ہوئے رعب سے پوچھا۔

"کک...... کون ہے یہ...... جی میں نہیں جانتا۔" دکاندار نے ایک نظر فوٹو پر ڈالی اور پھر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"اس کا نام خرم عرف چھوٹا بھائی ہے اور ایک مفرور مجرم ہے۔ چلو اب بتاؤ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟" اس بار فضل داد نے دکاندار کو گھور کے دیکھا اور اس کی گردن کی طرف اپنا آہنی پنجہ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"خرم چھوٹا بھائی۔ میں اس کو نہیں جانتا۔" دکاندار نے پھر بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جس پر عبدالمالک کا تحمل جواب دے دیا۔

"لگتا ہے یہ بھی اسی کا بڑا بھائی ہے۔ ایسے نہیں مانے گا اٹھا کر ڈالو اسے گاڑی میں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان کھینچا اور پھر چھوڑ دیا جس پر وہ لڑکھڑا گیا۔

"گگ...... گاڑی میں۔ نہیں نہیں...... بتاتا ہوں...... رکو تو۔" فضل داد نے جب اسے گھسیٹ کے دکان سے باہر نکالا تو وہ گھگھیانے لگا۔

"رحم کرو صاحب! مجھ پر رحم کرو۔ میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"اوئے بچے تو چھوٹے ہی ہوتے ہیں تو بکواس نہ کر سیدھا سیدھا پتہ بتا اس کا ورنہ......؟" اب فضل داد ایک روایتی پولیس مین کی طرح اسے ایک گھونسہ رسید کرتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"وہ...... وہ بڑا خطرناک ہے جی۔ مجھ سے دشمنی لگا لے گا۔" دکاندار پھر بھی ڈر رہا تھا۔

"میں اس سے بھی خطرناک ہوں۔ دفعہ 302 لگا کر اندر کر نا۔" فضل داد نے اپنا رعب ڈالا اور ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ بھی اسے جڑ دیا جس سے یقیناً اس کا جبڑا ہل کر رہ گیا ہوگا۔

"بس کریں جی...... کیوں بے قصور پر ظلم کرتے ہو۔" وہ اپنا لال سرخ گال سہلاتا ہوا باقاعدہ رونے لگا۔

"جلدی آگے لگ اور لے کے چل اپنے چھوٹے بھائی کے گھر پر۔" فضل داد نے اب اسے لاتوں پر رکھ لیا تھا وہ بھی تو ڈھیٹ تھا بہانے ہی بناتا چلا جا رہا تھا مان ہی نہ رہا تھا۔ مگر دو چار منٹوں کی مرمت کے بعد وہ بالکل سیدھا ہو گیا۔

"آیئے۔ آیئے۔ میں وہاں تک لے چلتا ہوں۔" وہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک نامکمل گھر کے سامنے کھڑے تھے یہ کوئی دس مرلے کا دومنزلہ گھر تھا جس کے مالک نے اسے شاید رقم ختم ہو جانے یا قرضہ منظور نہ ہونے کی وجہ

سے ادھوراہی چھوڑ دیا تھا۔

''مگر یہاں تو تالا لگا ہے؟'' فضل داد اس گھر کے گیٹ پر بڑا سا تالا دیکھ کر دھاڑا۔

''تالا تو باہر لگایا گیا ہے جان بوجھ کر...... اندر تو؟'' وہ معنی خیز انداز میں ادھوری بات بول کر انہیں دیکھنے لگا۔

''اچھا جب تمہیں اتنا سب پتہ ہے تو یہ بھی پتہ ہوگا کہ اندر اس وقت کون کون ہیں؟''

عبدالمالک نے اس کی گردن پھر سے دبوچ لی۔

''ارے...... ارے صاحب گردن تو چھوڑیں میرا دم گھٹ جائے گا۔'' وہ گلا دبنے کی وجہ سے کھانستا ہوا بولا۔

''چلو فوراً بتاؤ...... اور ہاں ڈرو مت...... تمہیں ہم کسی قانونی کارروائی میں نہیں الجھائیں گے۔''

فضل داد نے اسے یقین دلایا۔ تب وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''آج یہ لوگ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لائے تھے اور سنا تھا اسے یہ تاوان کی غرض سے نہیں لائے۔ بلکہ...... بلکہ...... اب میں کیا کہوں۔'' اس نے بات کو نہ بتا کر بھی اس کا مفہوم واضح کر دیا۔ ''بعد میں یہ لڑکی کو ماردیں گے۔ بلکہ شاید مار بھی چکے ہوں۔ اب تو بہت ہوگئی۔ جشن تو ہو بھی چکا ہوگا۔ اب تک۔''

''بکواس نہ کر۔'' فضل داد نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا اور کہا۔

''چل آگے لگ۔'' اس نے پستول کی نال اس کی کمر سے لگادی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔



زائرہ اور زید کا نکاح سادگی سے ہونا قرار پاچکا تھا۔ ٹھیک سات روز کے بعد جمعہ المبارک کے روز نماز جمعہ کے بعد نور محمد جیلانی اپنے سارے خانوادے کی موجودگی میں یہ نکاح خود پڑھانے والے تھے۔ جیلانی ہاؤس میں یہ پہلی شادی تھی جس کی تاریخ مقرر ہو جانے کے باوجود گھر میں ایک گہری خاموشی تھی۔ ایک ویرانی اور دل چیر دینے والی اداسی چھائی ہوئی تھی حالانکہ آج شاہانہ پھپھو اور شبانہ پھپھو بھی آئی ہوئی تھیں اور زید کے سبھی کزنز بھی وہاں جمع تھے۔ مگر سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ گھر کے بڑے میاں جی کے کمرے میں جمع تھے۔ وہ ہال کمرے میں آگیا جہاں اس کے سارے کزنز بیٹھے تھے اور چائے کا انتظار ہو رہا تھا۔

''ہائے گائز! Hi Guays!'' وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ میری شادی ہو رہی ہے اور تم سارے اس طرح سے منہ

لٹکائے بیٹھے ہو۔ کیا تم لوگوں کو کوئی خوشی نہیں ہے؟''

اس نے سب سے زیادہ منہ لٹکائے ہوئے سالار کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس کی دوستی سب سے زیادہ تھی سالار کے ساتھ۔

''ہٹو یار!'' اس نے اس کا ہاتھ ایک طرف کرتے ہوئے بے رخی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب ہٹو یار؟'' وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

''بڑے بے مروت ہو یار! دوست ہو کے بھی میری خوشی میں خوش نہیں ہو۔'' وہ یونہی سادگی میں اسے چھیڑ رہا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اسے اس قدر سنجیدہ جواب دے کر سارے ماحول کو اور بھی مکدر کر دے گا۔

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کسی کی خوشیوں کا قتل کر کے کب سے خوش ہونے لگے؟ اور یہ تم نے اداکاری کب سے شروع کر دی؟''

''کیوں...... کیوں میں نے ایسا کیا کر دیا کہ تم نے مجھے قاتل اور اداکار کہو۔'' زید نے جان بوجھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''یار! اگر تم زائرہ کو ہی پسند کرتے تھے تو پھر بے چاری عیون کو خوش فہم کیوں رکھا؟''

اب عادل بھی اس پر چڑھ دوڑا اور ابن نے سب کے سامنے یوں منہ بھر کے ایسی بات کہہ دی کہ زید بوکھلا کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہیں پر ایک کونے میں خاموش بیٹھی ہدیٰ بھی اٹھ کر اس کے پاس آگئی اور آنکھوں میں آنسو بھرتی ہوئی اس سے پوچھنے لگی۔

''زید بھائی! آپ تو ایسے نہیں تھے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا کیا میں نے میری پیاری بہن؟'' اس نے ہدیٰ کے سر پر پیار سے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے الٹا پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں؟'' وہ رو دی......

''آپ کو نہیں پتہ زید بھائی! عیون کیسے رو رہی تھی۔ اس نے تو جب یہ سنا تھا کہ آپ کی اور زائرہ آپی کی بات چل رہی ہے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا۔'' وہ بتانے لگی۔

''ارے بیوقوف ہے وہ اسے یقیناً میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ میں سمجھاؤں گا اسے؟'' زید نے اپنے درد سے بلکتے دل کو نظر انداز کر کے کہا۔

''محبت کوئی معمولی بات نہیں کہ کسی کو غلط فہمی ہو جائے۔ یہ اپنے ہونے کا یقین بغیر کسی اظہار کے بھی دلاتی ہے اور آپ اسے کیا سمجھائیں گے۔ پہلے خود کو تو سمجھالیں۔'' وہ اس کے ساتھ ناراض ہوتی ہوئی واپس وہیں پر جا کر بیٹھ گئی۔

"بہر حال یار! تُو نے ہم سب کا دل توڑ دیا اور ہمیں تو اعتبار ہی نہیں آ رہا کہ تم اتنے بڑے منافق بھی ہو سکتے ہو۔" سالار نے پھر اسے برا کہہ کر اپنا دل ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی کیا کرتا اسے زید کے ساتھ بہت محبت تھی اور عیون اور زید ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یہ خبر بھی اسے تھی اور اب زائرہ؟ اس کا تو دماغ پھٹنا تھا یہ سوچ کر، اس کا دل کسی طور پر یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

"تم لوگ جانے کیا کیا سوچ رہے ہو تبھی الٹی سیدھی باتیں کیے جا رہے ہو۔ زائرہ سے میری شادی نصیب کی بات ہے اور یہ بڑوں کا فیصلہ ہے۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"بڑوں کا فیصلہ...... ایسے کیسے ہو گیا بڑوں کا فیصلہ؟" ہدیٰ پھر بڑبڑائی۔

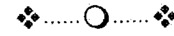
"پہلے تو بڑے جواد بھائی کے ساتھ کر رہے تھے زائرہ آپی کی شادی یہ اچانک آپ کیوں آ گئے اس معاملے میں؟" اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جا کر سیدھا میاں جی سے ہی پوچھ لے کہ وہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔

"ہوتے ہیں کچھ معاملات جو گھروں کے بڑوں کو ہی بہتر معلوم ہوتے ہیں بچوں کو ان میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی ان کے بارے میں غلط باتیں سوچنی چاہئیں......"

اس نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"مجھے تو لگتا ہے جواد بھائی نے کوئی پھڈا کیا ہے اور زید بھائی کو بڑوں نے قربانی کا بکرا بنا لیا ہے۔"

اس کی پشت پر ہدیٰ کی سرگوشی ابھری اور وہ اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دباتا ہوا بغیر مڑ کے دیکھے چلا گیا۔



"میری تو سمجھ سے باہر ہے بی بی جان! یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" شاہانہ بہت زیادہ ناراض تھی اور آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی ماں سے بات ضرور کرے گی۔

"ہم نے کیا کر دیا بھئی؟" طاہرہ بیگم کو بیٹی کا یہ اندازِ گفتگو پسند نہ آیا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے معاذ مجھے کتنے طعنے دیتے ہیں آج کل؟" وہ غصے کے ساتھ ساتھ غم میں بھی مبتلا تھی۔

"معاذ؟ طعنے دیتا ہے، لیکن کس لیے؟" طاہرہ بیگم سخت حیران تھیں انہیں یقین نہ آ رہا تھا کہ معاذ ایسے بھی کر سکتا ہے۔

"بی بی جان! زید اور عیون کے لیے میں نے برسوں سے سوچ رکھا تھا اور میں نے میرا

خیال ہے کئی بار آپ کو بھی اشارتاً کہا تھا کہ زید مجھے عیون کے لیے پسند ہے۔" وہ اصل بات کی طرف آ گئی۔

"زید اور عیون؟" طاہرہ بیگم کا دل جیسے شاہانہ نے مٹھی میں لے کر کس دیا ہو۔

"ہاں امی جان! زید اور عیون۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں نے تو معاذ کو بھی کسی اور طرف دھیان دینے ہی نہیں دیا تھا اور خود معاذ بھی تو زید کو پسند کرتے تھے۔" وہ اپنے شوہر کا حالِ دل بھی بتا رہی تھی۔

"اچھا۔" طاہرہ بیگم کے منہ سے اک آہ سی نکلی۔

"ایک تو وہ زائرہ والے اس میسج (Messcge) کے بعد سے ہی زید کی طرف سے مشکوک اور بددل ہو گئے تھے۔ مگر میں پھر بھی انہیں سمجھا رہی تھی ان کا ذہن اور دل اس معاملے کی طرف سے صاف کر رہی تھی۔ مگر اب تو...... اب تو مجھے صاف کہہ رہے ہیں" شاہانہ سے پوری بات کی ہی نہ گئی اور فرطِ جذبات سے اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"کک...... کیا کہہ رہا ہے وہ؟" طاہرہ بیگم اپنا پریشان دل تھام کے بیٹھ گئیں۔

"وہ کہتے ہیں لو اب دیکھ لو۔ ہو گیا ناں ثابت کہ زید کا زائرہ کے ساتھ افیئر تھا اور...... اور وہ کہتے ہیں تمہارے گھر والوں نے اپنے بچوں کے برے لچھنوں پر خوب پردے ڈال کر ہمیں بیوقوف بنایا۔" آخر وہ رو ہی پڑی۔

"ہائے۔ ایسے کہتا ہے معاذ! کیا ہو گیا معاذ کو۔" بی بی جان کا تو مارے صدمے کے رنگ ہی فق ہونے لگا۔

"بیٹا! تم اسے سمجھاؤ کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔" میاں جی جو کب سے چپ بیٹھے تھے نرمی سے بولے۔

"کیا سمجھاؤں میں انہیں یہ سچ بھی تو ہے۔" شاہانہ کا دل بھی اب تو اس بات کو سچ سمجھ رہا تھا اس لیے اس کے منہ سے بھی نکل گیا۔

"شاہانہ تمہاری سوچ بھی معاذ کے ساتھ ساتھ اتنی سطحی ہو جائے گی۔ میں یہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔" میاں جی کو بیٹی کی بات اچھی نہ لگی تو وہ افسوس سے بولے۔

"میاں جی! معاف کر دیں مجھے، لیکن آپ ہی بتائیں میں اور کیا سوچوں؟"

وہ باپ کے سامنے سوالیہ نگاہیں کیے کھڑی تھی جن میں اپنی سوچ پر شرمندگی بھی تھی اور بے بسی بھی۔

"دیکھو! شاہانہ! بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو دامادوں کے ساتھ نہیں بھی کی جا سکتیں۔"

طاہرہ بیگم اسے سمجھانے لگیں۔

"لیکن بیٹیوں کو بھی ان سے بے خبر رکھا جائے یہ تو درست نہیں۔" وہ ماں سے شکوہ کرنے لگی کہ اگر انہوں نے اس سے کوئی بات چھپائی ہے تو کیوں؟

"ہوسکتا ہے کچھ معاملات بیٹیوں سے بھی اس لیے چھپائے جانے ضروری ہوں کہ ان کے دل نہ دکھیں۔"

میاں جی نے محبت سے اسے کہا۔

"بیٹیاں تو والدین کے دکھ بٹا لینے کی استطاعت رکھتی ہیں ابا جان! آپ لوگوں نے ہم پر کچھ بھروسہ نہیں کیا؟"

وہ اپنے والد کی آنکھوں میں اک گہرے دکھ کی پرچھائی دیکھ کر پریشان ہوگئی اور اصرار کرنے لگی کہ اسے وہ بات بتائی جائے جو اس سے چھپالی گئی ہے۔

"ضد کیوں کر رہی ہو شاہانہ؟" طاہرہ بیگم کو اس کی ضد سے ڈر لگ رہا تھا۔

"مت سمجھاؤ طاہرہ! رہنے دو۔" میاں جی نے طاہرہ بیگم کو نرمی سے روکا اور خود شاہانہ سے مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہے تم لوگ کل دوپہر کے کھانے پر آجاؤ۔" وہ شکست خوردہ سے لگ رہے تھے۔

آپ خود فون کر کے معاذ کو مدعو کر لیجیے گا کھانے پر۔ وہ کچھ ناراض ہیں ہے نا۔ اس لیے؟" شاہانہ نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھی بات ہے میں فون کرلوں گا۔ بلکہ شبانہ کو بھی اس کے شوہر کے ساتھ بلا لیتا ہوں تاکہ بعد میں اسے کوئی گلہ نہ ہو۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔

"لیکن میاں صاحب! آپ گھر کے بھید دامادوں کے سامنے کھولیں گے۔ تو وہ کل کو...... سنا نہیں کہ معاذ تو ابھی اسے طعنے دے رہا ہے۔" طاہرہ بیگم فکرمندی سے بولیں۔

"میرے داماد میرے بیٹے ہیں اور پھر میری بیٹیوں کو مجھ سے کوئی گلہ اپنے شوہروں کو لے کر ہو۔ یہ میں نہیں چاہتا۔" انہوں نے شاہانہ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولی۔

"سوری۔ میاں جی!"

"کوئی بات نہیں۔ جو تم نے سوچا اور جو کہا وہ ایک فطری عمل تھا۔ مجھے برا نہیں لگا اچھا ہوا کہ تم نے گلہ کر دیا ورنہ یہ بدگمانی نہ معلوم کیا کر ڈالتی۔"

میاں جی نے گہرے رنج سے کہا اور پھر۔

"اچھا بیٹی! پھر کل کھانے پر ملاقات ہوگی۔" کہہ کر باہر چلے گئے۔ جبکہ شاہانہ اپنی اداس اور پریشانی میں مبتلا ماں کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تاکہ ان کا دھیان بٹے اور جو سوگوار سا ماحول اس کی شروع کی ہوئی بات سے بن گیا وہ تو کچھ تبدیل ہو۔

❖......O......❖

مہ رخ کو سخت بخار تھا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بس یہی بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے تو نے میری عزت بچالی۔" اور فاطمہ خان اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر روئے جاتی تھیں اور پیار کیے جاتی تھیں۔ کبھی اٹھتیں اور جائے نماز پر سجدہ ریز ہو جاتیں۔

واقعی رب عظیم نے ان پر کس قدر بڑا احسان کر دیا تھا ان کی بچی خیر و عافیت اور اپنی عزت کی پوری تقدیس کے ساتھ گھر لوٹ آئی تھی۔ ان کا دماغ بار بار اس سوچ پر ٹھہر جاتا اور ان کی رگ رگ میں جیسے چنگاریاں بھر جاتیں کہ اگر۔

"خدانخواستہ عبدالمالک کو وہاں پہنچنے میں دیر ہو جاتی؟"

تو کیا ہوتا؟" اس کے آگے ان کے جسم سے رُوح کھنچنے لگتی اور وہ اپنے اللہ کے سامنے سجدے میں گر جاتیں۔

"اے مہربان ہستی!"

"اے مالک کون و مکاں!

بے شک تُو بڑا رحیم و کریم ہے۔

بے شک تُو خود بڑی عزت والا ہے۔

اور بے شک تُو ہی ہے عزتوں کی حفاظت کرنے والا۔

اے میری سانس سانس پر اختیار رکھنے والے!

تیرا شکر کہ تُو نے مجھ کم ذات...... کم حیثیت۔

گناہ گار و خطا کار پر اپنی یوں نظر کرم کی کہ میری بچی کی ناموس کو پاک رکھا۔

بے شک یہ تیری ہی مہربانی ہے کہ تُو نے ان درندوں کے چنگل میں بھی میری ردا کی حفاظت فرمائی۔

اب مجھے توفیق دے مولا! کہ میری باقی تمام عمر تیرا شکر ادا کرنے میں گزر جائے مجھے اپنی شکر گزار اور فرمانبردار بندی بنا لے۔

میرے بچوں کو تُو صراطِ مستقیم پر اتنی استقامت عطا کر کہ انہیں جب موت بھی آئے تو تیری ہی رضا پر عزت اور شہادت کی آئے۔

مالک! مجھ پر اپنا کرم اپنا رحم اسی طرح کیے رکھنا۔" وہ رونے لگتیں تو ان کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

عبدالمالک کی عجیب پاگلوں والی حالت تھی۔ وہ تو جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے تو کچھ بھائی نہ دے رہا تھا کہ اس کے ساتھ آخر ایسا ہوا ہی کیوں۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کی حالت میں بھی نہ تھا کہ اس کے دل اور دماغ تو اسی ایک نقطے پر ہی جامد و ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تو بس یہی سوچے جا رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کیا خطا کی تھی۔

اس کا ایسا کون سا گناہ تھا۔

کون سی برائی تھی جس کی اسے یہ سزا ملی تھی اور سزا بھی ایسی اذیت ناک اور عبرتناک، وہ تو خود کو اتنا ذلیل اور کمتر سمجھنے لگا تھا کہ اسے خود اپنا آپ اچھا نہ لگ رہا تھا۔

"وہ عبدالمالک! جس نے بچپن سے لے کر جوانی تک کبھی کسی لڑکی کو بری نظر سے دیکھا تک نہ تھا، یہی سوچ کر کہ اس کی اپنی ایک بہن ہے، ہر کسی کی بہن، بیٹی کی عزت کی تھی۔

تاکہ اس کی بہن کو دنیا میں عزت ملے۔

دوسروں کی عزت کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر کی تھی تاکہ اس کی عزت پر اس کی بہن پر کبھی کوئی میلی نگاہ نہ اٹھے۔

پھر؟

پھر کیوں اس کی بہن کے ساتھ یہ ہو گیا۔

کس قدر اذیت ناک تھا وہ منظر جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔

نہ صرف اس کی آنکھوں نے بلکہ فضل داد...... فضل داد بھی تو تھا اس کے ساتھ اس کی وہ بہن جسے اس نے سات پردوں میں چھپا کر رکھا تھا۔

وہ اس معاشرے کے سب سے کمینوں اور بدکرداروں کے پاس تنہا تھی۔ وہ...... وہ شیطان کس طرح سے اس کے قریب تھے اور اسے ستا رہے تھے۔

اگر......

اگر وہ چند لمحے بھی مزید دیر سے پہنچتا تو......

"تو...... نہیں...... نہیں" وہ دیوانوں کی طرح اپنے مکے کبھی دیواروں پر برسانے لگتا اور کبھی اپنے بال نوچنے لگتا۔

وہ ایک شدید صدمے سے دوچار تھا۔

"میں کیا کروں؟

"اب میں کیا کروں؟ مہ رخ کو......؟" اس کے اندر اک آگ تھی جو بھڑکتی جا رہی تھی اس

کی غیرت اتنی بے چین تھی۔ اتنی مشتعل تھی کہ اسے اپنے آپ سے۔ اس معاشرے سے۔ پور
دنیا سے حتیٰ کہ مہ رخ سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا مہ رخ کی وجہ سے
اب کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ نہ فضل داد کے سامنے۔ نہ خود اپنے سامنے۔
اس کا دل خناس سے بھر گیا۔ اس کے اندر اپنے آپ اور اپنی بہن سے اتنی گھن بھر گئی ک
وہ مرنے اور مار دینے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

"مہ رخ کو مار دیتا ہوں۔ نہ وہ ہوگی نہ اسے کسی کی بات سننی پڑے گی؟" یہ خیال ایک
سیاہ ناگ کی طرح اس کے دماغ میں گھسا اور پھر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔
یہی ٹھیک ہے؟" اس کے اندر کے تنگ نظر اور انتہا پسند عبدل نے اس کی سوچ کو عملی جام
پہنانے کی طرف راغب کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس کے بعد کیا کرو گے؟

لوگوں پوچھیں گے تو لوگوں کو کیا جواب دو گے؟

ایک ڈرا سہما سا سوال کہیں سے سرک کر اس کے دل میں آ گیا۔

لوگوں کا سامنا کرنے اور انہیں جواب دینے کی ضرورت کیا ہے؟

اس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا ناگ پھنکارا۔

"تو پھر؟" وہی سوال منمنایا۔

"مہ رخ کے بعد خود کو بھی؟"

"خود کو بھی۔" ایک یخ کر دینے والی سردی اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا گئی۔

"تو کیا تم بزدل ہو؟" سیاہ ناگ زہر چھوڑنے لگا۔

"ہرگز بھی نہیں۔" اسی انتہا پسند عبدل نے اکڑ کر کہا۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے؟" وہ زہر تیزی سے پھیلتا ہوا پورے لہو میں حل ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" عبدالمالک نے فیصلہ کیا اور اس کی رگوں میں نیلا پڑتا لہو آ کر اس کے دماغ پر جم گیا۔



رات کے تقریباً دو بجے کا وقت تھا جب فاطمہ کی آنکھ کسی کی آہٹ کے ساتھ کھل گئی۔

"کون؟"

"کون ہے؟"

وہ گھبرا کر اٹھیں۔ کمرے کی نیم تاریکی میں انہیں ایک سایہ مہ رخ کے پلنگ کے پاس

دکھائی دیا۔

''کک......کون ہے؟''

''میں پوچھتی ہوں کون ہے۔'' وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھیں اور ہر بات سے بے خطر ہو کر اس سائے پر جا پڑیں۔

ٹرر......ٹ......ٹرر......ر'' ایک ساتھ دو گولیاں چلیں اور فضا میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ رات کے سناٹے کو چیر دینے والی چیخ...... جو چند ہی لمحوں میں ایک کراہتی ہوئی سسکی میں تبدیل ہوئی اور پھر دم توڑ گئی۔

ایک ساتھ چلنے والی دو گولیوں نے فاطمہ کے جسم سے روح کھینچ کر ان کے مساموں میں اٹکا دی تھی اور وہ کانٹوں کی جھاڑیوں پر پڑے ململ کے ٹکڑے کی مانند تھیں کہ اگر ذرہ برابر بھی ہلیں تو پھر اپنے لیر لیر ہونے والے وجود کو کبھی جوڑ نہ سکیں گی۔

''امی......

''امی جان!''

مہ رخ کی آواز ہی نہیں اس کے ہاتھ بھی کپکپا رہے تھے۔

''مہ رخ۔''

''میری بچی!

''میری حیات!''

انہوں نے اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔

''امی جان۔'' اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اور خوف سے کانپتا ہوا وجود فاطمہ کے لیے سوہانِ روح تھا۔

''میں...... میں دیکھتی ہوں۔'' وہ ہمت کر کے اٹھیں۔ وہ روشنی کو بڑھا کر یہ دیکھنے کی سکت اب بھی خود میں نہ پا رہی تھیں کہ چلنے والی گولیوں نے کس کو چھلنی کیا ہے کوئی تو تھا جو وہاں موجود صوفے پر ڈھیر تھا۔ مگر کون؟

انہوں نے بمشکل ہاتھ بڑھ کر ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کیا اور اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

''امی...... بھائی؟'' مہ رخ کی چیخ نے انہیں ایک ہی جھٹکے میں کانٹوں پر سے گھسیٹ لیا اور وہ چیتھڑے ہو کر گر پڑیں۔

''میرا عبدالمالک۔''

وہ عبدالمالک کے گرد پھیلے ہوئے خون کو دیکھ کر دیوانی ہو گئیں۔

''عبدل!''

''عبدل!''

وہ پاگلوں کی طرح صوفے پر بے سدھ پڑے عبدالمالک کو جھنجھوڑ رہی تھیں جس کے کندھے سے ابلنے والا لہو تیزی سے ارد گرد پھیل رہا تھا۔

''ایمبولینس کو فون کرو مہ رخ!'' انہوں نے عبدالمالک کے ابلتے ہوئے لہو پر اپنا دوپٹہ کس کر باندھتے ہوئے مہ رخ کو زور سے کہا۔

''جی امی۔'' مہ رخ نے بجلی کی سی تیزی سے فون کیا۔ اگلے چند منٹوں میں ''1122'' کی ایمبولینس ان کے دروازے پر تھی۔ فاطمہ اور مہ رخ دونوں ہی عبدالمالک کے ساتھ ہسپتال جا رہی تھیں۔ فاطمہ کا دماغ اس وقت بالکل ماؤف تھا اسے سوائے اپنے بیٹے کی جان کے بچ جانے کے کچھ اور سجھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے بازو میں کندھے پر اور اس کے ذرا نیچے دو گولیاں پیوست تھیں اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب اور سست ہو رہی تھیں اور اس سے بھی زیادہ فاطمہ کی نبضیں بیٹھتی جا رہی تھیں۔

یہ کیسے ہو گیا؟

کس نے کیا؟

مہ رخ کے دماغ میں البتہ ان سوالات نے کچھ الجھن ڈال رکھی تھی۔ مگر وہ انہیں جھٹکتی ہوئی اپنے بھائی کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

❖......O......❖

زائرہ کو جب معلوم ہوا کہ گھر والے اس کی شادی زید کے ساتھ کر رہے ہیں تو وہ تڑپ اٹھی۔

''زید اور میں؟''

اس کا دل مارے رنج اور ندامت کے رونے لگا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اب اس کی اپنی کوئی پسند تھی اور نہ ہی یہ تھی کہ زید اس کے لیے مناسب نہ تھا۔ یہ باتیں سوچنے کا حق تو اس نے خود اپنے آپ سے چھین لیا تھا۔ زید اس کا محسن تھا۔ زید تو اس کے معیار سے بھی کہیں زیادہ بلند تھا اور پھر زید عیون کو پسند کرتا تھا۔

وہ اس معصوم کی محبت کو ایک بار پھر اپنے کسی مفاد پر قربان ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ زید کے پاس چلی آئی تھی۔

''السلام علیکم خالہ جان!'' وہ پہلے سیدھی تکلم کے پاس آئی تھی۔

''وعلیکم السلام۔ آؤ۔ آؤ کیسی ہو؟''

وہ کچن میں مصروف تھیں اسے دیکھتے ہی اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئیں اور پیار سے بولیں۔

”خالہ جان! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی۔

”ہاں...... ہاں کہو میری جان! ایک نہیں دس باتیں کہو۔ آؤ میرے کمرے میں چلتے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”خالہ جان! بی بی جان کے پاس چلتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اعتماد کے باوجود اک شرمندگی تھی یہ شرمندگی تو اب اس کی ذات کا لازم حصہ بن چکی تھی۔

”بی بی جان کے پاس؟“ تکلم بیگم ایک لمحے کو رکیں...... پھر مسکرا کر بولیں۔

”ہاں چلو۔“ وہ دونوں ایک ساتھ بی بی جان کے کمرے میں گئیں تو میاں جی اور بی بی جان دونوں ہی چونک اٹھے۔ وہ دونوں اخبار سامنے رکھے کسی خبر پر بات کر رہے تھے۔ اس وقت۔

”السلام علیکم میاں جی...... بی بی جان!“

زائرہ اور تکلم بیگم دونوں نے باری باری سلام کیا۔

”وعلیکم السلام...... جیتی رہو۔“ میاں جی نے اٹھ کر ان دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”آؤ ادھر آجاؤ۔ میرے پاس۔“ بی بی جان نے اپنے تخت پوش پر جگہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئیں۔ زائرہ نے بات شروع کی۔

”بی بی جان! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ بے حد سمٹی ہوئی اور کسی بوجھ تلے دبی ہوئی۔

”کہو میری جان! پورے اعتماد سے کہو۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ میاں جی بھی پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آج میں اس لیے یہ بات کہنے آگئی ہوں کہ بیتے ہوئے کل میں مَیں نے اپنی غرض اور جھوٹی انا کی خاطر ایک بہت بڑا بہتان کسی پر لگا دیا تھا۔

”اس جرم نے مجھے زندگی بھر کے لیے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ اپنے ضمیر کا جہنم...... جواب عمر بھر مجھے جلائے گا۔ پھر نیا وجود بخشے گا اور پھر جلائے۔ جلاتا ہی رہے گا۔“

باوجود ضبط کے وہ اپنی سسکی نہ روک سکی۔

”میری بچی!

بھول جا...... جو گیا سو ہو گیا۔“

بی بی جان نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو اپنے گالوں سے لگا کر اسے تشفی کرائی۔ وہ اس کی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔

”بی بی جان! زید بہت اچھا ہے۔ بلکہ عظیم...... وہ میری ذات سے اتنی بلندی پر کھڑا ہے کہ میں اسے دیکھنے کے لیے ایڑیاں اونچی کر کے بھی آنکھیں اوپر کو کھولوں تب بھی میری بصارتیں چندھیا جائیں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں بی بی جان!“

اس نے اپنا سر بی بی جان کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

”ایسا نہیں ہے زائرہ! وہ ایک انسان ہے...... بالکل ہم جیسا ایک انسان۔“

تکلم بیگم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کی تو میں عمر بھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر خدمت کرتی رہتی تو اپنی خوش نصیبی سمجھتی۔ مگر؟“

وہ بدستور سسک رہی تھی۔

”مگر کیا؟...... کہو زائرہ...... اپنی پسند ناپسند بتانے کا حق اب بھی تمہیں حاصل ہے۔ اسلام تو ایسا پیارا دین ہے جو عورت کو اس روئے زمین پر سب سے زیادہ عزت اور حقوق دیتا ہے۔“ میاں جی نے آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دیا۔

”میاں جی! آپ کسی سے بھی میری شادی کر دیں...... مگر زید نہیں۔“

وہ التجا کرتی نظریں ان کے چہرے پر لگا کر بولی۔

”میاں جی! زید اور عیون ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ سمجھیں پلیز۔“

اب وہ اپنے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے ملتجی تھی۔

”زید اور عیون؟“ طاہرہ بیگم نے ایک سرد آہ بھری...... یہ بات وہ بھی جانتی تھیں اس لیے ان کا دل بھی میاں جی کے اس فیصلے پر دکھی تھا۔

”مگر زید نے خود کہا ہے کہ تم سے۔“ میاں جی کی زبان اٹکنے لگی۔

”وہ آپ سب کا دکھ اپنے دل میں سمونا چاہتا ہے۔

وہ جواد کے ٹھکرانے کے بعد خود مجھے اپنا کر عزت دینا چاہتا ہے۔

وہ میرا درد کم کرنے کے لیے اپنی زندگی کو اک زخم بنا لینا چاہتا ہے۔“

”سمجھیں میاں جی پلیز۔“

وہ انہیں ہی نہیں بلکہ تکلم بیگم اور بی بی جان کو بھی سمجھانا چاہتی تھی۔

”وہ بہت بڑے دل والا ہے۔ مگر عیون...... وہ کتنی معصوم ہے۔ کتنا کمزور سا دل ہے

اس کا وہ۔ وہ تو مر ہی جائے گی۔ بی بی جان!

اور پھر میں؟

کیا میں خوش رہ سکوں گی۔ دو دلوں کو برباد کر کے۔ مجھ پر تو پہلے ہی اپنی خود غرضیوں کا بہت بوجھ ہے...... مجھے اور تو...... بی بی جان......! میں میں۔"

وہ ادھورے جملے کہتے کہتے ہچکیاں لینے لگی۔

"مجھے معاف کر دیں۔ آپ سب مجھے معاف کر دیں۔ میں تمام عمر اسی گھر میں آپ سب کی خدمت کرتی رہوں گی۔ مجھے اور احسانوں تلے نہ دبائیں۔" وہ ہاتھ باندھے ان تینوں کے سامنے بار بار معافیاں مانگ رہی تھی۔

"اچھا...... اچھا مت کرو۔ مت روؤ۔ ایسے مت سوچو۔ کچھ نہیں کیا تم نے......اور کچھ نہیں ہوا کہ تم خود کو اتنا ذلیل سمجھو۔ اللہ نے ہم سب کی عزت رکھ لی۔ بس اسی کا احسان ہے۔"

بی بی جان نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور چپ کرانے لگیں۔

"جیسے تم کہہ رہی ہو۔ اسی طرح سے ہوگا تم فکر نہ کرو۔"

میاں جی نے بھی اسے تسلی دی۔ تکلم بیگم بھی اس کے آنسو صاف کرتی کرتی رو پڑیں۔

"مگر زید کو کون سمجھائے گا اور معاذ بھائی کو کیسے راضی کریں گے۔ وہ تو......؟" انہیں زید اور معاذ دونوں کی فکر لاحق ہوگئی وہ جانتی تھیں دونوں کو منانا کوئی آسان کام نہیں۔

"معاذ کو کل میں نے سب کچھ سچ سچ بتا تو دیا تھا۔"

میاں جی نے کل کے دوپہر کے کھانے پر ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا جو انہوں نے اپنے دونوں دامادوں کے اعزاز میں اسی لیے کیا تھا تاکہ وہ انہیں گزرنے والی قیامت کے بارے میں بتا دیں۔

"ہاں وہ سمجھ تو گیا تھا کہ زید بے قصور تھا۔ ورنہ تو وہ زید کو جانے کیا سمجھنے لگا تھا۔"

طاہرہ بیگم نے بے ساختہ ہی کہہ دیا۔ زائرہ کو بے چینی سے پہلو بدلتا دیکھ کر وہ پھر جلد ہی سنبھل بھی گئیں۔

"میرا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ ایک معاملہ تو سلجھ گیا تھا۔ اب دوسرا سوال بھی ڈال دیں گے۔"

"ہاں وہ تو کسی نا کسی طرح سے مان ہی جائے گا، لیکن عمیس ...... وہ تو شادی کی تیاریوں میں لگ چکا ہے۔ اب پھر اسے یہ صدمہ۔"

"بابا سے میں خود بات کر لوں گی۔" وہ آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

"تم...... نہیں تم رہنے دو۔ میں کرتا ہوں اس سے بات۔" میاں جی نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو آپ نے مجھے حوصلہ دیا کہ میرے حقوق سلب نہیں ہوئے۔ میرے پاس ابھی اختیار باقی ہے۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔ پھر کہنے لگی۔

"میاں جی! آج سے پہلے میں نے اپنے بابا سے جب بھی بحث کی اپنی فضول خواہشوں کو منوانے کے لیے کی۔ اپنے ہی جھوٹی اغراض کے لیے کی۔ مگر اب تو میں کسی کی خوشیوں کے لیے ان سے بات کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں انہیں قائل کر ہی لوں گی۔"

وہ سنجیدگی اور اعتماد سے بولی۔ جس پر باقی سب کو بھی کچھ حوصلہ ہوا اور وہ سر ہلا کر بولے۔ "ٹھیک ہے جو اللہ کو بہتر منظور ہوا۔"



عبدالمالک کو ہوش آ چکا تھا۔ مگر وہ بدستور آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

"مبارک ہو سر! آپ خطرے سے باہر ہیں۔" اس کے کانوں میں مبارک دینے والی یہ پہلی آواز فضل داد ہی کی تھی۔

"شکر ہے کہ مہ رخ بہن نے فوراً ہی خون دے دیا۔ ورنہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "او نیگٹو" خون کا ملنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔

"مہ رخ۔" اس کی آنکھیں بے ساختہ ہی کھل گئیں۔

"میرا بچہ...... میرا لعل۔" فاطمہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس پر جھک گیا۔

"میرا رب کیسا کریم ہے۔ کتنا مہربان ہے مجھ پر۔"

وہ اس کا ماتھا چومتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

"ماں جی یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے جو رات بھر سے جائے نماز جھکی ہوئی گڑگڑا رہی تھیں۔" فضل داد اپنے سینے پر ہاتھ باندھے عقیدت سے فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

"میں کیا اور میری اوقات کیا؟

بے شک وہی اپنی مخلوق کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ ان کا درد برداشت نہیں کر پاتا اور فوراً ہی اپنے بندوں کے درد راحتوں میں بدل دیتا ہے۔"

وہ اپنے ہاتھ توبہ کے انداز میں باندھے ہوئے اوپر دیکھتیں اور پھر عبدالمالک کو پیار کرنے لگتیں۔

"مہ رخ کہاں ہیں امی جان!"

"وہ سر! مہ رخ بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں انہیں گھر چھوڑ آیا تھا۔" فضل داد پھر بولا۔

"گھر پر...... مہ رخ کو...... تنہا؟" وہ پریشان ہوا تھا۔

"نہیں سر جی ان کے پاس میری زوجہ ہیں اور پھر رحیم بخش بھی ڈیوٹی پر ہے وہاں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ مسکرا کر اس کے قریب آ گیا۔

"فضل داد!" وہ اس کی طرف سوال کرتی آنکھیں اٹھا کر بولا۔

"یس سر!" فضل داد مسکرا کر اس کے کچھ اور قریب ہو گیا اور پھر بولا۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں سر جی! میں نے نہ معلوم افراد کے خلاف ایف۔ آئی۔ آر کٹوا دی ہے جو ڈکیتی کی غرض سے آئے تھے اور فائرنگ کے تبادلے پر آپ بھی زخمی ہو گئے۔"

اس نے سنجیدگی کے ساتھ بتایا جسے سن کر فاطمہ کی سوالیہ نگاہوں کو بھی کچھ قرار محسوس ہوا۔ ورنہ رات سے اس کے دماغ میں بار بار یہ سوال کلبلا رہا تھا جس کا جواب ابھی فضل داد نے دیا تھا۔

"تھینک یو۔ فضل داد۔"

وہ احسان مند نگاہوں سے اسے تکتا ہوا بولا۔

"بھائیوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے سر۔"

وہ بھی ذرا سا مسکرایا۔

"اور بھائیوں کو ہر وقت...... سر! سر! بھی نہیں کہتے۔"

فاطمہ نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگا کر پیار سے ڈانٹا۔

"جی ماں جی۔" وہ ادب سے ان کے سامنے اور بھی جھک گیا۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔ دونوں جہاں میں عزت پاؤ۔"

انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں جنہیں سنتے ہی عبدالمالک کے ہونٹوں سے نکلا۔ "آمین۔"



جتنے دن عبدالمالک ہسپتال میں رہا مہ رخ اس پر چھاؤں ہوئی رہی۔ وہ اگرچہ اپنے بھائی سے نظریں تو نہ ملاتی تھی مگر چپ چاپ اس کے کام کرتی رہتی تھی۔ وہ اسی روز شام کو ہی گھر سے آ گئی تھی اور جب فاطمہ نے اسے پوچھا کہ "وہ کیوں ہسپتال آ گئی ہے حالانکہ اس کی تو اپنی طبیعت خراب تھی۔" تو وہ کہنے لگی۔

"امی جان! میرا بھائی یہاں بستر پر پڑا ہے اور میں وہاں اتنی دور گھر پر آرام کیسے کر سکتی

تھی؟" پھر اس نے اپنی ماں کو زبردستی گھر بھیج دیا۔

اس کا شوہر واپس آ چکا تھا اور عبدالمالک کو گولی لگنے کا سن کر وہ فوراً ہی ہسپتال آ گیا تھا۔

"مہ رخ...... اب تم اپنے گھر چلی جاؤ۔"

عبدالمالک نے کہا تھا۔

"آپ کو اس طرح سے چھوڑ کے؟"

اس نے اپنی زخمی نگاہیں اس پر گاڑ دی تھیں۔

"میں اب ٹھیک ہوں اور پھر میرے پاس فضل داد ہے۔ یہ سسٹر ہے۔"

عبدالمالک نے اپنے قریب کھڑے فضل داد اور نرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں مگر ان دونوں کے سینوں میں میرا دل نہیں ہے۔"

وہ آنکھوں میں نمی لیے ہوئے تھے۔ تب عبدالمالک کی نگاہیں اس کے چہرے کی پاکیزگی کو تکتے تکتے زمین میں گڑ گئیں اور پھر اس کے ہونٹ بھی جیسے سل گئے۔ مہ رخ کا شوہر بخوشی چلا گیا یہ اجازت دے کر وہ چند روز اور اپنے بھائی کے ساتھ رہ لے۔ اب مہ رخ تھی اور اس کی بے لوث عیادت تھی۔ عبادت جیسی خدمت تھی۔

عبدالمالک اگر کروٹ لیتے وقت ذرا سا کراہتا تب بھی تڑپ جاتی اور جب اس کی ڈریسنگ ہوتی تو وہ سسٹر کے ساتھ خود کھڑی ہو کر اس کی پٹی کرواتی۔ سسٹر مسکرا کر کہتی۔

"اگر کوئی "یک جان دو قالب" کی زندہ مثال دیکھنا چا... کر مہ رخ اور آپ سے مل لے۔"

"مجھ سے؟"

عبدالمالک نے شرم سے نظریں چرا لیں۔

"یوں کہیے کہ اگر کسی نے بہن کی محبت اور عظمت کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو وہ میری بہن کو دیکھ لے۔"

اس نے مہ رخ کی طرف سے شکر گزار نگاہوں سے دیکھا۔



رات کے تقریباً اڑھائی بجے کا وقت تھا جب اس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اسے اپنے کندھے میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس نے چاہا کہ وہ دو گھونٹ پانی سے کوئی گولی درد سے نجات کی نگل لے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی صوفے پر پاؤں اوپر کیے۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے وہ سو رہی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی اسے دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے پر ایسی بلا کی معصومیت تھی کہ وہ محو ہو گیا۔

اس کا بے داغ صبیح چہرہ۔ اس وقت کسی پاکیزہ سے نور کے ہالے میں تھا۔

''بھیا! آپ میری سالگرہ پر کیا دیں گے؟''

وہ کوئی پانچ چھ برس کی تھی جب پیار سے اسے پوچھ رہی تھی۔

''تمہاری سالگرہ ہے۔ کب؟'' اس نے شرارت سے انجان بنتے ہوئے کہا تھا۔

آپ بھول گئے۔ کل ہے بھیا۔'' وہ رو دینے کو ہو گئی۔

''اچھا کل...... لیکن کل تو میں نہیں ہوں گا میرے ایک دوست کی پارٹی ہے۔''

وہ اسے ستا رہا تھا۔ اس کے اور مہ رخ کے درمیان کوئی سات برس کا فرق تھا۔

''آپ اپنے دوست کے گھر جاؤ گے۔'' وہ رو ہی پڑی تھی۔

''تو کیا ہوا۔ تم کیک کاٹ لینا پھر میں آجاؤں گا کچھ دیر بعد۔''

وہ اپنی ہنسی دبا کر بولا۔

''اچھا میں اپنی سالگرہ پرسوں منالوں گی۔ مگر آپ کے بغیر نہیں مناؤں گی۔''

اس نے فوراً ہی اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ پھر مسکرا کر بولی تھی۔

''بھیا! مجھے آپ کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرا تو کوئی فرینڈ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے سوا مجھے کوئی اور اچھا ہی نہیں لگتا۔''

وہ معصومیت سے اس کے گالوں کو اپنے نرم نرم ہاتھوں سے چھو کر بولی تھی۔

''مہ رخ میری بہن۔

''تم کتنی اچھی ہو اور میں کتنا برا ہوں۔

''کتنا کم ظرف اور کمینہ۔''

اس نے خود کو انتہائی گراوٹ میں محسوس کیا اور تڑپ کر کروٹ لی۔

ایک دفعہ اسے بخار چڑھ گیا تو وہ اس کے سرہانے بیٹھی گھنٹوں اس کا سر دباتی رہی اور جتنی سورتیں اور کلمے اسے یاد تھے وہ پڑھ پڑھ کے پانی پر پھونک کر اسے بار بار پانی پلاتی رہی۔

''بھیا! یہ پی لیں بخار اتر جائے گا۔''

''بس اب تم سو جاؤ مہ رخ تھک جاؤ گی۔ دیکھو کب سے میرا سر دبا رہی ہو۔'' اس نے منع کیا تو وہ منہ بسور کے بولی۔

''میرے ہاتھ تو نہیں تھکے۔ آپ کو میرے دبانے سے آرام نہیں آ رہا ہو۔ اسی لیے منع کر رہے ہیں۔'' تب وہ مسکرا دیا اور وہ اپنی مرضی سے اس کا سر دباتی رہی۔

خیر اس کا سارا بچپن...... ایسی معصوم محبتوں کو عبدالمالک پر نچھاور کرتے گزر گیا اور وہ جوان ہو گئی۔ وہ بڑی ہوئی تو عبدالمالک کو ایک بار بھی اسے کہنا نہیں پڑا کہ وہ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا کرے۔

یا پھر یہ کہ سہیلیوں کے گھر نہیں جائے گی۔

یا پھر یہ کہ۔ اسے لڑکیوں کا گھر سے باہر پسند نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ تو جیسے اس کا دل پڑھ لیا کرتی تھی۔ اس نے خود ہی اپنے دوپٹے کو پھیلا کر لینا شروع کر دیا۔ پھر جلد ہی وہ چادر اوڑھ کر جانے لگی۔ غالباً وہ تو کالج جانے سے پہلے ہی چادر اوڑھنے لگی تھی۔

اور سہیلی تو اس نے بس ایک ہی بنائی تھی۔ جس کے گھر وہ کبھی کبھار ہی جاتی وہ بھی عبدالمالک خود خوشی سے چھوڑ کر آتا تو۔ ورنہ تو وہ اپنی ماں اور عبدالمالک کے ساتھ ہی اتنی مانوس تھی کہ وہی اس کی سہیلیاں تھیں۔ اس کی شادی کا وقت بھی عبدالمالک کی مرضی سے ہی آ گیا تھا۔ اس نے اس کے ایف اے کرتے ہی مناسب رشتہ دیکھ کر شادی کر دی۔ اس نے باوجود اس کے کہ وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور آگے پڑھنا چاہتی تھی، ایک بار بھی اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی ماں کو بھی ڈھال نہیں بنایا ورنہ وہ بہت سی باتوں میں اپنی ماں کی سفارش لگوا سکتی تھی۔ مگر اسے تو واقعی اپنے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے بھائی کی محبت اور اس کی عزت بنانے میں لگا دیا تھا اور اب جو سانحہ ہو گیا۔ وہ بھلا اس کے بس میں کب تھا۔ وہ تو اس میں بے قصور اور بے خطا تھی۔

عبدالمالک کے دماغ میں اس قیامت خیز وقت کی یاد نے پھر انگڑائی لی۔ یوں کہ اس کے دل و دماغ پھر آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ وہ بے قراری سے اپنے بیڈ پر سے اتر آیا اور ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر چلنے لگا۔

''میری بہن اور کسی کی اتنی جرأت کہ وہ اس پر اپنی گندی نظریں ڈالتا؟'' اس کے تن بدن میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔

اگر کبھی کسی کو خبر ہو گئی تو؟

وہ پتھر ہو کر ٹھہرا۔

''اسی لیے اس لیے تو میں نے چاہا تھا کہ ختم کر دوں۔ اسے بھی اور خود کو بھی۔'' وہ بے بس ہونے لگا۔ اس کی نگاہیں دوبارہ مہ رخ کی طرف اٹھیں۔ وہ گہری نیند میں تھی۔

''میں میں کیسے مار دوں اسے اور کیوں؟''

وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب ہونے لگا۔

"تم اپنے رب کے احکامات کو بھول کر محض لوگوں کا خوف کھانے لگے ہو۔ کیا تمہارا ایمان کمزور ہو گیا ہے؟"

اچانک ہی اس کا دل بولنے لگا۔ اتنا بلند اور اتنا صاف کہ وہ اس کی بات کو نظر انداز نہ کر سکا۔

"یاد کرو حضرت مریمؑ کے واقعے کو...... کیا تم بھول گئے کہ لوگوں نے ان کی پاکبازی پر کیسی کیسی باتیں نہ بنائیں اور ان کے کردار پر اپنی ناپاک آنکھیں اور انگلیاں کس طرح سے اٹھائیں؟ یاد کرو۔

پھر اللہ نے حضرت مریمؑ کی پاکیزگی کو کس طرح سے انہی لوگوں پر ثابت کیا اور انہیں اتنا بلند اور عظیم درجہ دیا کہ وہی لوگ ان کی قسمیں کھانے لگے اور حضرت مریمؑ کو اللہ نے تا قیامت عزت و تکریم کے اعلیٰ درجے پر دنیا میں اور ہمیشہ کے لیے آخرت میں فائز کر دیا۔"

اس کا دل بولتا جا رہا تھا اور وہ پانی ہو کر قطرہ قطرہ خود اپنے وجود میں سے بہہ رہا تھا۔

"مہ رخ بے خطا ہے۔ وہ پاکباز ہے۔ اس کا گواہ اللہ ہے اور تم خود بھی پھر بھی تم لوگوں سے ڈرتے ہو؟" وہ مہ رخ کے سمٹے ہوئے پیروں کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں برا ہوں...... بہت گھٹیا سوچ والا۔ بہت ہی نیچ۔" وہ خود اپنے سامنے شرمندہ تھا۔

سنو! اللہ کو اپنے بندوں کی سب سے زیادہ جو ادا پسند ہے وہ ہے اس کا توبہ کرنا۔

اعترافِ گناہ کر لینا۔

اپنا جرم تسلیم کر لینا۔

اور پھر وہ تو معاف کر دینے والا ہے درگزر کر کے اپنے بندوں کو پھر سے پیار دینے والا۔"

کوئی اس کے زخموں پر ہولے ہولے دوا مل رہا تھا۔ ایسی دوا جو شفاء میں کامل تھی۔

"اٹھو اور اپنے رب سے رجوع کرو۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

اس کے مندمل ہونے والے زخم مسکان بھرے ہونٹ بن گئے۔ اس کے اندر وہ خود تھا جو ہشاش بشاش تھا۔

"لیکن میں نے خود کو مارا۔

"خود اذیتی بھی تو گناہ ہے؟"

وہ اپنے اندر کہیں کہیں رگڑتے...... رگیدتے ہر سوال کو نکال دینا چاہتا تھا تاکہ اس کے اندر پھر کوئی پھانس ایسی نہ رہے جو اس کی دھڑکنوں میں شر پھیلائے۔

"کہا ناں...... توبہ ہر گناہ کو زائل کرتی ہے۔" اس کے دل میں پھول کھلنے لگے تھے۔

"میں کیا کرتا میری غیرت مجھے مارے دیتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر اس روز میں وقت پر نہ پہنچتا اور میری بہن کے ساتھ کچھ برا ہو جاتا تو...... تو؟"

"غیرت کا جذبہ اللہ کو پسند ہے مگر صرف بے حیائی کے کاموں کو روکنے کے لیے۔ مگر سب سے زیادہ غیرت مند خود اللہ تعالیٰ ہیں اور اس نے کسی انسان کو ہرگز یہ اجازت نہیں دی کہ وہ محض غیرت کے نام پر عورتوں کو قتل کر دے...... خواہ معاملہ کتنا ہی نازک ہو...... موت پھر بھی عورت کے لیے سزا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ مرتد ہو جائے۔

اللہ کا شکر ادا کرو اور اگر خدانخواستہ مہ رخ کے ساتھ ایسا کچھ ہو بھی جاتا۔ تب بھی تم کو اللہ کا یہی حکم تھا کہ اس کے دکھ پر تشفی کا ہاتھ رکھو۔ سمجھے۔"

اس کے اندر سے ایک تنبیہ اس کے احساسات پر پڑی اور پھر اس کے اندر کھلنے والے محبت کے پھولوں کی خوشبو اس کی روح تک پھیل گئی۔ اس نے مہ رخ کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔

"بھائی جان!" وہ تڑپ کے اٹھی اور اپنے پاؤں کھینچ کے اور سمٹ گئی۔

"مجھے معاف کر دینا مہ رخ!"

وہ اس کے سامنے آج پہلی بار یوں بیٹھا تھا۔ ہاتھ باندھ کے روتا ہوا۔

"میں...... آپ کو......؟" وہ اٹھی اور اس نے اپنے بھائی کے بندھے ہاتھ کھول کے انہیں اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"آپ مجھے معاف کر دیں بھائی! میری وجہ سے آپ کو......"

اب وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ رہی تھی۔ عبدالمالک نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ دونوں ہی رو رہے تھے۔ جبکہ قدرت مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ بہن بھائیوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی محبت کے بیچ وقت کبھی کبھی امتحان بن کر آتا ضرور ہے مگر وہ انہیں زیادہ عرصہ جدا رکھ نہیں پاتا۔ رکھ ہی نہیں سکتا۔ کہ رشتے...... تو لہو سے جنم لیتے ہیں۔

ایک ہی کوکھ میں پلتے ہیں۔

دلوں سے جڑے ہوتے ہیں۔

اور روحوں تک پیوست ہوتے ہیں۔

آسمان سے بن کر آتے ہیں۔

اور زمین میں دفن ہو جانے کے بعد بھی رہتے ہیں۔



"جیلانی ہاؤس" میں ایک بار پھر سے خوشیاں در آئی تھیں۔ ایک بار پھر اس خاندان کا ہر

فرد خوش تھا۔ یہاں تک کہ عمیس میاں بھی بھرپور جذبوں کے ساتھ اس شادی میں شریک تھے۔ عیون کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا اور لڑکیوں نے میاں جی کو منا کر دف پر گانے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ سب کی سب ہال میں جمع تھیں اور گلے پھاڑ پھاڑ کے سُر نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سب سے زیادہ خوش شاہانہ تھی۔ وہ بار بار زائرہ کو گلے لگاتی۔ اس کا ماتھا چومتی اور کہتی

"تیرا نصیب بھی اللہ نے اتنا اچھا کر دینا ہے کہ دیکھنا تو...... سارے غم بھول جائے گی۔"

میاں جی نے شاہانہ اور معاذ کو منالیا تھا کہ وہ یہیں پر جیلانی ہاؤس میں آ کر شادی کریں تا کہ سب ایک ہی جگہ پر اکٹھے ہی خوشیاں منائیں۔ معاذ بھی دل سے خوش تھے اور انہوں نے زید کو گلے لگا کر اس کے کان میں کہہ دیا تھا۔

"یار! معاف کر دینا، میں بھی تمہیں وہی سمجھنے لگا تھا جو احمد اور جواد سمجھ رہے تھے۔" اور زید نے بھی فوراً ہی دوسری طرف گلے لگتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"اور اب بھی آپ وہی سمجھ رہے ہیں ناں جو باقی سارے سمجھ رہے ہیں۔" جس پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

تکلم اور ترنم کے کھلے کھلے چہرے بھی ان کے دلوں کی غمازی خوب ہی کر رہے تھے۔ اس شادی میں بھی ان دونوں بہنوں نے ایک جیسے کپڑے بنائے تھے کچھ دونوں کی صورتیں بھی خوب ہی شبیہہ دیتی تھیں ایک دوسرے کی۔ تو آج پھر کئی بار اسیس اور عمیس میاں گڑبڑائے تھے۔ یہاں تک عمیس میاں نے تو ترنم بیگم سے کہہ ہی دیا تھا۔

"بیگم! اللہ کے واسطے تم دونوں بہنیں ایک جیسے لباس نہ پہنا کرو۔"

"کیوں۔ کیوں میاں جی کیا ہو گیا؟" وہ تازہ پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے اترا کر بولیں۔

"بھئی وہ میں سمجھا کہ آپ کھڑی ہیں۔ میں نے جا کر کہہ دیا۔"

وہ کھسیانے سے تھے۔

"کیا...... کیا کہہ دیا آپ نے آپا سے؟"

وہ لطف اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"کہہ دیا کہ یہ رنگ تو آپ پر بہت جچتا ہے۔"

وہ ان کا دوپٹہ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔

"ہائے اللہ...... سچ کہیں؟"

وہ انہیں دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر بولیں اور پھر ہنس پڑیں۔

"تو کیا ہو گیا۔ دیور بھی تو ہیں آپ ان کے ذرا چھیڑ خانی ہی سہی۔"

"اچھا...... اور اگر یہی حرکت بھائی صاحب سے ہو گئی تو؟"

وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"تو کیا ہوا۔ کیا بھائیوں کو بہنوں کی تعریف کرنا منع ہے۔"

وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں جھٹ سے بولیں۔

"تم سے کون الجھے؟"

عمیس میاں جان چھڑاتے ہوئے جانے لگے۔

"ارے سنیں تو۔" ترنم بیگم ان کے پیچھے لپکیں۔

"اب کیا ہے۔" انہوں نے ذرا گھر کا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" وہ اصل بات بھول کر پوچھنے لگیں۔

"ذرا باہر لان میں انتظام دیکھنے۔ وہ آج رات کے کھانے میں آپ کے لاڈلے نے باربی کیو رکھوایا ہے۔"

وہ "آپ کے لاڈلے" پر زور دیتے ہوئے بولے۔ وہ زید کو کہہ رہے تھے۔

"اچھا میرا لاڈلا...... اور آپ کا؟"

"میرا تو وہ...... وہ میاں جی اسے کیا کہتے ہوتے ہیں۔"

وہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"میرا جگر۔" ترنم بیگم نے یاد کرایا۔

"ہاں...... ہاں...... میرا تو وہ جگر ہے۔" وہ مسکرا دیئے اور پھر سنجیدگی سے بولے۔

"کیسا ہیرا ہے یہ ہمارے خاندان میں۔ سچ کہتے ہیں کہ چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہ ملے...... ترنم! اگر زید نہ ہوتا تو آج......

"آج ہماری عزت؟"

وہ مسکراتے مسکراتے دل گیر ہو گئے۔

"بری باتوں کو خوشی کے موقعوں پر یاد کرنا کفرانِ نعمت ہے عمیس! مت کریں...... برا وقت یاد۔ ایک بھیانک خواب تھا۔ فقط خواب۔"

وہ سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔ دونوں نے ایک سرد آہ کھینچ کے بھری اور پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے مسکرا دیئے۔

❖......○......❖

وہ اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ باہر لان میں سب کھانا کھا رہے تھے۔ گرما گرم تکے۔

سیخ کباب، مٹن چانپ، پوریاں، چنے، اور جانے کیا کیا۔ فضا میں رات کی رانی کے ساتھ ساتھ کھانوں کی خوشبو نے مکس ہو کر ایک اور ہی مہک رچا دی تھی۔

اس نے ایک لمبی سی سانس کھینچی اور ڈھیر ساری مہک اپنے اندر اتار لی اور سامنے آسمان پر مسکراتے ہوئے پورے چاند کو دیکھا۔

سب کتنے خوش تھے۔ ایک اطمینان اس کے اندر تک اتر گیا۔

"سب خوش ہیں اور تم خود؟"

اس کے دل نے پوچھا۔

"میں میں؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"ہاں تم ستارہ احمد حسن؟" سامنے مسکراتے ہوئے چاند نے بھی سوال کر دیا۔

"میں بھی خوش ہوں۔"

وہ کھڑکی میں جھک گئی اور باہر ہنستے کھیلتے اپنوں کو دیکھنے لگی۔

"اپنے پورے دل سے خوش ہو؟" سوال اپنی جگہ اپنا حجم بڑھا رہا تھا۔

"ہاں...... بھئی...... پورے دل سے۔"

اس نے لاپروائی سے کہنا چاہا۔

"یعنی تم نے احمد حسن کو معاف کر دیا؟" سوال ذرا ٹیڑھا ہو گیا۔

"کر دیا۔" وہ ذرا کترائی۔

"اچھا تو پھر نظریں کیوں چرا رہی ہو۔ میری طرف دیکھ کر بات کرو۔" چاند نے ضد کی۔

"کیا ہے؟" اس نے چڑ کر اپنی نگاہ اوپر کی۔

"یہ...... یہ تمہاری آنکھوں کے کناروں پر ایک بال کی طرح باریک سی چمکیلی تہہ۔ کیا یہ نمی ہے؟" ٹیڑھا سا سوال اور بھی جھک کر سیدھا اس کی آنکھوں کا ایکسرے کرنے لگا۔

"میری آنکھوں میں نمی کیوں ہونے لگی۔" وہ منکر ہی تھی۔

"اچھا تو پھر بال ہی ہوگا؟ سنو! بال خواہ کسی آنکھ میں ہو یا دل میں بے حد اذیت ناک ہو جاتا ہے۔ چبھتا ہے۔ رگیدتا ہے اور درد دیتا ہے۔"

اس سوال نے ایک وجود کا روپ دھارنا شروع کر دیا تھا۔

"ستارہ! وہ تمہارا محبوب ہے۔ تمہارا اپنا ہے اتنا اپنا کہ خود تمہارے اندر ہی رہتا ہے۔ تم

اس کے بغیر رہ نہیں سکتی ہو۔ پھر اس سے خفا کیوں ہو؟" ایک ہاتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف مکمل متوجہ کر لیا۔

"اس نے مجھے دکھ دیا۔ دکھ بھی ایسا کہ میری روح گھائل کر دی۔" اب وہ سنجیدہ تھی۔

"شک کیا ناں تم پر۔" اب دو آنکھیں اس کی آنکھوں میں کُھب رہی تھیں۔

"ہاں شک...... مجھ پر شک۔" اس کی آنکھوں کے کنارے پر پڑا بال واقعی چبھنے لگا۔

"یہ ایک مرد کی فطرت ہے۔ دنیا کا ہر مرد شک کرتا ہے۔ کبھی نا کبھی ضرور۔"

وہ آنکھیں اس کی آنکھوں کی چبھن کو بڑھنے سے روکے ہوئے تھیں۔

"لیکن وہ تو میرا محبوب تھا؟" اسے گلہ تھا۔

"ہاں مگر فطرتاً ایک عام سا مرد بھی تو تھا۔" وہ آنکھیں مسکرائیں۔

"لیکن میں...... میری محبت۔ میرا کردار؟" وہ اپنی کیفیات اور محسوسات کو بیان کرنے سے قاصر تھی۔

"اپنے کیے کی معافی مانگ لی ناں اس نے۔" وہ آنکھیں اب ناصح تھیں۔

"مگر میرا کیا؟ جب چاہے وہ شک کرے جب چاہے معافی مانگ لے۔"

اس کی آنکھوں کا بال مڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اور بھی جلنے لگیں۔ یہاں تک کہ منظر دھندلانے لگا۔

"بڑا تکلیف دہ۔ بڑا اذیت ناک ہے جو اس نے کہا لیکن اس سے زیادہ سوہانِ روح ہو جائے گا یہ کہ تم اسے آدھی معافی دو۔"

"آدھی معافی۔" ستارہ کو سمجھ نہ آئی۔

"یعنی معاف تو کر دینا مگر دل کی خلش کو رہنے دینا۔ اس آنکھ کے بال کی طرح۔ بتاؤ بھلا اگر تم یہ بال نہیں نکالو گی تو کیا کبھی تمہیں قرار آئے گا۔ کیا تمہیں صاف دکھائی دے گا۔"

وہ آنکھیں پھر سے ہاتھ بن کر اس کی آنکھوں کو مسلنے لگیں۔

"محبت تم بھی کرتی ہو اس سے...... اور عورت کی محبت مرد کی محبت سے زیادہ اعلیٰ ظرف ہوتی ہے۔

زیادہ حوصلے والی...... اور زیادہ درگزر کرنے والی ہوتی ہے۔

اسے پورے دل سے معاف کرو ستارہ! پورے دل سے۔"

"کیسے کروں۔ اپنے دل کے اس درد کو کیسے مٹاؤں کہ اس نے مجھ پر انگلی اٹھائی۔"

وہ تڑپ رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر اسے چھوڑ دو۔" وہ بال ڈبکی کھا کر اس کی آنکھ کے نیچے چلا گیا۔ جس سے اس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔

"چھوڑ دوں۔ احمد کو؟ میں؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی جواب دکھائی بھی نہ دے رہا تھا۔

"ہاں...... برے دل کے ساتھ رہنے اور ادھوری مجبوری زدہ محبت کے کرنے سے بہتر ہے کہ تم اسے چھوڑ دو۔"

اب پھر آواز اس کے اندر سے آ رہی تھی۔

"یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے......"

"تو پھر اسے معاف کر کے اپنا لو۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اس عمل سے پہلے تھا۔"

اس کا دل نرمی سے بولا۔

"یہ کرنے کی کوشش تو میں کر رہی ہوں۔" وہ ذرا ہکلائی۔

"ستارہ!

"ستارہ! بھئی کہاں ہو تم؟"

اتنے میں احمد حسن اسے آوازیں دیتا ہوا آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

"کیا ہوا۔ کیا ہو گیا؟" احمد بے چین ہو کر آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ ہٹا کر آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

اس کی سرخ اور متورم آنکھوں میں پانی تھا۔

"کیا ہوا...... کیا تم رو رہی ہو؟"

وہ بے چین ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں میری آنکھ میں شاید بال چلا گیا ہے۔" وہ پھر آنکھیں ملنے لگی۔

"ادھر دیکھو میری طرف آنکھ کھولو۔" وہ اس کے قریب ہو کر آنکھ میں دیکھنے لگا۔ آنکھ کے نیچے چھپا بال ہولے سے سامنے آ گیا۔ جیسے سب سے بڑا مجرم وہی تھا۔ اسی نے دونوں کو اب تک دور کیا ہوا تھا۔

احمد نے اپنی انگلی کے پور پر اس بال کو آہستگی سے اتارا۔

"یہ رہا بال...... بس یہی تھا۔" وہ اپنی انگلی اسے دکھاتا ہوا مسکرایا۔

"ہاں۔" اس نے سر اقرار میں ہلا کر آنکھیں نیچی کیں۔

"اوں...... ہوں۔ اوپر دیکھو۔ آنکھیں بہت سرخ ہو رہی ہیں لاؤ ذرا سینک دوں۔"

احمد نے اس کی آنکھ کے پپوٹے پر اپنے ہونٹ رکھ کر پھونک ماری۔ پھر اپنی ہتھیلی کو منہ کی بھاپ سے گرم کر کر کے اس کے پپوٹوں کو سینکا۔

"یہ آنکھوں کا بھی عجیب حساس معاملہ ہے۔ متاثر ایک ہو تو روتی دونوں ہیں۔" وہ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر مذاق کر رہا تھا۔

"ہاں...... بالکل دو چاہنے والوں کی طرح۔ درد ایک کو ہو تو متاثر دونوں ہوتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"کون...... ہم؟" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

جس پر وہ مسکرا دی۔

"اچھا دیکھوں۔ اب تو آنکھ میں چبھن نہیں۔"

وہ اس کی ٹھوڑی اوپر کر کے دیکھنے لگا۔

"نہیں اب کوئی چبھن نہیں۔ جو بال تھا وہ تو آپ نے نکال دیا۔" اس نے اقرار کیا۔

"کیا واقعی وہ منحوس بال نکل گیا جس کی چبھن کئی روز سے تمہارے آنکھوں میں تھی اور میرے دل میں۔" وہ ذو معنی ہو گیا۔

"اور کیا واقعی اب دوبارہ ایسا کوئی بال دوبارہ ہمارے بیچ نہیں آئے گا۔" وہ اپنا ہاتھ آگے کیے وعدہ مانگ رہی تھی۔

"کبھی نہیں...... ان شاءاللہ تعالیٰ۔" اس نے اپنے مضبوط میں اس کا ہاتھ لے لیا۔

کھڑکی سے جھانکتا ہوا مکمل چاند زور سے ہنسا اور ڈبکی مار کے ایک بادل میں چھپ گیا۔

ان دونوں کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

صاف اور شفاف...... ستارہ آنکھیں۔



عیون کے نکاح کے روز زائرہ فاطمہ اور مہ رخ کو اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے پھر پورے فنکشن میں کسی اور طرف نگاہ ہی نہ کی۔ یہاں تک کہ انہیں اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی عیون بھی زائرہ ہی دکھائی دی۔ تب انہوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور دونوں ہی مسکرا دیں۔ دیکھا تو اسے عبدالمالک نے بھی کئی بار تھا چوری چوری نگاہوں سے۔ کچھ تو وہ تھی ہی بہت خوبصورت اور کچھ اب اس کے چہرے پر ہر وقت رہنے والی سنجیدگی اور حزن و ملال اسے اور بھی پُرکشش بنائے دیتے تھے۔

عبدالمالک کا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا اور وہ اسے ادھر ہمکنے سے روک نہ رہا تھا۔

کیوں روکتا......

اب اس کے دل میں کسی کا خوف نہ تھا سوائے اپنے اللہ کے اور وہ کسی اور کی خوشنودی چاہتا بھی نہ تھا۔

سوائے اپنے اللہ کی خوشنودی کے......

اب اس کا غصہ......اس کی غیرت...... اپنے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ناموس اور حرمت پر تڑپتے تھے اور

عورت......عورت...... ماں کے مقام پر

عورت بہن کی صورت میں......اور

عورت بیوی کے روپ میں...... اس کے نزدیک اللہ کی رحمت تھی۔ اس کا بھیجا ہوا خوبصورت تحفہ تھی۔

آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور......اور سراسر محبت تھی۔ چاہے جانے کے قابل تھی۔

عزت وتکریم کی حق دار تھی۔

معاف کر کے دل سے لگا لینے کے درجے پر تھی۔

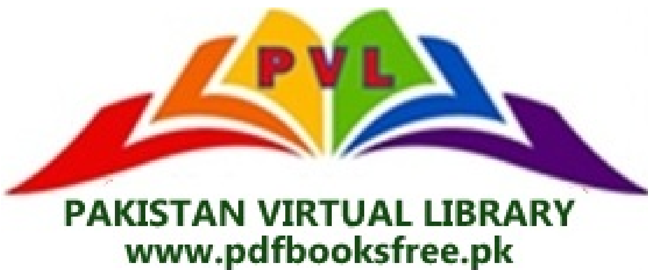
تبھی تو جب اس کی ماں نے اسے زائرہ کے لیے پوچھا تو اس نے فوراً ہاں کر دی اور اپنی ماں سے کہہ دیا کہ......

اب وہ اس کی شادی میں دیر نہ کریں۔ یوں فاطمہ، فضل داد اور مہ رخ نے عبدالمالک کی بات جیلانی ہاؤس کے مکینوں کے کانوں میں ڈال دی۔ جسے میاں جی نے بغیر کسی کے مشورے کا انتظار کیے۔

بسم اللہ کر کے قبول کر لیا۔

اور یوں......عبدالمالک کی زندگی میں زائرہ بہار کے تازہ جھونکے کی طرح داخل ہوگئی۔

❖......ختم شد......❖



1987ء کا سال شگفتہ بھٹی اور میرے لیے اس لحاظ سے مماثلت رکھتا ہے کہ اس برس انہوں نے اپنی ادبی اور میں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ہم لوگ سیڑھی کی طرح وہیں محدود ہو گئے۔ جب کہ شگفتہ بھٹی افسانہ نگارہ سے ملک کی معروف ناول نگارہ بن چکی ہیں۔ ان کے افسانے ہوں یا ناول وہ ایک لکھاری سے زیادہ مسیحا کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ ان کا مقصد تحریر ''معاشرتی بیماریوں'' کو اجاگر اور اس کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں معاشرے کی نبض اور دوسرے میں قلم ہوتا ہے نبض کی رفتار کے ساتھ ان کا قلم بھی رواں دواں رہتا ہے۔ یوں احساسات وخیالات لفظوں کی لڑیوں میں پرونے لگتے ہیں اور ایک نیا ناول منظرِ عام پر آ جاتا ہے۔

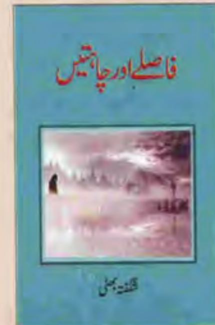
زیرِ نظر ناول ''راستے محبت کے'' جیلانی ولاز کی کہانی پر مبنی ہے جس میں کردار متحرک نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر کردار کے ساتھ ایک کہانی یا واقعہ وابستہ ہے۔ اندازِ بیاں ایسا مؤثر اور دلچسپ ہے کہ قاری انہیں پڑھتے ہوئے ادھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ ناول کا ہر ورق ایک تصویر کی طرح نظر آتا ہے۔ ہر لفظ کے پیچھے ایک عکس چھپا ہوتا ہے جو پڑھنے والے میں تجسس پیدا کرتا ہے۔ اگر شگفتہ بھٹی ناول کی کہانی موضوع اور کردار کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہیں تو قاری بھی ان کی گہرائی اور گیرائی میں ڈوب کر وہ مقصد حاصل کر لیتا ہے جس کے لیے ناول نگارہ کومل انداز اپناتے ہوئے موضوع کو کشادہ کرتی چلی جاتی ہیں۔

عمومی طور پر بعض ناقدین ادب ڈائجسٹوں میں چھپنے والے افسانوں اور قسط وار ناولوں کو ادب کا حصہ قرار نہیں دیتے۔ یہاں ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب کا مسئلہ بھی درپیش ہونے لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کو زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار اپنے اردگرد کے حالات وواقعات کو کہانیوں کی صورت میں سامنے لاتا ہے تو ان میں ہمیں جیتی جاگتی زندگی کے بھاگتے دوڑتے کردار نظر آتے ہیں۔ شگفتہ بھٹی بھی ان کرداروں کے حصار میں رہ کر گھر کے اندر کی کہانیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

سلیم ناز
میگزین ایڈیٹر نوائے وقت ملتان

مصنفہ کے دیگر بہترین ناول









علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 7247414